حصہ ۲۳ جنوری و اپریل ۴۳ء نمبر ۸۹ و ۹۰

اُردُو

انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رِسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدُالحق

شائع کردہ
انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

اُردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے۔

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رپے۔ نمونے کی قیمت ایک رپیہ بارہ آنے۔

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۰۱ دریا گنج۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشــــــــــــتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

نرخ‌نامہ اجرت اشتہارات 'اردو'

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنے پورا ایک صفحہ	۸ رپے	۳۰ رپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ رپے	۱۵ رپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ رپے ۴ آنے	۸ رپے

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ بار چھپوائے جائیں گے ان کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کر دے۔

المشــــــــــــتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

اردو

نمبر ۸۹	جنوری سنہ ۱۹۴۳ء	جلد ۲۳

معذرت

افسوس ہے کہ مطبع کی تبدیلی کی وجہ سے رسالۂ اردو کی اشاعت میں بہت تاخیر واقع ہوئی اور جنوری اور اپریل کی اشاعتوں کو یکجا کرنے کے باوجود، وہ جون سے پہلے تیار نہ ہو سکا۔ ہم ناظرین سے معذرت کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ جولائی کی اشاعت قریب قریب اپنے وقت پر اور آئندہ سہ ماہی پرچے بالکل باقاعدہ شائع ہوتے رہیں گے۔

منجانب مدیر اردو

مقام اشاعت — دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقئی اردو (ہند) دہلی سے شایع کیا۔

اُردُو

جلد ۲۳ — جنوری سنہ ۱۹۴۳ع — نمبر ۸۹

فہرستِ مضامین

تبصرہ

از علامہ حافظ محمود شیرانی صاحب

ہندستان میں مغلوں سے قبل فارسی (ادب)

(بہ زبان انگریزی)

مصنفہ شمس العلما الحاج محمد عبدالغنی ایم - اے؛ ماسٹر آف لٹریچر (کیمبرج)

صدر شعبۂ عربی و فارسی ناگپور یونیورسٹی (سی - پی -)

بہ قول جناب مصنف یہ کتاب ہندستان میں "عہد قدیم سے آمد مغل تک فارسی زبان و ادب کے ارتقا پر ایک منتقدانہ جائزہ ہے"۔ سر شاہ سلیمان نے جن کو اب مرحوم کہتے ہوے ہمیں صدمہ ہوتا ہے اس پر تمہیدی کلمات لکھے ہیں اور گورنر بہادر صوبۂ متوسطہ نے جن کی خدمت میں مصنف نے کچھ باب بہ غرض معائنہ بھیجے تھے اپنی خوش نودی اور مبارک باد کی چٹھی جواب میں بھیجی جس کو مصنف نے کتاب کے ساتھ شائع کردیا - ایسی سربرآوردہ ہستیوں کے پروانوں کے ساتھ جو کتاب چھپے گی ظاہر ہے کہ شان دار اور بلند پایہ ہوگی چناں چہ اس کی طباعت اور کاغذ سے ہمارے خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے - الہ آباد لاجرنل پریس اس کا طابع و ناشر ہے -

کتاب کا باب اول جو تمہیدی ہے اگرچہ مفید معلومات کا حامل ہے لیکن موضوع زیر بحث کا خیال کرتے ہوے بہت کچھ غیر ضروری اور غیر متعلق کہا جاسکتا ہے - یہاں شمس العلما اسی قسم کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جو ہمارے قدیم مورخین کرتے آئے ہیں کہ وہ لکھنا چاہتے ہیں اپنے عہد کی تاریخ مگر حضرت آدم سے شروع کرتے ہیں اور اپنے عہد تک پہنچتے پہنچتے ان کا زور قلم ختم اور جوش طبیعت ٹھنڈا ہو جاتا ہے - بعینہٖ یہی کیفیت اس تالیف کی ہے کہ پروفیسر لکھنے بیٹھے تھے قبل از مغل فارسی ادبیات ہند کی داستان مگر مقدمے میں ایسے مضامین چھیڑ بیٹھے جن سے نفس مضمون کو دور کا بھی تعلق نہیں - مثلاً عربوں کی فتح ایران کے بعد عربی اور فارسی کے روابط، فتح سندھ از عرب،

عرب و ہند، فارسی کے معرّب الفاظ، عربوں پر فارسی کا اثر، ایسے الفاظ کی فہرست جو عربی نے فارسی سے مستعار لیے، عربی فارسی اشعار کے ترجمے، فارسی ضرب الامثال کے ترجمے، اشعار ملمع، عرب اور فتح سندھ، عرب سیاحوں کے بیانات وغیرہ وغیرہ۔ ع طفیلی جمع شد چندان کہ جاے میہمان گم شد۔ ہر شخص جان سکتا ہے کہ ان مطالب کو قبل از مغل فارسی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔

دوسرا باب 'غزنویوں سے قبل کا زمانہ' ہے۔ اس میں ساسانی دور میں شعر کا وجود۔ تیسری چوتھی صدی میں فارسی نثر کی کتابیں۔ شعراے قدیم جو طاہری، صفاری اور سامانی عہد میں ہو گزرے ہیں مذکور ہیں۔ اصل موضوع کا خیال کرتے ہوے یہ باب بڑی اتنا ہی بےمحل اور بےموقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب۔ اس کے علاوہ برون اور لیبوی نیز دیگر مغربی مصنفین یہی زمین بار بار طے کرچکے ہیں۔

تیسرا باب خاص غزنویوں سے متعلق ہے۔ اس کے پہلے حصے میں صفحہ ۱۵۵ تا ۲۳۱ محمود اور اس کی سرپرستئی علما و فضلا، بوعلی سینا، ابوریحان البیرونی اور اس کی تصنیفات، سالار مسعود غازی، مشاہیر شعرا عنصری، فرخی، عسجدی، مختاری، زینتی، مسعود سعد سلمان، محمودی حملے، محمود کے القاب، فتح سومناتھ و دیگر امور متعلقہ نیز محمود کے ادبی ذوق وغیرہ پر خیال آرائی کی گئی ہے۔

اسی باب کے دوسرے حصے میں بقیہ خان‌وادۂ غزنہ کے شعرا و فضلا کا ذکر ہے جس میں آل محمود کی سرپرستئی ادب اور مشہور شعرا ابوالفرج روی، سید حسن غزنوی۔ حکیم سنائی اور ان کے ہندی ابیات سے بحث ہے۔ یہ حصہ صفحہ ۲۶۳ پر ختم ہوتا ہے یہ بات نفس موضوع کا پس منظر ٹھیر سکتا ہے تاہم کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا مسافر اپنی بالادوی سے باز آکر منزل مقصود کی طرف رجوع نہیں کرتا۔

چوتھا باب (صفحہ ۲۶۳ تا ۳۸۰) ہمیں غوریوں اور غلاموں کے ذکر و اذکار سے واقف کرتا ہے۔ ابتدا میں غوری عہد کے شعرا رشید شہاب، نازکی مراغی، قاضی حمید بلخی، امام رازی وغیرہم کا مذکور آتا ہے لیکن سب سے اہم مرتبہ خواجہ معین‌الدین چشتی کو بحیثیت شاعر دیا ہے۔ ان کا ذکر صفحہ ۲۷۱ سے شروع ہوکر صفحہ ۳۲۹ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۳۰ سے خاندان غلاماں کی طرف مراجعت ہوتی ہے اور کتاب صفحہ ۴۸۵ پر ختم ہوتی ہے۔ گویا اصل موضوع پر صرف ایک سو پچپن صفحے صرف کیے ہیں۔ ان صفحات میں خاندان غلاماں، ان کے عہد

کے شعرا ناصری، روحانی ، تاج الدین دبیر دھلوی، شہاب مہمرہ، مصنف طبقات ناصری، امیر فخرالدین عمید تونکی ، علاءالدین غوری جہاں‌سوز اور ان کی شاعری سے بحث کی ہے ۔ لیکن جہاں‌سوز کا ذکر یہاں بےموقع معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو غوریوں کی فصل کی ابتدا میں لانا چاھیے تھا ۔

پانچواں باب جو آخری باب ہے صفحہ ۳۸۱ سے شروع ھوکر صفحہ ۴۸۵ پر ختم ھوتا ہے ۔ اس میں خلجی ، تغلق اور خاندان غلاماں کے تین سلاطین معزالدین کیقباد اور بلابنه (جمع بلبن) ھیں ۔ اس عنوان میں مصنف سے تقدیم و تاخیر سرزد ھوئی ہے ۔ باب ھذا میں شمس‌العلما کے خمسهٔ متحیرہ امیرخسرو ، خواجه حسن ، ضیاء برنی ، بدر چاچ اور قاضی ظہیر دھلوی ھیں ۔ خسرو پر اکتالیس ، حسن پر چالیس اور ضیاء برنی پر انتیس صفحے صرف ھوے ۔ بدر چاچ اور قاضی ظہیر کے ساتھ مدّ فضول کا سا سلوک روا رکھا ہے ۔ اور کتاب ضیاء برنی پر اختتام پزیر ھوتی ہے ۔

اب ھم اصل کتاب کی طرف جو انگریزی میں ہے رجوع کرتے ھیں اور جن بیانات میں ھمیں شمس‌العلما سے اختلاف ہے ان کا ترجمہ یا خلاصه بقید صفحه مع اپنی تنقید کے سطور ذیل میں درج کرتے ھیں :--

صفحه ۸ کہتے ھیں کہ ، ھزاروں ایرانی خاندان جو خراسان میں آباد تھے ایران کے بادشاہ افراسیاب کے حکم سے اخراج کر دیے گئے ۔

شمس‌العلما افراسیاب کو ایران کا بادشاہ بیان کرتے ھیں جو صحیح نہیں ۔ تمام روایات کی رو سے افراسیاب توران کا بادشاہ ہے جو کیقباد و کیکاؤس و کیخسرو کیانی سلاطین سے معرکه آرا رھا ہے لیکن کیانی خاندان اساطیری عہد میں شمار ھوتا ہے ۔

صفحه ۱۱ برزویه کو Barzawaih لکھا ہے حالاں‌که یه لفظ به ضم سویم و سکون چہارم و تحریک یا با ھاے مختفی ہے ۔ فردوسی نے شاہ‌نامے میں به تخفیف ھا لکھا ہے چناں‌چه :

پزشک سراینده برزوی بود   به پیری رسیده سخن‌گوی بود

(شاہ‌نامه صفحه ۳۴ جلد چہارم ، طبع بمبئی سنه ۱۲۷۵ھ)

صفحه ۶۳ دوسرے باب کے آغاز میں جو غزنوی دور کے ماقبل زمانے سے متعلق ہے شمس‌العلما بڑے جوش کے ساتھ اس الزامی قصے کی تردید میں مصروف ھیں

جو دولت‌شاہ اور اس کے مقلد رضا قلی خاں نے عبداللہ بن طاہر کے خلاف لگایا ھے کہ نہ صرف اس نے افسانۂ وامق عذرا کو دریا برد کرا دیا بلکہ عجمیوں کا تمام لٹریچر جہاں جہاں اس کی قلمرو میں دست‌یاب ہوا جلوا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ سر زمین ایران سے شعر و سخن کا رواج موقوف ھوگیا۔

شمس‌العلما دولت‌شاہ کی روایت کو بعید از قیاس تو مانتے ھیں لیکن طاھریوں کی بریت میں انھوں نے کوئی ثبوت یا دلیل بہم نہ پہنچائی۔ انھوں نے اس قدر کہا ھے کہ بنوطاھر بالخصوص عبداللہ بن طاھر اور خلیفہ المامون عباسی نہ صرف علوم و فنون کے سرپرست بلکہ خود بھی علم و فضیلت کی درخشندہ مثال تھے وغیرہ وغیرہ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں عبدالرحمن مغربی کا ایک اقتباس جو خلیفہ المامون کی علم دوستی، حکمت اور فلسفے سے اس کی محبت اور قیصر روم سے علمی کتابوں کی طلب کے ذکر پر شامل ھے حوالۂ قلم کردیا ھے۔ ھمارے نزدیک مامون کا ذوق علم طاھریوں پر سے الزام رفع نہیں کرتا۔ شمس‌العلما کو چاھیے تھا کہ یا تو اس الزام کی تردید کرتے یا یہ ثابت کرتے کہ ایران میں شعر گوئی عہد قدیم سے موجود نہیں تھی۔ مثلاً کہا جاسکتا تھا کہ دولت‌شاہ ایک غیر معتبر راوی ھے۔ وہ بنوسامان کے عہد کو فارسی شعر کا دور احیا کہتا ھے۔ حالاں‌کہ بنوطاھر کے زمانے میں فارسی شاعر موجود ھیں۔ خود عبداللہ بن طاھر سنہ ۲۱۳ــ۲۳۰ھ کے ایام حکومت میں فارسی کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر حنظلہ بادغیسی متوفی سنہ ۲۱۹ھ موجود ھے۔ محمود وراق اور فیروز مشرقی بھی اسی زمانے میں گزرے ھیں۔ عرب مصنفین جاحظ وغیرہ سے قطع نظر قدماے ایران کی شہادت پیش کی جاسکتی ھے کہ ساسانی عہد شاعری کے وجود سے خالی تھا نیز یہ کہ ایرانیوں نے شعر گوئی عربوں سے سیکھی ھے۔ فخری گرگانی ویس و رامین تالیف سنہ ۴۴۰ھ کے دیباچے میں اصل پہلوی افسانے کی صراحت میں لکھتا ھے:-

ندیدم زان نکوتر داستانی نماند جز بخرم بوستانی
ولیکن پہلوی باشد زبانش نداند ھرکہ برخواند بیانش
نہ ھرکس آن زبان نیکو بخواند وگر خواند ھمی معنی نداند
فراوان وصف چیزے برشمارد چو برخواند بسے معنی ندارد

شعر آیندہ قابل غور ھے:

که آنکه شاعری پیشه نبودست حکیم چابک اندیشه نبودست
کجا اند آن حکیمان تا بدانند که اکنون چون سخن می آفرینند

محمد عوفی کا قول ہے :— « در عهد پرویز نوایے خسروانی که آن را باربد در صوت آورده است بسیار است فامّا از وزن شعر و قافیت و مراعات نظائر آن دور است بداں سبب تعرض بیان آں کرده نباید تا نوبت بدور آخرالزماں رسید و آفتاب ملت حنیفی و دیں محمدی سایه بر دیار عجم انداخت و لطیف طبعان فرس را با فضلاء عرب اتفاق محاورة پدید آمد و از انوار فضائل ایشاں اقتباس کردند و بر اسالیب لغات عرب وقوف گرفتند و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند و به غور آن فرورفتند و بر دقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند و تقطیع و قافیه و ردف و روی و ایطا و سناد و ارکان و فواصل بیاموختند و هم دران منوال نسائج فضائلی که نتائج طبع ایشاں بود بافتن گرفتند »۔

عوفی کی عبارت سے ثابت ہے کہ ایرانی نہ صرف شعر میں بلکہ جملہ فنون شعر میں عربوں کے شاگرد ہیں اور ان کی فضیلت کے قائل ہیں۔ ناصر خسرو اقوام عالم کی خصوصیات کے ذکر میں کہتا ہے :—

سواران تازنده را نیک بنگر درین پهن میدان ز تازی و دهقان
عرب بر ره شعر دارد سوادی پزشکی گزیدند مردان یونان
ره هندوان سوی نیرنگ و افسون ره رومیان زی حسابست و الحان
مصور بکار است مر چینیان را چو بغدادیان را صناعات الوان

منوچہری کا عقیدہ :

شاعری عباس کرد و حمزه کرد و طلحه کرد جعفر و سعد و سعید و سید ام القری

انوری :

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکه بود اول شان امرء القیس آخر شان بونواس

افسانۂ وامق و عذرا کے تعلق میں کہا جاسکتا ہے کہ دونوں نام عربی الاصل معلوم ہوتے ہیں لہذا یہ قصہ بعد از اسلام تالیف ہوا ہوگا نہ قبل از اسلام۔ متاخرین اس کے واسطے بڑی قدامت کے مدعی ہیں۔ ‹ مجمل التواریخ › میں اس کو دارا بن داراب اور ‹ تاریخ گزیده › میں سکندر کے عہد کی تالیف بتایا ہے لیکن فہرست ابن ندیم

میں اس افسانے کو سہل بن ہارون کتاب دار خلیفہ مامون کی تصنیف بیان کیا ہے اور یہی بیان زیادہ قابل قبول ہے ۔

اس افسانے کا دریابرد ہونا کجا وہ تو آج بھی موجود ہے ۔ عنصری، فصیحی اور نامی نے اسے نظم کیا ہے ۔ عنصری کی مثنوی اگرچہ مفقود ہے اس کے چند شعر میں ایک عکس سے جو پرنسپل محمد شفیع نے اگست سنہ ۱۹۳۷ع کے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا ہے اور اصل ورق الغزال پر غزنوی طرز کی کوفی میں پانچویں صدی ہجری کے منتصف اول کا نوشتہ ہے ۔ درج کرتا ہوں :—

جوانی خردمند مادرش مردہ بود	پدر نیز دیگر زنی کردہ بود
زنی بدکنش معشقولیہ نام	بنودش همی جز بدی هیچ کام
زن بد اگر چون مه روشن ست	میامیز با او که اهریمنست
دلش با پدر کردہ بودے درشت	همه تخم تریش دادی بمشت
هر آن مرد کو رفت بر رائے زن	نکوهیدہ باشد ابر رائے زن
برائے زن اندر ز بن سود نیست	گر آتش نمایدت جز دود نیست

میں اس عورت کے نام معشقولیہ کی طرف بھی توجہ دلاتا ہوں جو پھر عربی طرز کا ہے اور عجمی نہیں ۔

صفحہ ٦٧ کہتے ہیں :— «اسمعیل کی وفات کے بعد جو سامانی خاندان کا بانی ہے اس کا بھتیجا نصر بن احمد تخت‌نشین ہوا» ۔

واقعہ یہ ہے کہ اسمعیل سنہ ۲۹۵ ھ میں وفات پاتا ہے ۔ اس کا فرزند احمد اس کا جانشین ہوکر سنہ ۳۰۱ ھ میں فوت ہوتا ہے ۔ احمد کے بعد اس کا فرزند نصر تخت سلطنت پر جلوس کرتا ہے ۔ اس طرح نصر اسمعیل کا پوتا ہے نہ کہ بھتیجا ۔

صفحہ ۳۲ شیخ سرجویہ کے فارسی فقرے «برکست من نگفتم آن پسر مناذر گفت» کا ترجمۂ ذیل قابل غور ہے :

'I never said this concerning any one; that was said by Ibn Manazir.'

شمس العلما 'برکست' بہ تحریک سین پڑھ کر اسے مرکب لفظ مانتے ہیں اور اس کے معنی 'کسی کے متعلق' لیتے ہیں حالاں کہ «برگست» با کاف عجمی و سکون

سین ایک مفرد لفظ ہے جو تردیدی و ابتدائی کلمہ ہے اس کے معنے حاشا و معاذاللہ ہیں۔ یہ لفظ لغت فرس اور دیگر قدیم فرہنگوں میں ملتا ہے۔ قطران تبریزی:

بہمت چون فلک عالی بہ صورت ہم چو مہ رخشا
فلک چون او بود برگست مہ چون او بود حاشا

صفحہ ۵۱ «محمد قاسم»۔ ان ناموں کے درمیان اضافت ابنی ہے جو کسرہ کے ذریعے سے بولی جاتی ہے یعنی محمد بن قاسم۔ پروفیسر یہ اضافت ترک کر گئے ہیں۔

صفحہ ۶۹ سامانی دور کے شعرا رودکی، شہید بلخی، مرادی وغیرہ کے ساتھ ایک شاعرہ رابعہ بصری کا نام لیا ہے یہ حضرت رابعہ بصری نہیں ہیں جو صوفیوں کے زمرے میں مشہور ہیں اور سنہ ۱۸۵ ھ میں وفات پاتی ہیں بلکہ رابعہ قزداری جو کعب والئ قصدار یا قزدار کی دختر ہے اور مشہور شاعرہ ہے، رودکی اس کا کلام سن کر محو حیرت ہوگیا تھا۔ محمد عوفی اس کو مگس روئیں کہتا ہے۔ «الٰہی نامہ» میں عطار نے رابعہ کے تفصیلی حالات دیے ہیں (دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابت مئی سنہ ۱۹۲۵ع صفحہ ۶۸--۸۸)

صفحہ ۷۰ «الپتگین کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق سنہ ۳۶۷ ھ میں تخت نشین ہوا»۔

الپتگین بہ قول لین‌پول سنہ ۳۵۱ ھ میں غزنیں پہنچا۔ سنہ ۳۵۲ ھ میں اسحق جانشین ہوا۔ سنہ ۳۵۵ ھ میں بلکاتگین امیر مقرر ہوا۔ سنہ ۳۶۲ ھ میں پیری جانشین ہوکر سنہ ۳۶۶ ھ میں معزول ہوا اور سبکتگین اس کی جگہ امیر بنا۔ اس لیے ابواسحاق کو سنہ ۳۶۷ ھ میں الپتگین کا جانشین بنانا بالکل غلط ہے۔

صفحہ ۷۰-۷۱ کہتے ہیں کہ «فارسی تہذیب اور فارسی شعر کا ذوق ہندستان میں محمود کے باپ کے زمانے میں جڑ پکڑ چکا تھا کیوں‌کہ فتوحات کے سلسلے میں کئی بار اسے ہندستان آنا پڑا اور جیپال سے جنگیں کیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان حملوں میں کون کون شاعر اس کے ساتھ آئے مگر یہ بھی یقین ہے کہ حسب دستور بہت سے آئے ہوں گے۔ اس کے غیر مسلسل قیام کی وجہ سے ہندستان میں فارسی شاعری کا ذوق اس قدر نمایاں نظر نہیں آتا جتنا اس کے فرزند محمود کے دور میں۔ نہ کوئی ایسی یادداشت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعروں نے جیسا کہ قاعدہ رہا ہے خاص فتوحات کے موقعوں پر اس کی خدمت میں قصائد

پیش کیے ہوں - البتہ ابوالفتح بستی کی ایک نظم جو غزنیں میں تصنیف ہوئی موجود ہے - نہ قدیم مؤرخین کے ہاں ایسے اشارے جو ہندستان میں شعری تحریک پر روشنی ڈالیں ملتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی نظم ہندستان میں محمود کی فتح سے پیش‌تر کوئی منضبط شدہ تاریخ نہیں رکھتی "۔

ہمارے نزدیک یہ بحث سراسر فرضی اور خیالی ہے - سبکتگین کی جیپال کے ساتھ صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی پہلی لمغان پر اور دوسری لمغان سے کسی قدر فاصلے پر - بھلا یہ جنگیں ہندستان میں فارسی شاعری کی کیا تخم‌ریزی کرتیں اور ہندوؤں میں شعر کا ذوق کیا پھیلاتیں - اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سبکتگین کے پاس سپاہیوں کی جگہ شاعر اور تیروں کی جگہ شعر تھے تو بھی اہل ہند ایک بیگانہ تہذیب کا اثر کیوں قبول کرتے - ادھر حال یہ ہے کہ سبکتگین کے درباری شاعروں کے نام تک معلوم نہیں - لے دے کر ایک نام ابوالفتح بستی کا ملتا ہے جو فتح بست کے موقع پر سبکتگین کے ہاتھ آتا ہے - لیکن اس کا میدان عربی ہے - انشا اور کتابت کے واسطے مشہور ہے - سبکتگین نے اس کو اپنا درباری مؤرخ بنایا تھا - ایسی غیر موجّہ بحث اور قیاسی استدلال اس تالیف میں اور موقعوں پر بھی نظر آتے ہیں -

صفحہ ۷۱ ابوالعباس (فضل) بن احمد اسفرائنی کے واسطے لکھا ہے کہ " پہلے وہ نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا بعد میں سبکتگین کا وزیر ہوا جب وہ خراسان پر نوح بن نصر کی طرف سے حاکم ہوا - پیدایشی ایرانی ہونے کے سبب سے اسفرائنی عربی علمیت کے علاوہ فارسی کا جیّد عالم تھا " -

نصر بن احمد سنہ ۳۰۱ ھ میں تخت‌نشین ہوکر سنہ ۳۳۱ ھ میں وفات پاتا ہے اس لیے یہ ناقابل یقین ہے کہ ابوالعباس اس کے دربار کا ملازم ہو - نوح بن نصر جو سنہ ۳۳۱ ھ سے سنہ ۳۴۳ ھ تک حکومت کرتا رہا ہے ابوالعباس کے تعلق میں اس کا نام لینا بھی فضول ہے - تاریخ یمینی کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالعباس فائق کے مخصوصین میں سے تھا اور اس کا خطاب عمیدالدولہ تھا - جب سیف‌الدولہ محمود نیشاپور کا سپہ سالار بنایا گیا اس وقت ابوالعباس مرو کی ڈاک کا داروغہ تھا - امیر ناصرالدین سبکتگین کو اس کی امانت و دیانت کی اطلاع ملی - اس نے امیر رضی (مراد نوح بن منصور سنہ ۳۶۶ ھ و سنہ ۳۸۷ ھ) سے اسے مانگ لیا اور محمود کا وزیر بنادیا - ابوالعباس جزرس بہت تھا اس کو آمدنی

بڑھانے اور توفیر دکھانے سے سروکار تھا ۔ اس کی توفیر سے ملک تباہ ہوگیا اور آمدنی گھٹ گئی ۔

اس کی عربی دانی کے متعلق عتبی لکھتا ہے کہ وزیر ابوالعباس کو عربی کا علم نہ تھا اس لیے اس کی تحریریں فارسی میں ہوتی تھیں چناں‌چہ بہت بےرونق ثابت ہوا ۔ جب ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی وزیر بنا اس نے دفتر کی زبان عربی کردی اور عربی‌داں منشی مقرر کیے ۔

صفحہ ۷۲ شمس العلما کا یہ قول کہ « ابو العباس نے « شاہ نامہ » کی» تصنیف کے واسطے فردوسی کی سفارش کی صحیح بنیاد پر قائم نہیں ۔ کیوں‌کہ فردوسی محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس کتاب پر مصروف تھا ۔ چناں‌چہ :

سخن را نگہ داشتم سال بیست   بدان تا سزاوار این گنج کیست

ایک اور موقع پر کہا ہے :

همی گفتم این نامه را چند گاه   نهان بود از چشم خورشید و ماه

البتہ دربار شاہی میں فردوسی کا تعارف ابوالعباس کے توسط سے ہوتا ہے ۔

صفحہ ۷۳ پروفیسر کا یہ بیان کہ « عتبی نے اپنی تالیف (تاریخ یمینی) دربار خلافت سے سلطان کو خطاب یمین الدولہ عطا ہونے کی یادگار میں سلطان کے نام پر معنون کی » قابل غور ہے کیوں‌کہ یہ خطاب سلطان کی تخت نشینی سے ایک سال کے اندر اندر اس کو مل چکا تھا ۔ عتبی نے اگرچہ اپنی تالیف کی کوئی تاریخ نہیں دی لیکن سنہ ۴۰۹ ھ تک کے واقعات اس میں درج ہیں یعنے حملۂ قنوج بلکہ نصر بن ناصرالدین کی وفات کا بھی ذکر کیا ہے جو واقعہ سنہ ۴۱۲ ھ میں پیش آیا چوں‌کہ یمین الدولہ سلطان کا خطاب تھا اس لیے اکثر چیزیں سلطان کی طرف نسبت پانے کی وجہ سے یمینی کہلائیں مثلا ملک یمینی ۔ دولت یمینی ۔ عدل یمینی اسی طرح محمود کے سکّے یمینی کہلاتے تھے ۔ ان سکّوں پر یمینی مرقوم ہوتا تھا ۔ عتبی کی تالیف چوں‌کہ محمود کی تاریخ تھی اس لیے محمود کی نسبت سے تاریخ یمینی کہلائی ۔

پروفیسر کا یہ بیان کہ « تاریخ یمینی سنہ ۴۱۵ ھ کے قریب تصنیف ہوئی درست مانا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ کتاب محمود کی وفات کے بعد تالیف ہوئی درست نہیں کیوں‌کہ محمود سنہ ۴۲۱ ھ میں انتقال کرتا ہے ۔

صفحہ ۸۰ عوفی نے بہرام گور کا شعر جو نقل کیا ہے کہ :

منم آن شیر گلہ منم آن پیل یلہ نام من بہرام گور و کنیتم بوجبلہ

اس کے تعلق میں ہم کہیں گے کہ یہ شعر مثمن اپنی قدیم شکل میں دو بیت مربع کے برابر ہوگا ۔ ہر مصنف نے اپنے اپنے عہد میں اس میں تبدیلیاں کی ہیں ۔ ثعالبی غرر ملوک الفرس میں یوں نقل کرتے ہیں :

منم آن شیر شلہ منم آن ببر یلہ منم آن بہرام گور منم آن بوجبلہ

لیکن ابن خورداذبہ نے کتاب المسالک و الممالک میں جو سنہ ۳۳۰ ھ کے قریب تالیف ہوتی ہے اس کو نثر مسجع بہرام گور کے نام سے یاد کیا ہے چناں چہ :

منم شیر شلنبہ و منم ببر یلہ

صفحہ ۸۱ شمس العلما دولت شاہ کی روایت کہ عضد الدولہ بویہ کے عہد میں قصر شیریں کی محراب پر شعر ذیل کندہ دیکھا گیا تھا :

ہزبرا بگیہان انوشہ بذی جہان را بدیدار توشہ بذی

نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ شعر بہرام گور کے شعر سے زیادہ قدیم خیال کیا جاتا ہے ۔

میں کہوں گا کہ دولت شاہ راوی ضعیف ہے ۔ بہرام گور جس کے لیے قصر شیریں تعمیر ہوا خسرو پرویز کی محبوبہ شیریں سے بہت اقدم ہے اس کا زمانہ سنہ ۴۲۰ ھ تا سنہ ۴۳۸ ھ ہے اور خسرو پرویز کا زمانہ سنہ ۵۹۰ ھ تا سنہ ۶۲۷ ھ ہے ۔ اس کے علاوہ اس شعر کی ترکیب اور زبان چنداں قدیم بھی نہیں ۔ ’شاہ نامہ‘ کی ورق گردانی کرتے ہوے ہم دیکھتے ہیں کہ جب شاپور اردشیر بابکان سے اپنے فرزند اور مزد کا ذکر چھیڑتا ہے ۔ دعائیہ کہتا ہے :

بدو گفت شاپور انوشہ بذی جہان را بدیدار توشہ بذی

اس مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصر شیریں کے شاعر کو آخری مصرع میں فردوسی کے ساتھ توارد ہوگیا ہے ۔

ہم ناظرین کی توجہ اس شعر کے وزن کی طرف بھی مبذول کرنا چاہتے ہیں جو ’شاہ نامہ‘ کے وزن میں ہے یعنی متقارب مثمن محذوف ۔ محقق طوسی معیار الاشعار میں بحر متقارب مثمن کے واسطے کہتے ہیں کہ ایرانی اس وزن کو ’راہ اعشی‘ کہتے ہیں کیوں کہ اس بحر میں سب سے پہلے اعشی نے اشعار لکھے ہیں ۔ جب

اعشی اس وزن کا موجد قرار پایا تو کیا یہ مانا جائے کہ قصر شیریں کے شاعر کو وزن میں عرب شاعر اعشی کے ساتھ بھی توارد ہوگیا۔

صفحہ ۸۱ ایک اور قدیم شعر بہ حوالۂ تاریخ آل غزنین نقل کرتے ہیں و ہو ہذا:

زن شاہست در داؤر کردا گو زگردد ندارد بیم از کس

پروفیسر صاحب کے طفیل میں ہم اس کتاب کے نام سے واقف ہوتے ہیں۔ افسوس ہے انھوں نے اس کی کوئی صراحت نہیں دی تاہم وہ کوئی قدیم تالیف معلوم نہیں ہوتی غالبا گیارھویں صدی ہجری کے منتصف دوم یا بارھویں صدی کی تصنیف ہوگی۔

خان آرزو نے غالباً شمس میں شعر بالا بہ حوالۂ دبستان المذاہب اس شان نزول کے ساتھ نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے دور میں ایک بادشاہ فرہوش نامی گزرا ہے جس کی ملکہ کا نام شکر تھا۔ بادشاہ کے دسترخوان پر ایک روز ارد کی مقشّر دال لائی گئی۔ بادشاہ نے اپنے درباری شاعر شیدوس کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ دال کی تعریف میں کچھ کہے۔ شاعر نے فوراً ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا کہ دال کفّارۂ گناہ کے واسطے برہنہ ہوگئی ہے۔ بادشاہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا اور ملکہ شاعر پر عاشق ہوگئی۔ رات کے وقت شاعر کے گھر پہنچ کر طالب وصال ہوئی شیدوس نے انکار کیا اور کہا کہ جو عورت کسی سے نہیں ڈرتی اس سے ڈرنا چاہیے۔ تو فرہوش جیسے شاہ والاجاہ کو چھوڑ کر اس کے ایک ادنیٰ غلام پر فریفتہ ہوئی۔ قصہ مختصر ملکہ مایوس ہوکر محل کو لوٹ گئی۔ صبح کو بادشاہ نے جو ملکہ کے پیچھے پیچھے جاکر ملکہ اور شاعر کی گفتگو سن آیا تھا شاعر کو بلوایا اور ماجرائے شبینہ دریافت کیا۔ شیدوس نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

زن شاہست در داؤر کردا گو زگردد ندارد بیم از کس

فرہوش بادشاہ یہ شعر سن کر نہایت خوش ہوا اور صلے میں شاعر کو ملکہ شکر بخش دی۔ شیدوس کا گھر تو مفت میں بس گیا لیکن ہمیں اس قصے پر یقین لانے سے قطعاً انکار ہے۔ ہمارے نزدیک دبستان المذاہب کا نامعلوم پارسی مصنف اس شعر کے وجود میں لانے کا ذمہ دار ہے۔ وہ ایران کی قدامت کے جوش میں سلاطین ایران کے نئے سلسلے قائم کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پیشدادیوں سے قبل ایران میں چار اور سلسلے گزرے جن میں سب سے اقدم مہ آبادی ہیں۔ انھی کو آبادی کہا جاتا ہے۔ مہ آباد

ایران کا سب سے پہلا شخص ہے جسے خدا کی طرف سے پیغمبری اور بادشاہی عطا ہوئی ۔ اس پر کتاب مقدس دساتیر نازل ہوئی ۔ یہ کتاب پندرہ صحیفوں کا مجموعہ ہے اور ہر صحیفہ ایک ایک پیغمبر کی طرف منسوب ہے ۔ مہ آباد کے بعد تیرہ پیغمبر اور آئے اور سب کے سب آباد کہلائے ۔ مہ آبادیوں کے بعد دوسرے سلسلے میں ' جیان '، تیسرے میں ' شائی ' اور چوتھے میں ' یاسان ' ہیں ۔ پانچویں سلسلے میں ' گل شائی ' ہیں جنھیں پیشدادی بھی کہتے ہیں ۔ موجودہ تحقیقات پیشدادیوں بلکہ کیانیوں تک کو جن کے حالات سے ' شاہ نامہ ' کا بڑا حصہ پر ہے اساطیری درجہ دے رہی ہے ۔ پھر مہ آبادی، جیان، شائی اور یاسان کا تو ذکر ہی کیا ۔ جس طرح دساتیر مجعول ہے اسی طرح اس کے باقی بیانات اور سلسلے موضوع ہیں بلکہ شیدوس جیسے فرضی شاعروں کی بنا پر ایران میں فارسی شاعری کی قدامت کا دعویٰ بھی سراسر غلط ہے ۔

ارد کی دال ہندستانی کہاجا ہے ۔ چناں چہ ایرانی ہم ہندیوں کو آج تک دال خوری کا طعنہ دیا کرتے ہیں ۔ « غلّہ را بغلّہ خورند و گوبند دال روتی » ۔ لیکن شیدوس کے قصے کے مصنف پارسی نے جس کی تمام عمر ہندستانی فضا میں گزری ہے ۔ اپنے بزرگوں کو بھی دال کھلادی ۔

صفحہ ۸۱ شمس العلما یاتکار زریران کو ایک پہلوی رجزیہ نظم بتاتے ہیں جس کے دوسرے نام پہلوی شاہ نامہ اور شاہ نامۂ گشتاسپ ہیں ۔ اس کی تصنیف کی عزت زردشت کی طرف منسوب کی ہے ۔ فرماتے ہیں قیاس میں آتا ہے کہ اس نظم نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرک اور مثال کا کام دیا ۔

یاتکار زریران کو ہم نثر کی کتاب سمجھا کرتے تھے، نظم میں نکلی ۔ اس کا مصنف جسے ہم نامعلوم سمجھتے تھے، زردشت نکلا ۔ نیز یہ کہ فردوسی نے اپنا ' شاہ نامہ ' اس پہلوی ' شاہ نامہ ' کے نمونے پر ڈھالا ۔ چوں کہ شمس العلما نے اپنی اس جدید اطلاع کا کوئی ماخذ نہیں دیا ہے اس لیے ہم اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں ۔ شمس العلما کی یہ صراحت زیادہ تر اس حصۂ شاہ نامہ پر صادق آتی ہے جو دقیقی نے نظم کیا ہے ۔ وہ ان تمام مطالب پر حاوی ہے جو یاتکار زریران کے موضوع ہیں ۔ فردوسی کو اعتراف بھی ہے کہ دقیقی اس کا رہبر تھا : ہم او بود گوینده را راهبر ۔

صفحہ ۸۲ خسرو پرویز کے دو مطربوں کے نام باربد Barbud اور سرخش Sarakhsh بتاتے ہیں ۔ باربد اہل لغت بہ ضم بائے دوم بتاتے ہیں لیکن فردوسی نے بہ فتح

باربد دوم باندھا ہے اور یہی صحیح ہے :

چو رفتی بنزدیک او بار بد ۔۔۔ ہمش کار بد بد ہمش باربد

(دیگر) سر آمد کنون روز بر بار بد ۔۔۔ مبادا کہ باشد ترا یاربد

رہا 'سرخش' میں اس نام کی شناخت نہیں کرسکتا۔ بہت ممکن ہے کہ پروفیسر کا سہو قلم ہو اور صحیح نام سرکش ہو۔ سرکش خسرو کا مشہور مطرب ہے جو باربد کے خلاف حاجب دربار کے ساتھ سازش کرنے کی بنا پر معتوب شاہی ہوتا ہے۔

فردوسی ۔۔ یکی مطربی بود سرکش بنام ۔۔۔ بہ رامشگری در شدہ شادکام

اور فرخی ۔۔ شاعرانت چو رودکی و شہید ۔۔۔ مطربانت چو سرکش و سرکب

قصر شیریں اور شبدوس کے نوشتۂ بالا شعر نیز دیگر مثالوں سے شمس العلما اس کوشش میں مصروف ہیں کہ شاعری کا وجود ساسانی دور میں ثابت کیا جائے لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔ جو شہادت انھوں نے دی ہے زیادہ تر ظنی اور وضعی معلوم ہوتی ہے ۔ جیسا کہ میں گزشتہ سطور میں دکھا چکا ہوں خود ایرانیوں کی شہادت شمس العلما کے خلاف جاتی ہے ۔ عوفی، ناصر خسرو، فخری، گرگانی وغیرہم کے بیانات اس مسئلے پر فیصلہ کن ہیں۔

دولت شاہ کے ساتھ محمد صالح کنبوہ مورخ شاہجہاں، مولانا محمد حسین آزاد، رضا قلی خاں ہدایت اور عباس اقبال آشتیانی ساسانیوں کے زمانے میں شاعری کے وجود کے قائل ہیں۔ لیکن ان بزرگوں کے دلائل غیر تسلی بخش ہیں ۔ بعض یہاں تک کہ گزرے ہیں کہ ایران قدیم میں شاعری کی تمام اصطلاحیں تک موجود تھیں مثلاً نظم، پیوستہ ۔ نثر، پراگندہ ۔ شعر، سرواد ۔ قافیہ، ردیف، پساوند، تخلص، داغ، وزن شعر، دم، غزل، چامہ اور قصیدہ، چگامہ کہلاتے تھے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ جب یہ اصطلاحیں موجود تھیں تو کیا وجہ ہے کہ شعر اس زمانے میں موجود نہ ہو۔ میں اس موضوع پر رسالۂ سہیل، علی گڈھ (جنوری سنہ ۱۹۲۷ ع) میں کافی بحث کرچکا ہوں۔ یہاں اسی قدر کہوں گا کہ یہ فارسی اصطلاحیں عربی اصطلاحوں کا ترجمہ ہیں۔ چناں چہ پیوستہ، پراگندہ اور پساوند تو پہلی ہی نظر میں صاف نظم، نثر اور قافیہ یا ردیف کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ باقی اصطلاحیں بھی اسی پر قیاس کی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ ایرانیوں نے ان اصطلاحوں کو عربی اصطلاحوں کے ترجمے کے طور پر وضع کرلیا تاہم قبول عام کا خلعت ان کو نہ مل سکا۔ ان کا

استعمال ندرت کے ساتھ ہوا ہے اور صرف کتب لغات کی بنا پر وہ اب تک محفوظ ہیں۔ ایک امر موجب حیرت یہ ہے کہ ان بلند دعووں کے باوجود ایران میں قدامت شعر کے یہ مدعی لفظ 'شاعر' کے واسطے کوئی مفرد لفظ تجویز نہ کرسکے۔ سخن گو اور سخن پیوند اور ان کے بیسیوں مرادف بعد میں بنا لیے گئے ہیں۔ فردوسی 'گوینده' لاتا ہے میرے خیال میں وہ بھی قائل کا ترجمہ ہے:

چنن دید گوینده یک شب به خواب که رخشنده شمعی برآمد ز آب

(دیگر) تو نیز آفرین کن که گوینده بدو نام جاوید جوینده

گوینده بعد میں 'قوّال' کا مرادف قرار پایا۔

صفحہ ۹۵ بہ ذیل نثر فارسی در قرن سوم و چہارم ہجری:—

(۱) آئین بزرگی از دادبه پارسی المعروف به عبداللہ ابن المقفع تالیف سنہ ۲۳۷ھ

معلوم نہیں جناب پروفیسر کا کیا مقصد ہے۔ دادبه ابن المقفع کا نام نہیں ہے۔ اس کا نام روزبه اور اس کے باپ کا نام البتہ داذویہ ہے۔ رسالۂ 'کاوہ' کی یہ عبارت یاد رہے:—

یکی از دومین مترجین که خبر ازو دادیم مولف و مترجم بزرگ ایرانی معروف روزبه پسر داذویه مکنی بابوعمرو ایرانی زردشتی بود از اواخر قرن اول و اوائل قرن دوم که چون در دست عیسی بن علی بن عبداللہ بن عباس مسلمان شد معروف به ابومحمد عبداللہ بن المقفع بن المبارک گشت۔

اسی طرح ابن المقفع کا زمانہ بھی غلط دیا ہے۔ وہ سنہ ۱۴۰—۴۱ھ میں ہلاک ہوتا ہے۔ اور اس کا باپ داذویہ حجاج بن یوسف کے عہد میں سنہ ۷۵—۹۵ھ کے مابین ہلاک ہوتا ہے۔

(۵) فارسی ترجمۂ 'خدائی نامہ' حسب الحکم منصور اول جیسے اس کے دربار کے فاضل منشی قاضی ابومنصور بن عبدالرزاق معمری نے سنہ ۳۵۲ھ میں تیار کیا۔

منصور اول سے پروفیسر کی مراد امیر ابوصالح منصور بن نوح سنہ ۳۵۰ھ و سنہ ۳۶۶ھ ہے۔ لیکن منصور کے حکم سے 'خدائی نامہ' کا فارسی میں کوئی ترجمہ تیار نہیں ہوا۔ جس چیز کو 'خدائی نامہ' کا ترجمہ سمجھا جاتا ہے وہ 'شاہ نامۂ ابومنصوری' ہے جو ابومنصور محمد بن عبدالرزاق کے حکم سے بہ ادارت ابومنصور المعمری سنہ ۳۴۶ھ میں تیار ہوتا ہے۔ اس شاہنامے کا اصل دیباچہ فردوسی کے شاہنامے کے

ساتھ شامل کردیا گیا ہے اور دیباچۂ قدیم کے نام سے مشہور ہے ۔ اس دیباچے کا ایک فقرہ ذیل میں نقل ہوتا ہے :۔

« ابومنصور عبدالرزاق مردی بود با فرو خوش کام و بزرگ اندر کام روانی و بگوهر از تخم گردان ایران بود ۔ از روزگار آرزو کرد تا او وا نیز یادگاری بماند درین جهان ۔ پس دستور خویش ابومنصور المعمری را بفرمود تا بخداوندان کتب نامه کرد و کس فرستاد ۔ فرزانگان و جهان دیدگان از شهرها بیاوردند و چاکر او ابومنصور المعمری را بفرمود تا نامۂ گرد کرد............ بفرا آوردن این نامها ۔ (از کیومرث) نخستین که اندر جهان آمد او بود که آئین مردی آورد و مردمان را از جانوران پدیدار کرد تا یزدگرد که آخر ملوک عجم بود اندر ماه محرم که سال بر سی صدو چهل و شش بود از هجرت خواجۂ دنیا و عقبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم و این را شاهنامه نام نهاد ۔ »

ابومنصور کا ذکر ابن الاثیر اور زین الاخبار میں ملتا ہے ۔ اس کا خاندان معلوم ہوتا ہے ہمیشہ طوس میں رہا ہے ۔ ابومنصور ، سپہ سالار خراسان ابوعلی چغانی کی ماتحتی میں والیٔ طوس رہا ہے ۔ جب ابوعلی نے بغاوت کی اس نے ابوعلی کا ساتھ دیا ۔ سنہ ۳۳۸ھ میں امیر نوح بن نصر نے اس کا قصور معاف کردیا وہ واپس طوس آ گیا ۔ جمادی الآخر سنہ ۳۴۹ھ میں ابومنصور سپہ سالار خراسان بنایا گیا ۔ کچھ ماہ کے بعد یہی منصب الپتگین کو دے دیا گیا ۔ عبدالملک کی وفات پر نئے امیر ابوصالح منصور نے ابومنصور کو سپہ سالاری کا امیدوار بنا کر الپتگین کی گرفتاری کے واسطے مقرر کیا ۔ ابومنصور نے تعاقب کیا مگر الپتگین نکل چکا تھا ۔ چوں کہ ابومنصور کو سپہ سالاری ملنے کی امید نہیں رہی تھی اس نے بغاوت کردی اور ادھر ادھر لوٹ مار شروع کردی ۔ رئیس نسا کی اولاد سے ایک بھاری رقم جبراً وصول کی ۔ وشمگیر نے عیسائی طبیب یوحنّا کو ایک ہزار دینار رشوت دے کر ابومنصور کو زہر دلوادیا ۔ ادھر شاہی حکم سے ابوالحسن محمد بن ابراهیم دوبارہ سپہ سالاری کے عہدے پر سرفراز ہوکر ابومنصور کے مقابلے کے واسطے روانہ ہوا ۔ جب دونوں فوجیں مقابل ہوئیں ، زہر ابومنصور پر پورا اثر کرچکا تھا اور آنکھوں سے اسے سوجھتا نہیں تھا شکست کے بعد اس کے آدمیوں نے اسے لے جانا چاہا لیکن تکلیف سے اس کی حالت اس قدر غیر ہوچکی تھی کہ اس نے خود کہا مجھے یہیں چھوڑ جاؤ ۔ مجبوراً وہ چھوڑ گئے ۔ اسی وقت غنیم کی فوج کا ایک سقلابی غلام ادھر آ نکلا ۔ اس نے ابومنصور کا سر کاٹ

لیا ، ھاتھ میں سے انگوٹھی نکال لی اور اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ یہ سنہ ۳۵۰ ھ کا واقعہ ھے۔

(۸) ترجمان البلاغۃ از فرخی۔ تاریخ تصنیف سنہ ۳۹۵ اور مقام غزنین بتایا ھے۔ مگر میں خیال کرتا ھوں کہ فرخی اس تاریخ سے کئی سال بعد غزنین آیا ھے۔ اگر فرخی اس سال یا اس سال کے بعد غزنین میں ھوتا تو یقین ھے کہ محمود کے وزیر اول ابوالعباس فضل بن احمد اسفرائنی اور سلطان کے بھائی امیر نصر بن ناصرالدین کی مدح میں بھی قصائد لکھتا مگر دیوان میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی موجود نہیں جس سے ظاھر ھے کہ ابوالعباس کی وفات کے بعد وہ غزنین پہنچا ھوگا۔

(۱۰) غایۃ العروضین از بھرامی سرخسی۔ پروفیسر اس کی نسبت سرخشی با شین معجمہ لکھ رھے ھیں حالاں کہ وہ سرخس (با ھر دو سین مھملہ) کا رھنے والا ھے جو خراسان کا نہایت مشہور شہر ھے۔

(۱۵) نوروز نامے کے متعلق کہا ھے کہ خیام نے اسے پانچویں صدی کی ابتدا میں لکھا ھے۔ لیکن اس وقت تک تو عمر خیام پیدا بھی نہیں ھوا ھوگا۔ شمس العلما کا مقصد چھٹی صدی کی ابتدا سے ھوگا۔

(۱٦) زینت نامے کے مصنف راشدی سمرقندی کے متعلق کہا ھے کہ وہ سلطان ملک‌شاہ سلجوقی کے دربار کا شاعر ھے اور زینت نامہ اس نے سنہ ۴۲۵ ھ سے کچھ بعد تصنیف کیا۔ سنہ ۴۲۵ ھ میں نہ ملک‌شاہ پیدا ھوا تھا نہ راشدی۔ ۱٦ شوال سنہ ۴۸۵ ھ میں جب ملک‌شاہ کا انتقال ھوا اس وقت اس کی عمر اڑتیس سال تین مہینے اور سترہ دن کی تھی۔ بعض وجوہ سے پایا جاتا ھے کہ راشدی دربار غزنہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور مسعود سعد سلمان کے ساتھ اس کے روابط تھے۔ غالباً اس نے سیف الدولہ محمود کے پاس اس کی سفارش بھی کی ھے۔ دونوں شاعروں میں مشاعرے بھی ھوے ھیں۔ چناں چہ مسعود سعد سلمان:

ھر ان قصیدہ کہ گفتیش راشدی یک ماہ جواب گفتم بہ زبان بدیہہ ھم بزمان

(۱۸) موجودہ مجلدات بیہقی کے متعلق کہا ھے کہ خاندان غور کی ضخیم تاریخ کا باقی حصہ ھے۔ اس فقرے میں غور کی جگہ غزنہ چاھیے۔ اس کا نام ، آل سبکتگین جامع تاریخ ، الٹ پلٹ لکھ دیا گیا ھے۔

(۱۹) زین الاخبار کے مصنف کی نسبت Gurd-Yezi گردیزی (بہ ضم کاف فارسی و سکون زا و دال و فتح یا و سکون یاے دوم و کسر زا و سکون یا) دی ھے حالاں کہ

شہر کا صحیح نام گردیز بہ فتح کاف فارسی و سکون را و تحریک دال و سکون یا و زاے معجمہ ہے جس سے نسبت گردیزی ہوئی۔

شمس العلما اس تاریخ کو بیرونی کی آثار الباقیہ کی ایک تقلید مانتے ہیں۔

(۲۰) اسدی مصنف لغت فرس کو سلطان محمود غزنوی کے دربار کا شاعر مانا ہے حالاں کہ یہ اسدی خورد ہے جو گرشاسپ نامہ تالیف سنہ ۴۵۸ھ کا ناظم ہے۔ پال ہورن مرتب لغت فرس کا بیان ہے کہ اسدی نے یہ فرہنگ اپنے آخر حصۂ عمر میں تصنیف کی ہے۔

(۲۱) سفرنامۂ ناصر خسرو کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا ایک نیا ایڈیشن ڈاکٹر ناظم نے یونیورسٹی پریس کیمبرج سے شائع کیا ہے۔ یہ اطلاع خلاف واقعہ ہے۔ نہ ڈاکٹر ناظم نے یہ سفرنامہ مرتب کیا نہ کیمبرج یونیورسٹی پریس نے اسے چھاپا۔

(۲۲) تاریخ بلعمی از محمد بن عبد اللہ البلعمی وزیر معروف نصر بن احمد سامانی۔ جو اس نے ایام پیری میں سنہ ۴۴۶ھ کے قریب تالیف کی۔

سامانیوں میں دو بلعمی وزیر گزرے ہیں پہلا ابو الفضل (محمد بن عبیداللہ) البلعمی متوفی سنہ ۳۲۹ھ جو نصر بن احمد سامانی (سنہ ۳۰۴ و سنہ ۳۳۱ھ) کا وزیر تھا۔ دوسرا ابوعلی (محمد بن محمد) البلعمی خلف ابوالفضل مذکور متوفی سنہ ۳۶۳ھ وزیر منصور بن نوح (سنہ ۳۵۰ و ۳۶۶ھ) جس نے تاریخ طبری کا ترجمہ کیا ہے یعنی وہی تاریخ جو پروفیسر نے نمبر (۴) میں درج کی ہے۔ سامانی خاندان سنہ ۳۸۹ھ میں ختم ہوجاتا ہے۔ ہمیں تعجب آتا ہے اس وزیر پر جو سامانیوں کے خاندان کے اختتام سے ستاون سال بعد اپنی تاریخ لکھتا ہے۔ اگر اس وزیر کو نصر بن احمد کا وزیر مانا جاے جیسا کہ ہم سے کہا گیا ہے تو وہ سنہ ۳۲۹ میں فوت ہوجاتا ہے۔ سنہ ۴۴۶ھ میں اس کے لیے اپنی تاریخ لکھنا ناممکن ہے۔

(۲۳) تاریخ سیستان، کی تالیف سنہ ۴۴۸ھ میں نہیں بلکہ سنہ ۴۴۰ھ میں شروع ہوئی ہے۔

صفحہ ۱۰۳ کہتے ہیں 'ابوحفص جس نے تاریخ قائم کرنے والے ابیات لکھے ہیں پہلی صدی میں گزرا ہے'۔

معلوم نہیں یہ تاریخ قائم کرنے والے اشعار کون سے ہیں۔ ہمیں حکیم ابوحفص کا صرف ایک شعر معلوم ہے جو اکثر تذکرہ نگار نقل کرتے ہیں۔ لیکن ابوحفص

کا زمانہ پہلی صدی میں قیاس کرنا درست نہیں معلوم ہوتا ۔ وہ ایک فارسی فرہنگ کا بھی مصنف ہے جس کا ذکر مولانا جمال الدین حسین انجو نے اپنی کتاب فرہنگ جہانگیری میں کیا ہے ۔ پہلی صدی میں فارسی کی فرہنگ کا تصنیف ہونا بعید از قیاس ہے ۔ ادھر محمد بن قیس المعجم میں اور آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ میں سنہ ۳۰۰ ھ کے قریب اس کا عہد مانتے ہیں ۔

صفحہ ۱۰۴ خواجہ ابو العباس مروزی کے ابیات کے سلسلے میں مرزا محمد بن عبدالوهاب قزوینی نے جو بدگمانی کا اظہار کیا ہے اور ان کی اصلیت پر بعض وجوہ کی بنا پر شک کی فضا قائم کردی ہے ۔ شمس العلما نے اس کا جواب فی نفسہ قابلیت کے ساتھ دیا ہے ۔ اگرچہ بعض امور میں ہم ان کے ساتھ اتفاق نہیں کرسکتے ۔ ان اشعار کی روانی اور ان میں عربی الفاظ کی کثرت ہمارے خیال میں متاخرین کی ترمیم کا نتیجہ ہے ۔ سنہ ۱۹۳ ھ میں بحر رمل مثمن کا استعمال فی الحقیقت نہایت حیرت انگیز ہے ۔ شمس العلما کا یہ عقیدہ کہ ابو العباس ، حنظلہ اور وصیف سنجری نے خلیل کے عروضی قواعد و ضوابط کی کبھی پروا نہیں کی بلکہ شعرائے عرب کا تتبع کرتے رہے جو خلیل واضع عروض کی ولادت سے بڑی قبل گزرے تھے ہماری مشکل حل نہیں کرتا کیونکہ رمل مثمن عربی میں نہیں آتی نہ خلیل نے اس کا ذکر کیا ۔ ایک رمل پر کیا موقوف ہے دوسری مثمن بحریں بھی مستعملۂ فارسی ، عربی میں رائج نہیں لہذا تقلید شعرائے عرب کا سوال ہی پیش نہیں آتا ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایرانی عربی عروض کی اشاعت کے بعد ایک عرصے تک تقلیداً مربعات و مسدسات میں اپنے اشعار لکھتے رہے پھر ایک زمانہ آیا جب ان مربعات کو ترک کرکے ان کی جگہ انہوں نے مثمنات کو جو عربی میں نامعلوم تھے اور فارسی کے قدرتی رجحان کے عین مطابق ، دریافت کرلیا اور عروضی قواعد میں ضروری ترمیم کرکے جدید عروض اختیار کرلیا ۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ عروض عربی کی اشاعت اور اس کی اصلاحی تشکیل کے واسطے بہت مدت درکار ہے ۔ یہ کام پچاس ساٹھ سال میں سر انجام نہیں ہوسکتا ۔

ہم پروفیسر صاحب کی توجہ ابن مفرغ کے اشعار (سنہ ۶۴—۶۰) : ابست نبیذ است الخ اور بلخیوں کے طنزیہ ابیات : از ختلان آمدہ برو تباہ آمدہ الخ (سنہ ۱۰۸ ھ) نیز ابوالعباس بن طرخان کے اشعار : سمرقند کند مند بزینت کے فگندی الخ (سنہ ۱۷۷ ھ) کی طرف مبذول کرکے عرض کرتے ہیں کہ یہ اشعار اپنے اپنے زمانے کے اصلی نمونے ہیں جو سب کے سب مربعات میں داخل ہیں ۔ جب سنہ ۱۷۷ ھ تک

مربعات عام طور پر رائج ھیں تو یہ باور کرنا کسی قدر مشکل معلوم ھوتا ھے کہ سنہ ۱۹۳ ھ میں ابوالعباس مروزی نے رمل کے مثمن میں اشعار لکھے ھوں اس لیے ھمیں ماننا پڑےگا کہ ان اشعار میں متاخرین کے ھاتھوں بہت کچھ اصلاح ھوئی ھے حتیٰ کہ ان کا قدیم وزن غائب ھوگیا۔

صفحہ ۱۰۸ ابوحفص سغدی، میں سغد بہ ضم اول ھے نہ بالفتح اور حنظلہ بہ فتح اول ھے نہ بالکسر جیسا کہ پروفیسر صاحب نے قلم‌بند کیا ھے۔

(۱۰۹) رباعی کے اولین نمونوں میں حنظلہ بادغیسی کی دو رباعیاں دی ھیں جو صفحہ ۱۱۰ پر درج ھیں - پہلی رباعی کا ابتدائی مصرع ھے:

مہتری گر بکام شیر در است الخ

یہ رباعی جس کو قطعہ کہنا صحیح ھوگا بحر خفیف مسدس مخبون مقصور میں ھے اور رباعی کے وزن میں شامل نہیں۔

رباعی کی دوسری مثال میں وہ قطعہ دیا ھے جو: یارم سپند گرچہ بر آتش ھمی فگند، سے شروع ھوتا ھے۔ قطعۂ ھذا بحر مضارع میں ھے اور رباعی کے وزن سے خارج۔ اس لیے اس کو رباعی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ھے۔

صفحہ ۱۱۴ پر تیسری صدی کے شعرا کی ایک انتخابی فہرست دی ھے۔ اس فہرست کے شاعر نمبر ۲ کا نام محمد بن مہلد "Muhammad bin Muhallad" ھے میں اس نام کو دیکھ کر سخت حیران ھوا۔ آخر قیاس سے کام لیا۔ معلوم ھوتا ھے کہ یہ محمد بن مخلد ھے جس کا ذکر تاریخ سیستان میں آتا ھے۔ غالباً یہ ٹائپ کی غلطی ھے۔

شاعر نمبر ۷ کا نام ابوالعباس زنجانی Abul Abbas Zanjani دیا ھے۔ شمس العلما کو یہاں سہو ھوگیا ھے یہ ابوالعباس ربنجنی (بہ فتح را و کسر با و سکون نون و فتح جیم و کسرۂ نون و سکون یا) ھے۔ ربنجن سغد سمرقند میں ایک شہر کا نام ھے۔

صفحہ ۱۱۷ فیروز مشرقی کے قطعے کو جس کی ابتدا ھے:

مرغیست خدنگ اے عجب دیدہ

رباعی کے نام سے یاد کیا ھے۔ اس قطعے کا وزن ھزج مسدس اخرب مقبوض ھے جسے رباعی سے کوئی واسطہ نہیں۔

رودکی

صفحہ ۱۱۸ کہتے ہیں کہ "رودکی مادر زاد نابینا تھا"۔

میں اس سوال پر تنقید شعرالعجم میں کسی قدر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ متینی شرح یمینی (صفحہ ۵۲ جلد اول طبع مصر سنہ ۱۲۸۲ ھ) میں شارح نجاتی کی سند پر اور نجاتی رشیدی کے سعد نامے کے حوالے سے لکھتا ہے کہ عمر کے آخری دور میں رودکی کی آنکھوں میں سلائی پھروادی گئی تھی۔

صفحہ ۱۱۹ لکھا ہے کہ رودکی پہلا ایرانی شاعر ہے جو ہندستانی تخیل اور ذہنیت کا دلدادہ تھا اور جس نے ہندستان میں فارسی شاعری کی ترقی میں اثر ڈالا"۔

ہم حیران ہیں کہ رودکی بھلا فارسی شاعری کی اشاعت کے لیے ہندستان میں کیا اثر انداز ہوتا۔ نہ کبھی وہ ہندستان آیا نہ ہندستان کے لوگوں سے تعلق رہا۔ اس سلسلے میں اس کے منظوم ترجمۂ کلیلہ کا ذکر بےسود ہے۔ اسی طرح پروفیسر کا دوسرا دعوی یعنی ہندستانی فکریّت کے واسطے شاعر کا اشتیاق نبوت کا محتاج ہے۔

شمس العلما کا خیال ہے کہ کلیلہ و دمنہ رودکی نے نصر بن احمد سامانی کے حکم سے لکھی تھی۔ لیکن فردوسی کے اشعار سے جو انھوں نے صفحۂ ۱۲۰ پر نقل کیے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ نصر کے وزیر ابوالفضل بلعمی کے حکم سے پہلے عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی پھر اس کی خواہش پر رودکی نے اس کو نظم کر ڈالا چناں چہ:

گرانمایہ بوالفضل دستور اوی   کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی و دری   بگفتند و کوتاہ شد داوری

اس کے بعد رودکی کے پاس ایک قاری بٹھا دیا گیا جو اس کو سناتا جاتا اور وہ نظم کرتا جاتا تھا۔

گزارندہ را پیش بنشاندند   ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بہ پیوست گویا پراگندہ را   بسفت این چنین درّ آگندہ را

صفحہ ۱۲۰ کہتے ہیں کہ امیر نصر نے شاعر کو ایک خلعت اور چالیس ہزار درہم کلیلہ دمنہ کے صلے میں مرحمت فرمائے ثبوت میں عنصری کا شعر ذیل نقل کیا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش　　　عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

شمس العلما نے اگرچہ اس شعر کے لیے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ شعرالعجم سے ماخوذ ہے۔ میں تنقید شعرالعجم میں اس موضوع پر کافی بحث کرچکا ہوں۔ یہاں اس قدر کہنا مناسب ہوگا کہ عنصری کے دیوان میں کلیلہ کا مطلق ذکر نہیں۔ شاعر نے دوسرا مصرع یوں لکھا تھا: بیافتہ است بتوزیع ازین در و آن در جس سے ظاہر ہے کہ یہ انعام کلیلہ کے صلے میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر۔

ازرقی ایک موقع پر عنصری کا یہی شعر اپنے ذہن میں رکھ کر کہتا ہے:

حدیث میر خراسان و قصۂ توزیع　　　بگفت رودکی از روی فخر در اشعار

اس شعر سے ظاہر ہے کہ عنصری نے اصل میں 'توزیع' لکھا تھا۔ بعد میں کسی نے اصلاح دے کر اس کی جگہ کلیلہ دمنہ بنادیا۔ مزید شہادت میں خود رودکی کا شعر نقل کیا جاتا ہے، جس کی بنیاد پر یہ قصہ وضع ہوا۔ و ھو ھذا:

بداد میر خراسانش چل ہزار درم　　　وزو فزونی یک پنج میر ما کان بود

صفحہ ۱۲۱ رودکی کے اشعار کی تعداد کے متعلق کہا ہے کہ 'رشیدی سمرقندی نے انھیں تیرہ مرتبہ گنا ایک لاکھ سے اوپر نکلے'۔ رشیدی کا شعر جس سے یہ معنے اخذ کیے ہیں ذیل میں درج ہے:

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار　　　ہم فزون تر آید او چونانکہ باید بشمری

مگر پروفیسر کا مفہوم جو اعتراض سے خالی نہیں اس شعر سے تو ظاہر نہیں ہوتا۔ تیرہ بار گنا پھر بھی صحیح تعداد معلوم نہ ہوسکی مجبوراً کہہ دیا کہ ایک لاکھ سے سوا ہیں یہ کیا بات ہوئی؟ ہمارے نزدیک شاعر کا مطلب ہے کہ میں نے اس کے اشعار کا شمار کیا، تیرہ لاکھ نکلے لیکن اگر احتیاط سے انھیں گنا جائے تو اور بھی زیادہ نکلیں گے۔

صفحہ ۱۲۵ زین الملک اصفہانی کو معزی کا دوست اور رفیق کہا ہے۔

صفحہ ۱۲۶ اس صفحے پر رودکی کے قصیدے کی مثال میں چار شعر دیے ہیں - ان کا آغاز ہے:

بود هرجا بهر نزهت‌گاه یار و نقل و مل — گلستان در گلستان و میوه اندر میوه‌زار

اور حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ ”دیوان رودکی کی طبع طہران ناقابل اعتبار ہے - اس میں رودکی کے معاصر حکیم قطران کا کلام ناقابل امتیاز حد تک مخلوط ہوگیا ہے میں نے رودکی کے یہ اشعار حکیم قطران کے ایک مخطوطہ سے جو ڈاکٹر ہادی‌حسن کی ملک ہے مقابلے کے بعد یہاں درج کیے ہیں -

اس صریح بیان کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار رودکی کے نہیں ہیں بلکہ حکیم قطران تبریزی کی ملک ہیں - یہ بھی صحیح نہیں کہ قطران رودکی کا معاصر ہے بلکہ اس سے سو سوا سو سال بعد گزرا ہے - میں اسی قصیدے کا ایک شعر نقل کرتا ہوں جو تمام گنجلک دور کر دیتا ہے:

افتخار دهر ابومنصور و هسودان که هست — بندگانش را بمیران صد هزاران افتخار

یہ ابومنصور سامانی نہیں ہے جیسا کہ شمس‌العلما نے صفحہ ۱۲۵ پر تحریر کیا ہے بلکہ آذربائیجان کا بادشاہ جو ابونصر مملان کا جانشین ہے - قطران ان دونوں کا مداح ہے -

حکیم ناصر خسرو بلخی سنہ ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا - اس وقت آذربائیجان کا بادشاہ یہی ابومنصور وهسودان تھا - اس کا پورا نام سفرنامے میں یوں دیا ہے -

«الامیر اجل سیف‌الدوله و شرف‌الملہ ابومنصور وهسودان بن محمد مولی امیرالمومنین» - (سفرنامۂ حکیم ناصر خسرو مرتبۂ مولانا حالی صفحہ ۳۷)

صفحہ ۱۲۷ رودکی کی غزل کے نمونے میں اشعار ذیل نقل ہوے ہیں -

مشوش است دلم از کرشمۂ سلمیٰ — چنانکه خاطر مجنون ز طرۂ لیلیٰ
چو گل شکر دهیم درد دل شود تسکین — چو ترش روی شوی وارهانی از صفریٰ
به غنچۂ تو شکر خنده نشۂ باده — به سنبل تو در گوش مهرۂ افعیٰ
ببرده نرگس تو آب جادوی بابل — کشاده غنچۂ تو باب معجز عیسیٰ

ایسی صاف اور ہموار زبان نہ رودکی کی ہوسکتی ہے نہ اس کے عہد کی بلکہ کئی سو برس بعد کی معلوم ہوتی ہے - کرشمۂ سلمیٰ، طرۂ لیلیٰ، مہرۂ افعیٰ، خاطر مجنون، آب جادوی بابل، نشۂ بادہ، در گوش، معجز عیسیٰ وغیرہ ترکیبیں متاخرین کی شاعری کی

نمایاں خصوصیات میں ہیں - زبان کی روانی اور صفائی بھی تمام تر متاخرین کے رنگ میں ہے -

یہی حالت اس قصیدے کے اشعار کی ہے جو صفحہ ۱۲۹ و صفحہ ۱۳۰ پر رودکی کی غزل کی مثال میں نقل ہوے ہیں اور جن کی ابتدا ہے :

چو بکشاید نگارمن دو بادام و دو مرجان را　　بدین نازان کند دل را بدان رنجان کند جان را

ہماری راے میں ان کو رودکی سے دور کا تعلق بھی نہیں -

صفحہ ۱۲۸ شعر :

تو رودکی را اے مہ کنون ہمی بینی　　بدان زمانہ ندیدی کہ زین خشیسان بود

پچھلا مصرع اصلاح طلب ہے یوں چاہیے : بدان زمانہ ندیدی کہ در خراسان بود

مصرع : عیال نہ زن و فرزند نہ معونت نہ ، میں معونت کی جگہ مئونت چاہیے - اسی طرح شعر :

کرا بزرگی و نعمت ازین و آن بودی　　کرا بزرگی و نعمت ز آل سامان بود

کے مصرع دوم میں 'کرا' کی جگہ 'ورا' چاہیے -

صفحہ ۱۳۲ مرادی کے مرثیے میں رودکی نے جو دو بیت کہے ہیں یعنی : مرد مرادی نہ ہمانا کہ مرد الخ پروفیسر ان کو رباعی کے نام سے یاد کرتے ہیں - یہ وزن مفتعلن مفتعلن فاعلان بحر سریع مطوی موقوف ہے -

صفحہ ۱۳۲ کہتے ہیں - ' رودکی کی ایک رباعی جو اس نے اپنے دوست شہید بلخی کی وفات پر کہی ہے - اس کی تاریخ وفات کی حامل ہے - فارسی شاعری کی تاریخ میں (بہ حساب ابجد) مادۂ تاریخ برآمد کرنے کی یہ پہلی مثال ہے وھو ھذا :

کاروان شہید رفت از پیش　　و آن ما رفتہ گیوی اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم　　در شمار خرد ہزاران بیش

یہ دوبیت بحر خفیف میں ہیں اور وزن رباعی سے خارج - شمس العلما نے یہ تو کہہ دیا کہ تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے مگر نہ سال تاریخ دیا نہ مادۂ تاریخ کا پتا بتایا - ہم حیران ہیں کہ یہ تاریخ کیونکر معلوم ہوگی جس حال میں کہ شاعر نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا - ہمارا خیال ہے کہ رودکی کے عہد میں بحساب جمل کسی کلمے یا فقرے سے مادۂ تاریخ نکالنے کا طریقہ نامعلوم تھا - لہذا ان اشعار سے کسی تاریخ کی امید رکھنا فعل عبث ہے -

چوتھے مصرع میں 'در شہار خرد' کے بجاے 'وز شہار خرد' بہتر اور موزوں قرأت ہے۔

اسی صفحے پر ایک رباعی جس کا آغاز ہے: چون کار دلم ز زلف او مانند گرہ الخ اگرچہ رباعی کے وزن میں ہے لیکن رودکی کی زبان نہیں معلوم ہوتی بلکہ بہت بعد کی جب زبان میں محاورات کی، افراط پیدا ہوگئی ہے۔ 'گرہ ماندن کار'۔ 'گرہ ماندن گریہ در گلو' ایسے محاورے ہیں جو رودکی کے دور میں موجود نہیں تھے۔

صفحہ ۱۳۳ 'روز آخر یکی کفن کردند' میں 'کردند' کی جگہ 'بروند' چاہیے۔ یہ بھی رباعی کا وزن نہیں ہے۔

اسی صفحے پر دو رباعیاں موجود ہیں جن کی ابتدا ہے (۱) اے از گل سرخ رنگ بربودۂ و بو، الخ۔ اور (۲) با آنکہ دلم از غم ہجرت خونست، الخ۔ رودکی کی طرف ان کا انتساب بہت مشتبہ ہے۔

صفحہ ۱۳۵ کہتے ہیں کہ قزوینی نے 'بست مقالے' میں سنہ ۳۲۹ھ رودکی کی تاریخ وفات دی ہے لیکن اپنی اطلاع کا ماخذ نہیں دیا ہے۔

یہ ماخذ انساب السمعانی ہے (صفحہ ۲۶۲ طبع یورپ)

اسی صفحے پر تقی اوحدی کے تذکرے کا نام 'عرفات' "Urafat" بہ ضم عین دیا ہے۔ اصل میں عین پر فتحہ ہے نہ ضمہ۔ پورا نام 'عرفات العاشقین' ہے۔

شمس العلما رودکی کی مثنوی کو فارسی مثنوی گوئی کا اولین نمونہ کہتے ہیں جو یقیناً صحیح نہیں۔ شاہ نامۂ مسعودی رودکی کے عہد سے بہت پہلے نظم ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۳۷ 'چنیں داستان کس نگفت از خیال' میں 'خیال' کی جگہ 'فیال' فے کے ساتھ چاہیے۔

حاجی صاحب کے پرواز تخیل کی مثال میں یہ عبارت نقل کی جاسکتی ہے۔ فرماتے ہیں:

'ابوالمویّد کی مثنوی یوسف زلیخا اس عہد میں اچھی مثنوی کی ایک اور مثال ہے۔ فارسی زبان کے نہایت مشہور شاعر خسرو اور جامی اس کی طرز کے مقلد ہیں۔'

گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ نظامی کی مثنویوں کی طرح یہ مثنوی بھی قبولیت عام کا خلعت حاصل کرچکی تھی۔ اور اس کی مقبولیت دیکھ کر خسرو اور جامی نے اس کے

انداز کا تتبع کیا ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس یوسف زلیخا سے کوئی شخص واقف نہیں ۔ یوسف زلیخا سے منسوب بہ فردوسی کے دیباچے میں جو صرف ایک قلمی نسخے میں مل سکا ہے ایک شعر آتا ہے ۔

یکی بوالموید کہ از بلخ بود بدانش ہمی خویشتن را ستود

یہ تنہا ماخذ ہے ہمارے اس علم کا کہ ابوالموید نے کوئی زلیخا نظم کی تھی اس سے زیادہ کسی کو کوئی اطلاع نہیں ۔ اس میں امیر خسرو اور جامی بھی شامل ہیں بدقسمتی سے اس تالیف کو زیادہ عمر نصیب نہ ہوئی ۔ اور اپنے وجود میں آنے سے ایک صدی بعد دنیا سے رخصت ہوگئی ۔ یہی حال اس کی دوسری تصنیف شاہنامۂ بزرگ کا ہوا جس کا ذکر چوتھی اور پانچویں صدی کے اہل قلم کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ابوالموید کوئی بڑا شاعر و ناثر نہیں تھا جو دیر تک دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا اور خسرو اور جامی اس کی شاعری سے اپنا چراغ روشن کرتے ۔

صفحہ ۱۳۹ کہتے ہیں ۔ 'عوفی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ رودکی اور دقیقی معاصر تھے اور دونوں نے نصر بن احمد سامانی کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۔ دقیقی پہلا فارسی شاعر ہے جس نے ایران میں رجزیہ شاعری کی بنیاد ڈالی ۔

جہاں تک ہمیں یاد ہے عوفی دونوں شاعروں کی معاصرت کے ذکر کے متعلق خاموش ہے ۔ رودکی کو نصر بن احمد سنہ ۳۳۱--۱ کے عہد کا اور دقیقی کو ابوصالح منصور بن نصر (کذا) سنہ ۳۵۰--۶۵ اور نوح بن منصور سنہ ۳۶۵--۸۷ھ کے زمانے کا شاعر مانتا ہے ۔ یہ امر ثبوت کا محتاج ہے دقیقی نے نصر بن احمد کی شان میں قصائد نظم کیے ہوں ۔

دقیقی سے پیش تر ایک شاعر مسعودی مروزی گزرا ہے جس نے کیومرث سے لےکر یزدجرد تک شاہنامے کی داستانیں نظم کی تھیں ۔ رسالۂ کاوہ میں جو میری اطلاع کا ماخذ ہے مرقوم ہے :

« مسعودی مروزی تا آن جا کہ ما فعلاً خبر داریم قدیم‌ترین شاعریست کہ داستان ملی و تاریخ ایران را از کیومرث تا یزدجرد آخری برشتۂ نظم کشیدہ بودہ است » ۔

مسعودی کا ذکر دو ذرائع سے ہمیں ملتا ہے ۔ (۱) ثعالبی کی کتاب غررملوک الفرس تالیف سنہ ۴۰۸--۱۲ھ ۔ (۲) مطہر بن طاہر المقدسی کی کتاب البدء و التاریخ جو سنہ ۳۵۵ھ میں تصنیف ہوئی ۔

مقدسی کے ہاں مسعودی کے تین شعر محفوظ ہیں ۔ پہلے دو ابتدا سے اور تیسرا خاتمے سے :

(۱) نخستین کیومرث آمد بشاهی گرفتش بگیتی درون پیشگاهی
(۲) چو سی سالی بگیتی پادشا بود که فرمانش بهر جایے روا بود
(۳) سپری شد نشان خسروانا چو کام خویش راندند درجهانا

مقدسی کے زمانے میں مسعودی کی یہ مثنوی بہت مقبول تھی۔ اس کی عزت کی جاتی تھی اور قومی تاریخ کا درجہ دیا جاتا تھا ۔ اس کے واسطے تصویریں تیار کرائی جاتی تھیں ۔

صفحہ ۱۴۲ کہتے ہیں کہ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے اپنے رزمیہ کو عربی الفاظ کی آمیزش سے پاک کیا ۔ یہی روش فردوسی نے اختیار کرلی اور آخر تک اس پر قائم رہا ۔

شمس العلما اس عقیدے میں مولانا شبلی کے مقلد ہیں ۔ میں اس بحث پر تنقید شعرالعجم میں کسی قدر مفصل لکھ چکا ہوں یہاں مختصراً اتنا کہوں گا کہ قصیدے وغیرہ میں سامانی دور کے شعرا قافیے کی ضرورت سے عربی ذخیرے کی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں۔ مثنوی میں یہ ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوتی اس لیے عربی اثر سے پاک ہے ۔ اس لحاظ سے دقیقی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا بلکہ قاعدہ ۔ رودکی اور ابوشکور بلخی کی مثنویوں کے جس قدر اشعار ملتے ہیں تعجب کی حد تک عربی الفاظ کی آمیزش سے پاک ہیں ۔ میں مثالاً ابوشکور کے آفرین نامے سے متفرق اشعار نقل کرتا ہوں جو علی بن ابی نصر بن علی معروف بہ ابی الحسین اوزجندی کی عربی تالیف کے فارسی ترجمے موسوم بہ خرم نامے میں محفوظ ہیں ۔ یہ ترجمہ پانچویں صدی ہجری کے منتصف اول میں شہر مراغہ میں تیار ہوا ہے ۔

ابوشکور گوید در آفرین نامہ :

چه نیکو سخن گفت فرزانه مرد نگر تا توان نزد شیران مگرد
نگهدار تن باش و آن دو چشم که چشم آورد پادشه را بخشم
ابا پادشه پادشاهی مجوی نهنگان چشمش شود روبروی
شنیدم که بی بادهٔ مغز گیر شود پادشه زود مستی پذیر

(دیگر) ابوشکور در همین معنی گوید :

سزد ار بکمتر نباشی ژند — نباشی بچیز کسان آزمند
نه کمتر بوی نزد مردم شناس — نه بر گردن تو کسی را سپاس
هم از دست رنجت اگر نان خوری — بنان کسان اندرون ننگری

(دیگر) چناں‌چه ابوشکور گوید :

کرا باده مستی کند بیدرنگ — چو هشیاری آید از و نیست ننگ
کرا بادشاهی کند مست کار — ابی بادشاهی شود هوشیار

(دیگر) مثنوی :

نهفتن سزد راز را جاودان — بجان گیر این پند ها را بجان
چو با دوست دشمن بباید کشاد — هنرمند موبد چنان کرد یاد
سخن گر ز دشمن بخواهی نهفت — ابا دوست برکس محالست گفت
چو گر دوست رازت نگهدارد او — چو دشمن شود راز پیش آرد او

(دیگر) نظم :

چه دشمن بتو گرچه نیکو بود — سرانجام برزشت نیرو بود
اگر زشت آید ز دشمن پیام — نگر تا نخوانیش دشمن بنام
چو دشمن ترا پیش دارد شکر — گمان بر که زهر است هرگز مخور

(دیگر) نظم :

بگفتار دشمن چه آید فرود — که خوش نیست با گفت دشمن سرود
نه هرچ او بگوید سخن آن کند — نه هرچش بگوئی تو فرمان کند

جو ابیات مثنوی اور نظم کے عنوان سے درج ہوے ہیں بہت ممکن ہے کہ ابوشکور ہی کے ہوں ۔ لیکن سب کے سب عربی کے اثر سے پاک ہیں ۔ اس مختصر نمونے سے ظاہر ہے کہ تمام آفرین‌نامہ اسی رنگ میں ہوگا ۔

شمس العلما کے برخلاف ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ عربی اثر رودکی، دقیقی وغیرہم کے عہد سے فارسی میں محسوس ہونے لگا ہے کیوں‌کہ اس عہد سے قبل فارسی میں لٹریچر نہیں تھا جس پر عربی کا اثر ہوتا ۔ جب لٹریچر شروع ہوا تب ہی اثر آیا ۔ چناں‌چہ یہی دور زیر بحث ہے جس میں عربی اثر محسوس ہونے لگا ہے ۔ اس عہد کے بعد جوں جوں فارسی لٹریچر بڑھتا جاتا ہے یہ اثر بھی پھیلتا جاتا ہے

حتیٰ کہ سلجوقی دور میں ایک طوفان کی طرح چھا گیا اور مقامات حمیدی جیسی تالیفات ظہور میں آنے لگیں۔

میں یہاں اسی خرم نامے سے ایک 'اخلاقی غزل نقل کرتا ہوں جس میں چند شعر جنس لطیف کے خلاف عام معاندت کے مظہر ہیں جیسا کہ عہد قدیم کا دستور تھا۔ اس غزل میں بعض الفاظ عربی کے بھی موجود ہیں:

ازان کز تو بیش است ترسیدہ بہ ... و زانچہ ندانی تو پرسیدہ بہ
ندانی، ازانکس کہ داند بپرس ... جواب سخنہا نیوشیدہ بہ
نباشند ہمداستان بخردان ... ز ہر باب یک لفظ بشنیدہ بہ
سخن خورد جانست و ہمراز جان ... سخن را بجان بر طرازیدہ بہ
کہ جان بےسخن سخت غمگین بود ... بگفتار خوبش نوازیدہ بہ
نہ مردم فرشتست نہ گاوخر ... ازین طبع گاویش ببریدہ بہ
بخواہیدن دخت نیکوسگال ... کہ زن گر بخواہی سگالیدہ بہ
کرا دختران بزرگ جسیم ... دلش از غمان سخت پیچیدہ بہ
کہ دفن البنات من المکرمات ... حدیثی ست کانرا شناسیدہ بہ
نباید کہ دختر بزاید زنی ... و گر زاد در گور پوشیدہ بہ
پس ار زاد و مرگش بیامد فراز ... بدان خان شویش فرستیدہ بہ

صفحہ ۱۴۵ کہتے ہیں کہ دقیقی کی رباعیاں اب ناپید ہیں صرف ایک رباعی باقی رہی ہے جو یہاں منقول ہے:

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد ... آری دہد ولیک بعمری دگر دہد
من عمر خویش را بصبوری گزاشتم ... عمری دگر بباید تا صبر بر دہد

شمس العلما ان شاعروں کی رباعیاں درج کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں مگر تعجب ہے کہ وہ اشعار رباعی و غیر رباعی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جہاں چار مصرعے نظر آئے ان کا نام رباعی رکھ دیا۔

رباعی اصل میں بحر ہزج کے خاص چوبیس اوزان کا نام ہے جو شجرۂ اخرم و اخرب میں نصف نصف منقسم ہیں۔ دقیقی کے یہ دو بیت رباعی کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کا وزن مضارع مثمن مقبوض و محذوف ہے۔

ان شعروں کی زبان کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے جس میں سات لفظ عربی کے شامل ہیں۔ کیا ایسی مثالوں کے باوجود دقیقی فارسی زبان کو عربی الفاظ کی ملاوٹ سے پاک و صاف کرنے والا مانا جائےگا۔

صفحہ ۱۴۸ دقیقی اور اس کے معاصرین کے کلام سے فارسی ادب کے عام رجحانات کے تعلق میں شمس العلما نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں سے نمبر۷ میں کہتے ہیں:

نمبر ۷ (۱) "نظموں کے اکثر اوزان مقامی اور قدیم الاصل ہیں (۲) عربی اوزان صرف قصائد کے ساتھ مخصوص ہیں (۳) رباعی اور قطعات کے اوزان ایرانی ہیں (۴) اور غزلیں ایرانی ساخت کے اوزان میں ایرانی ذوق اور مقتضیات کے مناسب لکھی گئی ہیں"۔

سہولت کی غرض سے ہم نے اس بیان میں ہندسے ڈال دیے ہیں۔ ان میں سے (۱) میں بےحد تعمیم ہے۔ ان اوزان کو قدیم الاصل کہنا صحیح نہیں۔ ایرانیوں میں نہ شعر و شاعری کا دستور تھا نہ فن عروض تھا۔ جس قدر اوزان فارسی میں مستعمل ہیں یا تو عربی سے ماخوذ ہیں یا ان ماخوذ شدہ اوزان میں کسی قدر اصلاح کرکے ان کو اپنے مذاق کے مطابق درست کر لیا ہے۔ ایک تعداد ایسے اوزان کی ہے جو بعد میں دریافت ہوئے۔ (۲) میں عربی اوزان کی تخصیص خلاف حقیقت ہے۔ قصیدے کے لیے کسی وزن کی قید نہیں۔ معلومہ اوزان میں جس وزن میں چاہو لکھو حتیٰ کہ فرخی نے رباعی کے وزن میں بھی قصیدہ لکھا ہے (۳) رباعی کے اوزان ایران زاد ہیں مگر زمانۂ بعد از اسلام میں دریافت ہوئے ہیں۔ قطعے کے لیے کوئی خاص وزن مقرر نہیں۔ قصیدے کی طرح ہر وزن میں لکھا جاسکتا ہے۔ (۴) غزل کے ساتھ ایرانی ساخت کے اوزان کی شرط بےمعنی ہے۔ جس وزن میں قصیدہ اور قطعہ لکھا جاتا ہے اسی وزن میں لکھی غزل جاسکتی ہے۔ البتہ رباعی اور مثنوی کے خاص اوزان ہیں۔ شمس العلما مثنوی کا تو ذکر ہی نہیں کرتے اور رباعی و غیر رباعی اوزان میں عملاً جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کوئی فرق نہیں کرتے۔

صفحہ ۱۵۱

نیک بخت آن کسی که داد و نخورد	شوربخت آنکه او نخورد و نداد

صفحہ ۱۵۲

ز آمده شادمان نباید بود	وز گزشته نکرد باید یاد

دونوں شعروں کو حکیم قطران تبریزی کی ملک بتایا ہے حالاں‌کہ وہ رود کی کی نہایت مشہور نظم سے تعلق رکھتے ہیں چناں‌چہ:

شاد زی باسیاہ چشمان شاد — کہ جہان نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادمان نباید بود — وز گزشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آن کسی کہ داد و بخورد — شوربخت آنکہ او نخورد و نداد
باد و ابر است این جہان افسوس — بادہ پیش آر ہرچہ بادا باد

صفہ ۱۵۲ ذیل کی نظم بھی قطران کی بتائی گئی ہے:-

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز — نہ بہ آخر بمرد باید باز
خواہی اندر عنا و محنت زی — خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک‌تر از جہان بپذیر — خواہی از ری بگیر تا بحجاز
این ہمہ بود و باد تو خوابست — خواب را حکم نی دگر بمجاز
این ہمہ روز مرگ اگر دمنی — نشناسی ز یک دگرشان باز

یہ اشعار بھی متفقاً رودکی کے مانے جاتے ہیں۔ پروفیسر نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کو قطران کی طرف منسوب کردیا ہے۔

صفحہ ۱۵۳ اسی طرح رودکی کے ایک نہایت مشہور قطعے کا شعر ذیل قطران کے حوالے کردیا ہے:

روی بہ محراب نہادن چہ سود — دل بہ بخارا و بتان طراز

اس قطعے کا دوسرا شعر یہ ہے:

ایزد ما وسوسۂ عاشقی — از تو پزیرد نہ پزیرد نماز

صفحہ ۱۵۵ تیسرے باب کی ابتدائی سطور میں جو غزنویوں پر ہے سلطان محمود کے واسطے تحریر ہوا ہے کہ اس نے ایک شاہی جامعہ اور ایک عجائب‌خانہ قائم کیا تھا۔

یہ بیان غالباً شعرالعجم سے ماخوذ ہے۔ لیکن جیسا کہ تنقید شعرالعجم میں دکھایا گیا ہے۔ یہ روایت علامہ شبلی نے فرشتے سے نقل کی ہے اور فرشتے کی اصل عبارت یہ ہے:

«و در جوار آن مسجد مدرسۂ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف کردہ» ۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۰، نول کشور ۔

فرشتے کے ہاں صرف مدرسہ اور کتاب خانہ مذکور ہے۔ عجائب خانہ کسی غلطی کی بنا پر مولانا کے قلم سے نکلا اور ہمارے شمس العلما بھی اسی غلطی کے شکار ہوگئے۔

صفحہ ۱۵۶ خوارزم Khwarazam بہ کسر راے مہملہ ہے اور صفحہ ۱۵۷ حموی Hamwi بفتح میم ہے۔

صفحہ ۱۶۴ تاریخ سلاطین آل غزنیں کے ایک اقتباس میں یہ عبارت آئی ہے:

«خریطۂ بدست حاجب خود میرزا حمید بخاری بخوارزم بطرف امیر فرستاد»۔

اس عبارت میں لفظ «میرزا» مورد تامل ہے۔ یہ لفظ غالباً تیموریوں سے رواج میں آتا ہے۔ اس کا استعمال غزنیوں میں نامعلوم ہے۔

صفحہ ۱۷۴ نیالتگین «Niyaltagin» صحیح نیالتگین بہ فتح یا و نون ہے۔ «ناتھ» کے مارے جانے پر اس کا قریبی رشتہ دار «تولک افسر بنایا جاتا ہے»۔

لیکن تاریخ بیہقی میں «تلک» لکھا ہے اور اس کے حالات بھی دیے ہیں کہ وہ کشمیری تھا اور ذات کا حجام۔ ہندی اور فارسی خط نہایت عمدہ لکھتا تھا۔ خواجہ احمد بن حسن میمندی اس کو اپنے ساتھ لائے پہلے ترجمانوں میں ہوا پھر اس قدر ترقی کی کہ نیالتگین والی ہند کی سرکوبی کے واسطے جو باغی ہوگیا تھا مقرر ہوا۔ تلک نے نیالتگین کو قتل کرکے اس مہم کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام دیا۔ بہر حال ناتھ کا وہ رشتہ دار نہیں ہے۔

صفحہ ۱۷۵ «بالائی ہند میں فارسی کی اشاعت بواسطۂ سید سالار مسعود غازی»۔

شمس العلما عنوان تراشنے میں بےمثل ہیں۔ یہ دلفریب عنوان دیکھ کر ہر شخص یہی گمان کرےگا کہ سالار مسعود غازی کسی اور مقصد سے نہیں بلکہ فارسی کی ادبی خدمت کے واسطے ہندستان تشریف لائے تھے۔ یہ قصہ آج تک نامعلوم رہا اور شمس العلما پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس بھولی بسری داستان کا سراغ لگایا۔ محمود کی فوجوں میں ہم ترک، خلج، افغان، عرب اور ہندو قومیت کے سپاہیوں کا غلبہ دیکھتے ہیں۔ چوں کہ یہ خالص فارسی کی مہم ہے اس لیے شمس العلما نے سالار غازی کے لشکر میں ایرانی سپاہی دکھائے ہیں۔ یہ لشکر قنوج کی طرف روانہ ہوا۔ سرہند، کل (کول؟)، متھرا اور آگرے (تعجب ہے کہ اگرہ صحیح بہ فتح اول نہ بہ مد اول اس وقت موجود تھا۔ حالاں کہ یہ مشہور شہر سکندر لودھی کا بسایا ہوا ہے)

والوں کی مزاحمت پر قابو پاکر اور گنگا پار کرکے اودھ پہنچ گیا۔ بتوں کی پرستش معدوم کرنا اور خدائے واحد کے نام کی منادی کرنا ان لوگوں کا مقصد تھا۔ نوجوان غازی کا لشکر جو لمبے سفر کی سختیوں کی وجہ سے گھٹتا جارہا تھا خستہ و ماندہ اور چکناچور بہرائچ پہنچ گیا۔ یہاں سترہ گھنٹے کی جنگ کے بعد جو ہندی مہینے جیٹھہ کے پہلے ہفتے میں اتوار اور پیر کو ہوتی رہی غازی موصوف نے جام شہادت نوش کیا۔ چناں‌چہ ان کا عرس اب تک منایا جاتا ہے۔

شمس‌العلما کا خیال ہے کہ لاہور سے بہرائچ تک کی اس مہم کے نتائج ادبی اور ذہنی لحاظ سے قابل غور ہیں۔ سالار غازی کے سیکڑوں پیرو جو برگزیدہ ایرانی تھے اپنے سردار کی شہادت اور لشکر کے منتشر ہوجانے کے بعد اودھ کے علاقے میں آباد ہوگئے جہاں ان کی اولاد آج بھی پائی جاتی ہے۔ اس جماعت کے مستقل قیام نے فارسی تہذیب و تمدن کی اشاعت و ترویج کے واسطے اندرونی اودھ میں نمایاں خدمت کی اور اس حصۂ ہند کے لوگوں کی تہذیبی اور ادبی ذوق پر مفید اثر ڈالا۔ سید سالار کے تابعین سب کے سب فارسی بولنے والے تھے جو منتشر ہوکر اودھ کے علاقے میں آباد ہوگئے۔ اس واقعے کی بنا پر فارسی الفاظ اور رسم و رواج کو اندرون ملک میں داخلے کا موقعہ مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صوبے کی ہندو آبادی نے بہت جلد بعد فارسی زبان و ادب کا ذوق پیدا کرلیا اور غزنویوں کی حکومت کے لنقطاع سے ایک صدی کے اندر اندر فارسی بولنے اور لکھنے لگے۔

معلوم نہیں اس عہد کے مورخین ہمیں کیسے کیسے سرابوں کے پیچھے دوڑائیں گے۔ مجھے روایت پر اعتراض نہیں بلکہ روایت کے اثرات پر جن کے شمس‌العلما مدعی ہیں یعنی اس مزعومہ ادبی کام‌یابی پر جو اس مہم کا ماحصل بتائی جاتی ہے۔ پروفیسر اگر ہمیں اس عہد کے زیادہ نہیں دو چار مسلمان اور ہندو شعرا و مصنفین کے نام گنا دیتے یا ان کی تصنیفات اور دواوین کی نشان‌دھی کر دیتے یا وہ اثر واضح کرتے جو اودھ کی زبان یا اس کے تمدنی شعبوں پر ہوا تو جو کچھ وہ منوانا چاہتے ہم مان لیتے۔ بہ‌حالت موجودہ پروفیسر کا یہ بیان ایک دل‌کش خواب کا حکم رکھتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

سالار غازی کی شکست اور شہادت کے بعد ان کے ہزیمت یافتہ لشکر کے لیے اودھ کی سرزمین میں تو امن کی جگہ تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ ہر شخص ان کے خون کا پیاسا ہوگا۔ تلاش کر کرکے ان کو قتل کیا ہوگا۔ کیسی بستی بسانا اور کیسا ذوق

شعر پھیلانا۔ اور یہ جو پروفیسر نے سالار غازی کے لشکر کو ایرانی فوج سے سجایا ہے ہمارے نزدیک درست نہیں۔ بھلا ایرانی جو دفتری زندگی کے طبعاً عادی تھے سالار کے ساتھ نامعلوم دور و دراز مقامات میں کیوں آنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت کے تراشنے والے اس عہد کے اصلی حالات سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

شمس العلما ایک اور مغالطے میں ہمیں مبتلا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غزنویوں کی سلطنت کے اختتام سے ایک صدی کے اندر اندر اودھ کے علاقے میں فارسی بولی اور لکھی جانے لگی۔ یہ بیان بجائے خود درست ہے لیکن سالار مسعود سے اس کا کیا واسطہ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان محمود سنہ ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ غزنویوں کا آخری تاجدار خسرو ملک سنہ ۵۸۲ ھ میں سلطان معزالدین محمد بن سام کی قید میں آجاتا ہے۔ اس تاریخ پر ایک صدی اور اضافہ کی جائے تو یہ اضافہ ہمیں سنہ ۶۸۲ھ میں لے آتا ہے جو غیاث الدین بلبن کا زمانہ ہے۔ ادھر سالار مسعود غازی سنہ ۴۲۴ھ میں جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ اس حساب سے ان کی وفات سے ڈھائی سو سال بعد سالار کی مہم اپنا رنگ لائی اور اودھ میں ذوق شعر و ادب پروان چڑھا۔ مگر پروفیسر نے یہ تو لمبا راستہ اختیار کیا ہے۔ گدی کے پیچھے ہاتھ لے جا کر ناک پکڑنے سے کیا فائدہ؟ یہ استدلال بالکل بےمعنی ہے۔ ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سلطان معزالدین محمد بن سام سنہ ۵۸۹ھ میں دہلی فتح کرتا ہے اور چند سال کے اندر اندر تمام مشرقی علاقہ بنگالے تک فتح ہوکر مسلمانوں کے قبضے میں آجاتا ہے۔ جگہ جگہ ان کی بستیاں اور چھاونیاں بن جاتی ہیں۔ غزنویوں کی تقلید میں درباری زبان فارسی رہتی ہے۔ اور اہل دفتر سب کے سب فارسی جاننے والے ہوتے ہیں۔ چناں چہ مسلمانی فتوحات کے سیلاب کے ساتھ ساتھ فارسی بھی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اودھ کے علاقے میں بھی یہی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اور وہی کام جو (شمس العلما مدعی ہیں) سالار مسعود کے طفیل میں ہوا ہم کہتے ہیں درحقیقت وہ کام دہلی میں اسلامی حکومت کے قیام کی بنا پر ظہور پزیر ہوا۔ اس میں سالار مسعود کا کون سا احسان

۱۷۸ محمود کے درباری شعرا میں منوچہری کا نام بھی شامل کیا ہے حالاں کہ وہ صریحاً اس کے فرزند مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے اور خاص اسی کے دربار سے تعلق رکھتا ہے۔ تنقید شعرالعجم میں، میں اس پر کافی بحث کرچکا ہوں۔

اس کے بعد پروفیسر محمود کے درباری شعرا عنصری، عسجدی، اسدی، فرخی، فردوسی، منوچھری اور غضائری، کی شاعری پر اس سومندی کے اثر کی طرف توجہ دلاتے ھیں جو ھندستان کی سازگار آب و ھوا نے اسے پہنچایا ھے۔ بالفاظ دیگر نزاکت خیال، رنگینی انشا اور شگفتگی بیان جو ان کی مدحیہ اور بیانیہ شاعری میں موجود ھے۔ پروفیسر کا دعوی ھے ھندستانی فضا کے بغیر جس کا اثر ان پر تمام و کمال چھایا ھوا ھے ناممکن تھا۔

ایسے جذباتی اور خیالی بیان پر ھمیں اظہار حیرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ورنہ ظاھر ھے کہ غزنی کی حملہ آور کی معیت میں یہ مسافر شاعر جو سردی کے موسم میں گاہ گاہ ادھر آ نکلے ھیں ھندستان کی آب و ھوا ان کی شاعری میں وجدانی تاثیر کی کیا روح پھونکتی۔ فرخی تو پروفیسر کے دعوے کی صاف صاف تردید کرتا ھے۔ وہ سفر ھند اور اس کی صعوبت کو اپنے ایک بےمزہ قصیدے کا ذمہ‌دار ٹھیراتا ھے اور امیر محمد بن محمود سے معافی مانگتا ھوا کہتا ھے:

بار خدایا خدایگانا شاھا — شعر مرا سہل بر گزارہ کن این بار
زانکہ مرا رنج و خستگی رہ قنوج — کوفتہ کردہ است و خیرہ مغز و سبکسار

صفحہ ۱۸۰ سومنات کے سفر کے ذکر میں فرخی کا مشہور قصیدہ ھے جس کی سرخی ھے۔ «در ذکر سفر سومنات و قدح آن الخ۔ پروفیسر نے 'قدح آن' کا ترجمہ «its storming» کیا ھے۔ ھمارے نزدیک 'قدح' ضد مدح ھے مگر قصائد فرخی میں قدح کی جگہ 'فتح' ھے جس سے عبارت کی تمام گنجلک دور ھوجاتی ھے۔

راستے کی منازل بیان کرنے والے اشعار کا انتخاب پروفیسر نے مع انگریزی ترجمے کے نقل کیا ھے اس ترجمے سے چودھواں اور پندرھواں شعر چھوٹ گیا ھے یعنی:

چو چیکلودار کہ صندوقہاے زبور یافت — بکوہ پایۂ او شہریار شیر شکر
چو نہلوارہ کہ اندر دیار ھند بھیم — بہ نہلوارہ ھمی کرد بر شہان مفخر

صفہ ۱۸۱ شعر

فراخ پہنا حوضی بہ صد ھزار عمل — ھزار بت‌کدۂ خورد کرد حوض اندر

اس شعر میں 'فراخ پہنا' کی جگہ 'دراز و پہنا' بہتر قرأت ھے۔ اور 'گرد حوض اندر' کا ترجمہ 'حوض کے اندر' درست نہیں۔ 'گردا گرد' یا حوض کے گرد زیادہ صحیح ھے۔

صفحہ ۱۸۱

دگر چو دیولوارہ کہ ہمچو دیو سفید		پدید بود سر افراشتہ میان گزر

پروفیسر شہر دیولواڑہ (گجراتی، دیلواڈ) کو اپنے ترجمہ میں دیولواڑہ حوض کہہ رہے ہیں۔ حالاں کہ فرخی مختلف منزلیں گنا رہا ہے یعنی لدوارہ، جو جیسلمیر کے قریب ہے، چیکودار، نہرواد، مندھیر، اس لیے دیولوارہ بھی منزل کا نام ہے نہ تالاب کا جس کے بعد سومنات آتا ہے۔ دیولواڑے کے ذکر میں فرخی نے کئی شعر لکھے ہیں۔ اس شہر میں ناریل اور چھالیا (سپاری) کے درخت کثرت سے تھے۔ شہر کے کنارے پر ایک مضبوط قلعہ تھا جہاں بت‌پرستوں کا زبردست اجتماع تھا۔ چناں‌چہ:

دگر چو دیولوارہ کہ ہمچو روز سپید		پدید بود سر افراشتہ میان گزر
درو درختان چون گوزهندی و پوپل		کہ ہر درخت بسالی دهد مکرر بر
یکی حصار قوی بر کران شهر و دران		ز بت‌پرستان گرد آمده یکی معشر

دیولوارے کے بیان کے ساتھ شعر ذیل بالکل بےمحل لایا گیا ہے:

فریضہ ہر روز آن سنگ را بشستندی		بہ آب گنگ و بشیرو بزعفران و شکر

جو اصل میں سومنات کے بت کے غسل کے تذکرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا ایراد یہاں بہ‌حالیکہ سومنات سے تعلق رکھنے والے تمام اشعار حذف کردیے ہیں بالکل غلط فہمی پیدا کرے گا۔

صفحہ ۱۸۳ فرخی کے واسطے کہا ہے کہ قیام ہندستان کی بنا پر اس نے ہندی الفاظ اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔ مثال میں یہ شعر نقل کیا ہے:

بگونۂ شل افغانیان دو پرہ و تیز		چو دستہ دستہ بهم تیرهای چون سوفار

آخری مصرع میں 'دستہ بستہ' بجاے 'دستہ دستہ' زیادہ مناسب ہے۔ اور 'چون سوفار' کی جگہ 'بےسوفار' چاہیے۔

اگر ایک لفظ سے کسی کا قیام ہند ثابت ہوسکتا ہے تو فردوسی کے لیے بھی یہی دعوی کیا جاسکتا ہے وہ کہتا ہے:

چو آگاه شد کوتوال حصار		بر آویخت با رستم نامدار

(صفحہ ۴۷ جلد اول شاہنامہ طبع بمبئی سنہ ۱۲۷۴)

کوتوالی ہندی لفظ ہے یعنی کوٹ والا۔

(دیگر)

ز گفتار او مانده شنکل شگفت ز سر شارۂ هندوی برگرفت

(صفحه ۱۳۴ جلد سوم طبع ایضاً)

یه تو ایک جملهٔ معترضه تها۔ فرخی کے هاں اور هندی الفاظ بهی موجود هیں۔ مثلاً
'کت، جو کهٹ یعنی کهاٹ هے۔ مثال:—

خلافت جدا کرد جیپالیان را ز کتهاے زرین و شاهانه زیور

(صفحه ۸۵)

فرهنگ نامهٔ قواس میں لکها هے۔ 'کت، تخت هندوان باشد میان بافته

نخچیروالی، یعنی شکاری اور شکار کهلانے والا۔ مثال:

نخچیر والان این ملک را شاگرد باشد فزون ز بهرام

(صفحه ۲۲۵)

شمن، (بت‌پرست) مثال:

اندیشهٔ رعیت چنداں‌که او کند اندیشهٔ وثن نه همانا کند شمن

(صفحه ۳۳۴)

(دیگر)

زائران را مثل نماز برد چون شمن در بهار پیش وثن

(صفحه ۳۲۶)

(دیگر)

باغ بت‌خانه گشت و گلبن بت باده‌خواران گل پرست شمن

(صفحه ۳۰۹)

لنگهن، روزۂ هندواں۔ مثال:

خوان او دائم بر زائر و بر مهمان ور جزین باشد حقا که کند لنگهن

(صفه ۳۲۷)

چندن، صندل، مثال:

هم زره روم سوی چین رو و برگیر از چمن و باغ چین نهالهٔ چندن

(صفحه ۲۷۲)

صفحه ۱۸۴-۳ کہتے ہیں که (۱) مختاری سلطان ابراهیم کے عهد میں هندستان آیا اور پنجاب میں آباد هوگیا۔ اس نے اپنے قیام لاهور و ملتان کے زمانے میں بےشمار قصیدے بادشاہ کے تعریف میں لکھے۔ ان میں ایک قصیده نہایت مشهور هے :-

مسلمانان دلی دارم که ضائع می‌شود جانش
درافتادم بدان دردی که پیدا نیست درمانش

(۲) ملتان کے نخاس سے اس نے ایک هندی غلام خریدا، وغیره۔

(۱) مختاری سلطان ابراهیم کے عهد میں هندستان نہیں آسکتا۔ اس کا زمانۂ شاعری ابراهیم کے عهد سے بعد شروع هوتا هے۔ اس کے دیوان میں علاءالدین مسعود بن ابراهیم (۴۹۲-۵۰۹ھ) کی مدح میں قصائد ملتے هیں۔ نیز اس کے فرزند ارسلان شاہ کی تعریف میں مگر ابراهیم کی شان میں کوئی قصیده موجود نہیں۔ وہ ان سیاح شاعروں میں سے هے جو کامیابی کی امید میں مختلف درباروں میں تقدیر آزمائی کرتے رهے هیں۔ آل غزنه کے علاوہ وہ آل افراسیاب اور سلاجقۂ کرمان کے درباروں میں بھی رہا هے لیکن زیادہ قصائد غزنوی سلاطین کی شان میں ملتے هیں۔ 'شهریار نامه' بھی مختاری نے مسعود کے نام پر لکھا هے۔

مختاری کا پنجاب میں آکر آباد هوجانا اور لاهور و ملتان میں رہ‌کر قصائد لکھنا ایک ظنی معامله هے جو ثبوت کا محتاج هے۔ اگر وہ هندستان آیا هے تو چلتا پھرتا آیا هے۔ مطلع بالا اگرچه شمس‌العلما نے دولت‌شاہ کی سند پر مختاری کی طرف منسوب کیا هے مگر جہاں تک میرا حافظه مدد دیتا هے یه مطلع اس کے دیوان میں موجود نہیں۔ اسی طرح اس قصیدے کے واسطے یه دعوی «و بسیاری از اکابر این قصیده را جواب گفته‌اند همانا بزیبائی این قصیده نگفته باشند» ۔ جو پروفیسر نے نقل کیا هے بےدلیل هے۔ اول تو اس مطلع کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط قائم نہیں۔ ایسا معلوم هوتا هے که دولت‌شاہ نے دو مختلف شاعروں کے مصرعوں سے اپنا مطلع تیار کرکے مختاری کے حوالے کردیا هے۔ مثلاً دوسرا مصرع شهاب الدین ادیب صابر کے هاں ملتا هے۔ چناں‌چه :

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حکم فرمانش
درافتادم در آن دردی که پیدانیست درمانش

علی‌هذالقیاس پروفیسر کا دعوی که اس قصیدے کا جواب خسرو، انوری، خاقانی سلمان، عرفی وغیره نے دیا هے اصولاً صحیح نہیں۔ اس زمین کے اصل مالک غالباً

خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں کیوں‌کہ ادیب صابر اپنے اسی قصیدے کے آخر میں جس کا مطلع اوپر درج ہوچکا ہے کہتا ہے:

گر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش

لہذا مختاری اس زمین کا موجد نہیں ہے بلکہ مقلد۔ مختاری کا اصل مطلع اس کے دیوان میں یوں ہے:

مسلمان کشتن آئین کرد چشم نامسلمانش
بنوک ناوک مژگان کہ پر زہر است پیکانش

لیکن یہ قصیدہ سلطان ابراہیم کے نام پر نہیں ہے بلکہ محمود روباہی کی تعریف میں جو غالباً والئی ہند ہے۔ مادح اور ممدوح کے نام شعر ذیل میں آئے ہیں:

کہ گر عثمان مختاری بدرد از درد درماند
بجز محمود روباہی کہ داند کرد درمانش

شاعر اپنے ممدوح کو کہتا ہے:

بہندستان بکن کاری، چنان کاری و با عظمت
کہ عبرت نامہا سازند مردان در خراسانش

بہر حال مختاری کا یہ قصیدہ کسی خاص شہرت کا مالک نہیں۔ اس زمین میں جس شاعر کا قصیدہ کام‌یاب مانا گیا ہے وہ خاقانی شروانی ہے۔ اس کا مطلع ہے:

دل من پیر تعلیمست و من طفل زبان دانش
دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

مختلف شعرا نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چناں‌چہ امیرخسرو کا مطلع ہے:

دلم طفلست و پیر عشق استاد زباندانش
سواد الوجہ سبق و مسکنت کنج دبستانش

خسرو کا جو مصرع شمس‌العلما نے صفحہ ۱۸۴ پر نقل کیا ہے وہ مطلع اول نہیں ہے، ثانی ہو تو ہو۔ عرفی بھی خاقانی کا قصیدہ سامنے رکھ کر کہتا ہے:

دل من باغبان عشق و حیرانی گلستانش
ازل دروازۂ باغ و ابد حد خیابانش

ابھی زمین میں دو اور شاعروں کے مطلع نقل ہوتے ہیں:

شمالی دھستانی :

بتی دارم که یک ساعت برون نایم ز فرمانش
چو ایمان دارم اندر دل بخوبی عهد و پیمانش

سید عزالدین حسن :

گهر برزد همی یارم ز یاقوت در افشانش
شدم چون ذره در سایه ز خورشید درخشانش

(۲) ملتان کے نخّاس سے هندی غلام کی خریداری ثبوت طلب ہے۔ وہ غزنی کے بازار سے بھی تو خرید سکتا تھا۔

صفحه ۱۸۷ مختاری کے قصیدے سے گیارہ شعر نقل کرکے جس کی تشبیب سانڈنی کے بیان کی حامل ہے راے دی ہے کہ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تشبیہیں اور خیالات جو ایرانی ہیں ہندستانی ماحول کے عین مطابق ترمیم پاگئے ہیں چونکہ اس کو شاہی لشکر کے ساتھ سرحد کا کوہستانی علاقہ اور پنجاب کے جنگل طے کرنے تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں :

(۱) چو من بقوت اسلام و نصرت داور　　ز بهر خدمت بستم کمر به عزم سفر
(۲) مدیح بود مرا رهبر و سخن مونس　　امید بود مرا همسر و خرد یاور
(۳) بخواستم ز مجمّز جمازهٔ آورد　　یکے هیونے صحرا نورد کہ پیکر
(۴) سپهر گردن آ گنده ران و پهن قفا　　بلند قامت و بسیار موی و کوچک سر
(۵) بریده از دهنش خوشهاے مروارید　　دمیده از کتفش برگهاے سوسن بر
(۶) چو بادپای بکوهان او در آوردم　　ز جای برجست آن بادپاے کوه سپهر
(۷) بسان ناقهٔ صالح بیک شب اندر کوه　　هزار بار برون آمد از میان حجر
(۸) فلک بود متحیر ز شورش عالم　　زمین بود متحرک ز جنبش لشکر
(۹) ز خاک تیره کنی رزمگاه را بالین　　ز خون تازه کنی جنگجوی را بستر
(۱۰) دو آفرینش برنده بود خنجر تو　　نه تربیت ز فسون یافت یا ز آهنگر
(۱۱) نعوذ بالله اگر نام او برد یاجوج　　بریده گردد صد جاے سد اسکندر

ان اشعار میں پہلے دو شعر تمہیدی ہیں۔ تیسرے میں اونٹنی منگوائی گئی۔ دو شعروں میں اونٹنی کی تعریف۔ چھٹے شعر میں اس پر سوار ہونے کا ذکر۔ ساتویں میں ناقهٔ صالح سے مثال دی گئی۔ آٹھویں میں لشکر کی نقل و حرکت سے زمین پر

لرزے کا آنا، اور نویں دسویں میں ممدوح کی جنگ آزمائی کی تعریف بہ‌صیغۂ خطابیہ۔ گیارھواں شعر سب سے غیر متعلق۔

ان ابیات میں جو باھم بے‌ربط بھی ھیں، ھمیں تو نہ ھندستانی فضا نظر آئی نہ پنجاب کے جنگل نظر آئے۔ تیسرے شعر میں 'کہ' کی جگہ 'کہ' چاھیے۔ چوتھے شعر میں 'سپہر گردن' کے بجاے 'سطبر گردن' پانچویں میں 'بریدہ' کی جگہ 'پریدہ' اور سوسن بر کی جگہ سیسنبر بہتر معلوم ھوتے ھیں۔ چھٹے بیت میں 'کوہ سپہر' کوہ سپر' نویں میں 'رزم‌گاہ' رزم خواہ' اور دسویں میں 'فسون' 'فسان' ھیں۔ یہ قرأت قیاسی ھے۔

صفحہ ۱۹۰ — کہتے‌ھیں کہ محمودی دور میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاھور میں پہلا دربار منعقد ھوتا ھے۔ اس میں ایرانی شرفا اھل سیف و اھل قلم عہدہ‌داروں کے علاوہ اکثر فضلاے غزنہ و خراسان مع جماعت شعرا دارالحکومت ھند کے گرد و نواح میں ٹھیرنے،کے واسطے آئے۔ اھل ھند سبکتگین کے زمانے ھی سے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ھوچکے تھے۔ جب محمود کا فاتحانہ داخلہ ھندستان میں ھوا، فارسی علوم کو ماضی کے مقابلے میں بے‌مثال فروغ ملا۔ اس بنا پر وہ فارسی زبان اور فارسی طریق زندگی سے کامل طور پر واقف ھوگئے اور محمود کی وفات سے فوراً بعد لاھور فی‌الواقع غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دارالسلطنت بنادیا گیا، کیوں‌کہ سیاسیات کی ضرورت کی بنا پر سال کا اکثر حصہ محمود کو پنجاب میں مقیم رھنا پڑتا تھا۔

یہ تفصیلی اطلاع جو لاھور میں دربار کرنے اور اس کو بہ‌حیثیت دارالحکومت غزنیں پر ترجیح دینے اور محمود کا اکثر وقت وھاں گزارنے کے سلسلے میں پروفیسر نے دی ھے ھماری نظر سے کسی تاریخ میں نہیں گزری بلکہ محمودی سیاسیات کی رو سے ناقابل عمل بھی ھے۔ ھندستان سے زیادہ ایران و توران کے ساتھ اس کو دل‌چسپی تھی اس لیے غزنیں کا مستقل تخت‌گاہ رھنا نہایت ضروری تھا۔ سنہ ۴۱۲ھ میں محمود لاھور پر قبضہ کرکے تمام علاقے کو اپنے والی کے سپرد کردیتا ھے۔ فتح سومناتھ کے بعد جو سنہ ۴۱۶ھ میں ھوتی ھے ھندستانی معاملات میں اس کو بہت کم دل‌چسپی رہ‌گئی تھی۔ اس کے بعد لاھور تو شاید ھی آیا ھو۔ لاھور غزنویوں کا دارالسلطنت اسی وقت بنتا ھے جب قبائل غز ان کو نکال کر غزنیں پر قبضہ کرلیتے ھیں۔ یہ واقعہ غالباً سنہ ۵۵۶ھ میں ظہور پزیر ھوتا ھے نہ محمود کی وفات کے سال میں جو سنہ ۴۲۱ھ میں واقع ھوتی ھے۔ سبکتگین کے عہد سے اھل ھند کا فارسی

جذبات و افکار سے آشنائی پیدا کرلینا جس کے پروفیسر مدعی ہیں یقیناً بے بنیاد ہے۔

صفحہ ۱۹۱ — کہتے ہیں 'شعرائے مشہور ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے بزرگ محمود کے تصرف سے ایک دراز مدت پہلے سے پنجاب میں آکر آباد ہوگئے ہیں۔ اسی سبب سے ان کی ولادت اور پرورش لاہور میں ہوئی'۔

تاریخ، شمس العلما کے اس بیان کی تائید سے خاموش ہے۔ مسعود سعد سلمان کے متعلق تو کامل وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے والد خواجہ سعد سلمان سنہ ۴۲۷ھ میں بہ‌عہد مسعود شہید (سنہ ۳۲-۴۲۱ھ) بسلسلۂ ملازمت لاہور آکر آباد ہوتے ہیں۔ تفصیل بیہقی میں درج ہے۔ جب سنہ ۴۲۷ھ میں سلطان شہید نے شہزادے مجدود کو والئ ہند مقرر کیا، سعد سلمان کو شہزادۂ موصوف کا مستوفی مقرر کیا۔ بیہقی کی عبارت ہے:

"و وے را (شہزادۂ مجدود) سہ حاجب با سپاہ دادند و بومنصور پسر ابوالقاسم علی نوکی از دیوان ما باوے بہ دبیری رفت و سعد سلمان بہ مستوفی و حل و عقد سرہنگ محمد بستد (تاریخ بیہقی صفحہ ۶۲۲)

ابوالفرج رونی کے باپ کا نام مسعودی ہے اور تخلص غالباً مسعود ہے۔ جس کی حکومت ہند سے کچھ تنخواہ یا جاگیر مقرر تھی۔ ابوالفرج ایک قصیدے میں امیر سیف‌الدولہ محمود سے مسعودی کی اس تنخواہ پر اپنی بحالی کا مستدعی ہے:

کز وجوہی کہ داشت مسعودی	کند آن را ملک بدان تعیین

اس سے تو بہ‌ظاہر یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مسعودی غزنویوں کے دور میں ہندستان آکر آباد ہوا ہے۔ جیپالیوں کے زمانے میں مسلمانوں کا لاہور آکر آباد ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ابوریحان البیرونی ہندوؤں کی تنگ نظری، غیر اقوام سے ان کی بےالتفاتی اور عدم ربط ضبط کا بےحد شاکی ہے۔ وہ نہایت خودبیں اور مغرور ہیں، اپنے آپ کو دنیا کی تمام قوموں سے افضل و اعلی سمجھتے ہیں، ان کو اپنی برتری کا بڑا گھمنڈ ہے اور پردیسیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ایسی آبادی میں مسلمانوں کا جاکر آباد ہونا اور ان کے درمیان بودوباش اختیار کرنا خیال‌خام معلوم ہوتا ہے جس حالت میں کہ اس عہد کی سیاست نے مسلمانوں کو ان کا رقیب بنادیا تھا۔

صفحہ ۱۹۳ — شمس العلما تصور کررہے ہیں کہ لاہور میں غزنویوں کے دربار کے انعقاد سے (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) عوام ہند میں فارسی شعر کا ذوق اس قدر بڑھ گیا

تھا کہ خراسان اور دیگر مقامات کی ترقی کے ساتھ مساوات کا دم مارنے لگا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ بالآخر سلاطین غزنہ نے سنہ ۴۲۹ھ میں لاہور کو اپنا دارالسلطنت قرار دے دیا لہذا مقام تعجب نہیں اگر اس عہد میں ہندستان نے ایسے شاعر پیدا کیے ہوں جو عام قابلیت میں اپنے ایرانی معاصروں کے ہم‌پلہ تھے۔

اس بیان میں ہم تاریخ سے دور بھٹک گئے ہیں۔ کوئی سنجیدہ خیال انسان یقین نہیں کرسکتا کہ ایسے درباروں سے جو ہمارے نزدیک بالکل مغربی انداز کے ہیں جمہور میں شعر و شاعری کا چسکا پیدا ہوا ہو۔ دربار نہ ہوے مشاعرے ہوے، سنہ ۴۲۹ھ مسعود شہید کا زمانہ ہے۔ بہ‌قول لین پول سنہ ۵۵۶ھ و ۱۱۶۱ع میں لاہور غزنویوں کا دارالحکومت بنتا ہے وہ بھی اسی وقت جب قبائل غز غزنی کا تمام علاقہ ان سے چھین لیتے ہیں۔

اس موقع پر پروفیسر لاہور کے دو شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلا ابوعبداللہ Alankati دوسرا حمیدالدین مسعود Shal-i-kob ۔

میں صرف ان ناموں کو تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ ابوعبداللہ کو پروفیسر النکتی بفتح الف و لام و سکون نون و فتح کاف تازی و کسرۂ تاے فوقانی و سکون یا پڑھتے ہیں جو یقیناً غلط ہے۔ اس صورت میں یہ لفظ مہمل ہے النکتی میں الف لام بہ‌قاعدہ عربی آیا ہے۔ نکت نکتہ کی جمع ہے آخر میں یاے نسبتی ہے اس لیے ہم اس کو Annukati بولتے اور Alnukati لکھتے ہیں۔ ابوعبداللہ کا نام روزبہ ہے۔ حمیدالدین کے ساتھ بعد کا لفظ شالی کوب ہے اس لیے اسے انگریزی میں منتقل کرنے کے واسطے پہلے ہائی‌فن کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر شالی کوب کو سلطان شہاب‌الدین غوری کے عہد کا شاعر مانتے ہیں حالاں‌کہ محمد عوفی نے شعراے غزنہ میں اس کا شمار کیا ہے۔ یہ شہاب‌الدین اس کی شہزادگی کا نام ہے۔ بادشاہ بننے پر اس نے اپنا نام معزالدین محمد رکھا، چناں‌چہ یہی نام قدیم تاریخوں میں نیز اس کے مسکوکات پر ملتا ہے۔ اس بادشاہ کو شہاب الدین کہنا غیر موجہ ہے۔

صفحہ ۱۹۳ -- پروفیسر ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عوفی اس کو 'خانقاہ عمد' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے بانی ابونصر پارسی ہیں۔

'عمد' میرے خیال میں 'عمید' ہوگا کیوں‌کہ ابونصر 'عمید ملک' اور صاحب ہند (وزیر ہند) تھے اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر یہ خانقاہ ان کے عہد کی بنا پر خانقاہ عمید کہلاتی ہو۔

صفحہ ۱۹۵ -- اس صفحے پر شمس العلما پنجاب میں تعلیمی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں - جامعہ کے سرچشمۂ علوم بن جانے کے بعد چھٹی صدی کے خاتمے تک لاہور اور ملتان کی گلیوں اور بازاروں میں ابتدائی مکاتب کھل گئے - ہر مذہب و ملت کے پیرووں میں فارسی کا عام چرچا ہوگیا - حتی کہ ہندو شرفا بھی جو سلطنت کے عہدہ‌دار تھے نہ صرف فارسی سمجھ سکتے تھے بلکہ شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے حتی کہ دارالحکومت لاہور دو صدیوں تک فارسی زبان کا گہوارہ بنارہا -

یہ ایسا بیان ہے جس کی ہم تصدیق نہیں کرسکتے -

صفحہ ۱۹۶ کہتے ہیں 'جب شہاب‌الدین غوری نے سنہ ۵۸۲ھ میں آخری غزنوی بادشاہ خسرو بن بہرام‌شاہ سے لاہور چھین لیا -

غزنویوں کے آخری بادشاہ کا نام خسرو ملک ہے اور لقب 'تاج‌الدولہ' نیز 'سراج‌الدولہ' ہے اس کے باپ کا نام خسروشاہ ہے جو بہرام‌شاہ کا فرزند تھا -

صفحہ ۱۹۶ -- پروفیسر کا یہ قول کہ محمود کی آمد کے پیش‌تر زمانے سے ایران و دیگر علاقوں سے ہندستان آنے والے علما و فضلا و شعرا کا تانتا لگا رہتا تھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سرزمین میں ایسے فاضل پیدا ہوے جو اپنے ایرانی ہم‌مشربوں کے دوش بدوش تھے -

میرے نزدیک اس بیان میں واقعیت آٹے میں نمک برابر بھی نہیں - البتہ محمود کے بعد اس کا اطلاق درست مانا جاسکتا ہے -

صفحہ ۱۹۶ -- کہتے ہیں کہ 'ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان نے سلطان مسعود غزنوی اور اس کے فرزند ابراہیم کے زمانوں میں شہرت پائی' -

مسعود سنہ ۴۲۱ھ میں تخت‌نشین ہوکر سنہ ۴۳۲ھ میں قتل ہوتا ہے - سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱ھ سے سنہ ۴۹۲ھ تک سلطنت کرتا ہے یہ امر تصدیق طلب ہے کہ اس مسعود کے جلوس کے وقت یہ شاعر پیدا بھی ہوچکے تھے یا نہیں - پروفیسر سے جو غلطی سرزد ہوئی یہ ہے کہ وہ مسعود ثالث کو مسعود اول سمجھ بیٹھے - یہ بادشاہ علاءالدین مسعود (۴۹۲-۵۰۸ھ) ہے جو ابراہیم غزنوی کا فرزند اور ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کا ممدوح ہے -

مسعود سعد سلمان: پروفیسر اس نام کو ہمیشہ بغیر اضافت کے لکھتے ہیں حالاں‌کہ انگریزی میں اضافت لکھنے کا دستور ہے - یہ اضافت ابنی کہلاتی ہے - میرا مطلب ہے کہ مسعود کی دال اور سعد کی دال کے آخر میں کسرہ آنا چاہیے -

صفحہ ۲۰۱ – کہتے ہیں کہ مسعود (سعد سلمان) سلطان محمود کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور شہرت سلطان ابراہیم کے زمانے میں پائی۔

خواجہ مسعود کی ولادت محمود کے زمانے میں جو سنہ ۴۲۱ ھ میں وفات پاتا ہے ناقابل یقین ہے۔ چونکہ خواجہ لاہور میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے والد خواجہ سعد سلمان سنہ ۴۲۷ ھ میں جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں شہزادہ مجدود کے مستوفی مقرر ہوکر لاہور بھیجے جاتے ہیں اس لیے ان کی ولادت اس سال کے بعد تصور کرنی چاہیے۔

صفحہ ۲۰۲ « و ارباب خرد و انصاف دانند کہ حسّیات مسعود در علو بچہ درجہ است »

اس عبارت میں « حسّیات » جس کا ترجمہ پروفیسر نے « poetic touches» کیا ہے غلط ہے۔ اس کی جگہ حبسیات جس کے معنی prison poems ہیں، چاہیے۔ اس میں شک نہیں خواجہ مسعود اپنی حبسیات کے واسطے مشہور عالم ہیں۔

صفحہ ۲۰۲ – کہتے ہیں کہ سنائی مسعود کی شاعری کا بڑے جوش کے ساتھ مشتاق تھا۔ اس نے ایک علٰحدہ کتاب میں جس کا نام دیوان رکھا تھا اس کے اشعار کو جمع کیا تھا۔ یہ امر خود سنائی کے اپنے بیان سے جو قطعۂ ذیل میں آتا ہے واضح ہے:

چون بدیدد این رھی کہ گفتۂ تو … کافران را ھمی مسلمان کرد
کرد شعر جمیل تو زانسان … کہ صحابی ز نزل قرآن کرد
چون علو جہان بشعر تو دید … عقل او گرد طبع جولان کرد
شعر ھا را بجملہ در دیوان … چون فراھم نہاد دیوان کرد
تا چو دریای موجزن سخنت … در جہان در و گوھر ارزان کرد
گفت آری سنائی از سر جہل … لعل را با خزف بمیزان کرد
لیک معذور دار ازان کہ مرا … معجز شعرھات حیران کرد
پس چو شعرے بگفت و نیک آمد … داغ مسعود و سلمان کرد

شمس العلما اس قطعے کا پورا مطلب نہیں سمجھے۔ سنائی نے خواجہ مسعود کا کلیات مرتب کیا تھا۔ غلطی سے اس میں دوسرے شعرا کا کلام بھی شامل کرلیا۔ خواجہ مسعود نے (یا بقول میرزا محمد بن عبدالوھاب قزوینی ثقۃ الملک طاھر بن علی نے) سنائی کو اس غلطی سے آگاہ کیا اس پر سنائی نے خواجہ کی خدمت میں معذرتاً یہ

قطعہ بھیجا جو اوپر درج ہے۔ پروفیسر نے اس قطعے کا ترجمہ بھی دیا ہے جس میں بعض امور نظری ہیں:

دوسرے شعر میں 'نزل قرآن کرد' کا ترجمہ کیا ہے 'did with the Quran' اور 'نزل' کا ترجمہ چھوڑدیا ہے۔

ع عقل او گرد طبع جولان کرد' کا ترجمہ حسب ذیل غیر مناسب معلوم ہوتا ہے: His wisdom swiftly went round his disposition (desire); ہمارے خیال میں شاعر کا مقصد ہے کہ 'اس کی عقل نے اس کی اشاعت کا اقدام کرنا چاہا۔

گفت آرے سنائی از سر جہل	لعل را با خزف بمیزان کرد

کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:— Sana'i said 'aye in ignorance, He put the ruby along with a shell in one balance'';

'گفت' کا فاعل سنائی نہیں ہے بلکہ خود خواجہ مسعود یا ثقۃ الملک ہے۔ یعنی اس نے کہا کہ سنائی نے اپنی جہالت سے لعل کو ٹھیکری کے ساتھ ایک ہی پلڑے میں رکھ دیا ہے۔

صفحہ ۲۰۴ -- ادیب صابر:

گر این طرز سخن در شاعری مسعود را بودے
بجان صد آفرین کردے روان سعد سلمانش

ہمارے نزدیک یہ شعر ایک شاعرانہ تعلی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ادیب صابر خواجہ مسعود کا معتقد اور مداح تھا جیسا کہ پروفیسر صفحہ ۲۰۵ پر ظاہر کررہے ہیں اصل مقصد ذاتی تعریف ہے۔ اس شعر کے واسطے ڈاکٹر ہادی‌حسن کے مقالے 'فلکی شروانی' کا حوالہ دیا ہے جو ہمیں انوکھا معلوم ہوتا ہے کیوں‌کہ اس کا قدیم اور زیادہ مشہور ماخذ لباب‌الالباب محمد عوفی ہے جہاں پورا قصیدہ ادیب صابر کے کلام کے ذیل میں درج ہے:

صفحہ ۲۰۷

اشعار ترا در جہان گر فتن	باشد اثر خاتم سلیمان

اس شعر کا ترجمہ کیا ہے:— To be in possession of thy verses in this word Is just as good in effect as to possess the seal of salomon جو ہمارے نزدیک درست نہیں۔ شاعر کا مطلب ہے کہ تیرے اشعار دنیا کی تسخیر میں وہی اثر رکھتے ہیں جو اثر حضرت سلیمان کی انگوٹھی میں تھا۔

صفحه ۲۰۸ — مسعود کا ایک قصیده جس کا مطلع هے :

اے عزم سفر کرده و بسته کمر فتح بکشاد چپ و راست فلک بر تو در فتح

سلطان ابراهیم کی مدح میں بتایا هے حالاں‌که مطلع کے بعد کے شعر سے جسے پروفیسر نے نقل بهی کیا هے صاف معلوم هوتا هے که یه قصیده سلطان علاءالدین مسعود کی تعریف میں هے۔ چناں‌چه شعر :

مسعود جهانگیر که از دهر سعادت هر لحظه بسوے تو فرستد نفر فتح

پہلے مصرع میں ' دهر ' کی جگه ' دیر ' اور دوسرے مصرع میں ' نفر ' کی جگه ' خبر ' چاهیے۔ سیاق عبارت کا یهی تقاضا هے۔

صفحه ۲۰۹ — مسعود کی مدح گاری کے تعلق میں کہتے هیں ' یه یاد رکهنا چاهیے که اس نے اس میدان میں رواج مقرره سے ایک اهم تجاوز کیا هے جو اس کے عهد تک اقسام نظم میں صرف قصیدے تک محدود تها۔ اس سے پیش‌تر بهت کم شاعروں نے قصیدے کے سوا کوئی‌اور صنف مدح‌نگاری کے ذریعے کے طور پر اختیار کی هے لیکن مسعود اس غرض سے نظم کی هر قسم استعمال میں لایا هے چناں‌چه قصیدے کا کام اس نے مسدس، غزل اور قطعے سے لیا هے۔ مسدس کی مثال :

بهرام‌شاه خسرو گیتی کشاے گشت خورشید دهر و سایهٔ فرِ خداے گشت

چترش که شد همایون فرهماے گشت او را خداے عزوجل رهنماے گشت

آن خنجر زدودش دولت فزاے گشت روے عدوی او شده چون چتر او سیاه

اصولاً نظم کی یه قسم جسے پروفیسر مسدس کہتے هیں مسمط کهلاتی هے جس میں پانچ مصرعے متحدالقافیه اور آخری مصرع دوسرے بندوں کے چهٹے مصرع کے ساته هم‌قافیه هوتا هے۔ مسعود کا یه مسدس بهی مسمط هے۔ مسمط کا بانی منوچهری دامغانی هے جس نے معشر تک کے مسمط لکهے هیں۔ قطران تبریزی منوچهری کا مقلد هے اور مسعود ان دونوں کے بعد آتا هے۔ بهر حال ایجاد کی عزت منوچهری کی طرف منسوب هونی چاهیے۔

صفحه ۲۱۴ — اس صفحے سے شمس‌العلما پهر محمود کی طرف رجوع کرتے هیں اور سب سے پہلے اس کے سترہ حملوں کی فهرست جو هندستان میں اس نے کیے هیں قدیم و جدید کتب تاریخ سے لے کر دیتے هیں ۔ مگر همارے نزدیک کسی موضوع کو اس طرح پاره پاره کرکے متفرق طور پر بیان کرنا کتاب کو بےترتیب بنانے کے علاوه قاری کی زحمت کا موجب بهی هے۔

اس کے بعد محمود کی فہرست خطابات بہ فحوائے قند مکرر خفی و جلی ٹائپ میں دی ہے - اس فہرست میں دس خطاب ہیں جن کے واسطے کہا ہے کہ ہمسایہ ریاستوں نے محمود کو دیے تھے لیکن سامانیوں اور خلیفہ کے سوائے دوسرں سے محمود خطاب کیوں قبول کرنے لگا - نہ ان خطابات کا ذکر معتبر کتب تاریخ میں میری نظر سے گزرا - مثلاً (۱) عضدالدولہ (۲) مؤیدالملہ (۳) شہاب الدولۃ والدین (۴) جمال الاسلام والمسلمین (۶) امیرالمسلمین (۷) جمال الملہ -

لیکن موجب تعجب یہ امر ہے کہ اس کے نہایت مشہور خطاب جو اس کے سکّوں پر بھی بہ کثرت ملتے ہیں اس فہرست میں شامل نہیں - مثلاً 'سیف الدولہ' جو سامانیوں نے دیا تھا جب وہ سپہ سالار خراسان تھا - اس کے ابتدائی سکّوں پر ملتا ہے - اسی طرح خلیفۂ بغداد نے تاجپوشی کے وقت اس کو 'یمین الدولہ وامین الملہ' خطاب عطا کیا تھا یہ خطاب بالعموم محمود کے مسکوکات پر ملتا ہے - اس کے آخر زمانے کے سکّوں پر « نظام الدین » یا 'یمین الدولہ نظام الدین' خطابات ملتے ہیں - پروفیسر ان صحیح خطابات سے اعراض کرکے غیر معتبر خطابوں کی فہرست ہمارے سامنے پیش کررہے ہیں -

صفحہ ۲۲۰ - پروفیسر کا یہ بیان کہ 'جب سومنات کے بت کو توڑا اس کے جوف میں سے بیش بہا اور قیمتی جواہرات نکلے' - اگرچہ بعض موخّر تاریخوں میں مذکور ہے مگر مستند نہیں، نہ قدیم اور معتبر تاریخوں میں اسؔ کا تذکرہ ملتا - ہندوؤں کی پوجا کی اشیا (بت) مجوف اور جوڑدار نہیں ہوتیں - بہر حال جواہرات کا بت کے پیٹ میں سے برآمد ہونا بالکل غلط ہے - صحیح وہی ہے جو گردیزی نے لکھا ہے کہ

«گنج بود اندر زیر بتان آن گنج را برداشت و مالے عظیم ازانجا بحاصل کرد (صفحہ ۸۷ زین الاخبار، طبع ناظم) بتوں کو ہٹاتے وقت ان کے نیچے سے خزانہ برآمد ہوا یعنی جس مقام پر بت نصب تھے وہاں سے نکلا -

فرخی جو سفر سومناتھ میں محمود کے شریک اور شاہد عینی ہے تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے :

خدائے حکم چنان کردہبود کان بت را ز جائے برکند آن شہریار دین پرور
بدان نیت کہ سر او را بمکہ باز برد بکند و اینک با ما ہمی‌برد ہمبر
چو بت بکند از انجا و مال و زر برداشت بدست خویش بہ بتخانہ درفکند آذر

صفحہ ۲۲۸ — انوری کے ایک قطعے کا شعر ہے :

باد معلومش کہ من بندہ بشعر بوالفرج   تا بدیدستم ولوعے داشتستم بس تمام

شعر کے پہلے مصرع کا ترجمہ قابل غور ہے : He may know that I am a slave of his pœtry, since I saw it I became all the more avid of it.
پروفیسر سمجھ رہے ہیں کہ انوری ابوالفرج کو بصیغۂ غائب خطاب کررہا ہے حالاں کہ شاعر کا مخاطب اس کا کوئی دوست ہے۔ انوری کی شاعری کا دور سنہ ۵۳ ھ کے قریب شروع ہوتا ہے۔ ابوالفرج اس صدی کے آغاز سے پہلے وفات پاچکا ہے۔ مرآت عالم میں اس کا سال وفات سنہ ۴۸۲ ھ ہے، صحف ابراہیمی میں سنہ ۴۸۹ ھ اور نشتر عشق میں سنہ ۴۹۰ ھ ہے۔ ابوالفرج کے قصائد کی شہادت کی رو سے یہ سال سنہ ۴۹۷ ھ کے بعد ہوگا۔ بہر حال ان میں خط و کتابت کا واسطہ ہمارے نزدیک دشوار ہے۔

اسی قطعے کے ایک اور شعر کا ترجمہ بھی شاعر کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا :

عزم دارم کان بروزے چند بنویسم کہ نیست
شعر او مرغے کہ آسان اندرون افتد بدام

پروفیسر کہتے ہیں :— He further declares his resolve to imitate Abul Faraj's pœtry, and compares it with a bird which it is not easy to ensnare. انوری کہنا چاہتا ہے کہ میرا ارادہ ہے کہ چند یوم لگاکر میں اس (ابوالفرج) کے دیوان کی نقل کرلوں۔

یہ قطعہ جس سے اوپر کے دونوں شعر نقل ہوے ہیں انوری نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور کہتا ہے آپ کو معلوم رہے کہ میں ابوالفرج کے اشعار کا بےحد مشتاق ہوں اس کا جستہ جستہ کلام میں نے مختلف لوگوں سے لےکر جمع کیا ہے۔ اس سے میری سیری نہیں ہوتی۔ کل یہ تذکرہ میں نے کریم‌الدین صاحب سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابوالفرج کے انتخاب کا ایک مخطوطہ میرے پاس موجود ہے۔ تب سے مین نے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ اس کی ایک نقل لے لوں کیوں کہ اس شاعر کا کلام آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایک شعر بھی نقل نہیں کرسکا۔ آپ سے امید ہے کہ میری دست‌گیری کریں گے۔ آپ کے پاس اچھا برا جیسا کاغذ ہو اس کا ایک دستہ خواہ عنایتاً خواہ مستعار بھیج دیں۔ اصل قطعہ بھی جس سے غیر ضروری اشعار حذف کردیے گئے ہیں ذیل میں نقل ہے :

زندگانی مجلس سامی در اقبال توام   چون ابد بی انتہا باد وچو دولت بر مدام
باد معلومش کہ من خادم بشعر بوالفرج   تا بدیدستم ولوعی داشتستم بس تمام

شعر چند الحق بدست آوردہام فیہامضیٰ
چون بدان قانع نبودستم طلب میکردہام
دی همین معنی مگر بردست من خادم برفت
گفت من دارم بلی از انتخاب شعر او
عزم آن دارم که روزی چند بنویسم که نیست
لیکن از بی کاغذی بیتے نکردستم سواد
حالی او درخانه دارد نیک و بد یک دستهٔ

قطعهٔ از زید و عمر و نکتهٔ از خاص و عام
در سفرگاه مسیر و در حضرگاه قیام
با کریم الدین که هست اندر کرم فخرالکرام
نسخهٔ بس بےنظیر و شیوهٔ بس با نظام
شعر او مرغی که آسان اندرون افتد بدام
هست امیدم که این خدمت چو بگزارد پیام
نزد من خادم فرستد یا بمنت یا بوام

(صفحه ۲۵۱ ، کلیات انوری، سنه ۱۸۹۷، نول کشور)

صفحه ۲۳۸ — کہتے ہیں ’ایک اور موقع پر انوری ابوالفرج کو فرخی کے ساتھ جو محمود کے دربار کا ایک درخشان گوہر تھا تشبیه دے رہا ہے :

در عذوبت نظم اقبالت چو نظم فرخی

اور ترجمه : ’تیری اقبال‌مند نظم شیرینی میں فرخی کی نظم کی طرح ہے‘۔

شمس العلما نے یه مصرع صحیح نقل نہیں کیا ۔ انوری کے کلیات میں (صفحه ۷۵۳، نول کشور، سنه ۱۸۹۷ ع) ایک قطعه آتا ہے جس کی ابتدا ہے :

دی ز من پرسید معروفی ز معروفان بلخ   از شما پوشیده چون دارم عزیز شاد خی

یه قطعه غالباً والئ هرات کے واسطے لکھا گیا ہے جس کو ’خسرو صاحب قران‘ کہا ہے :

زانکه اندر خدمت این خسرو صاحبقران   مدحتی گوئی که حکمش طاعت است از فرخی

آخری دو شعر خطابیه و دعائیه ہیں اور حسب ذیل ہیں :

شادمان زی ای قدر قدرت خداوندے که هست   جاے مقلوبی فلک را گر کنون با او چخی
از متانت حکم و اقبالت چو شعر بوالفرج   وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

پچھلے شعر میں والی کو دعائیه کہا ہے که تیرا حکم اور اقبال متانت میں ابوالفرج کے شعر کی مثال ہو اور تیرا عیش شیرینی میں فرخی کے کلام کی طرح ہو۔ گویا ممدوح کے حکم اور اقبال کو به لحاظ متانت ابوالفرج کے کلام کے ساتھ اور اس کی شیرینئ عیش کو فرخی کی نظموں کے ساتھ مثال دی ہے ۔ تنہا مصرع کو لےکر جس کی صحیح قراءت بھی ان کے پاس نہیں ہے، پروفیسر نے ایک غلط نظریه قائم کیا ہے که انوری

ابوالفرج کو خطاب کررہا ہے اور اس کی اقبال‌مند نظم کو شیرینی میں فرخی کی نظم کے ساتھ تشبیہ دے رہا ہے۔

صفحہ ۲۳۹ — کہتے ہیں ' عرفی جو اپنے آپ کو زمانے کا سب سے بڑا شاعر شمار کرتا ہے خان‌خانان کے ایک مدحیہ قصیدے میں ابوالفرج اور انوری کے تعلق میں اپنی احسان‌مندی کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ محربہ ان کو اس زمین میں اپنا رہبر اور خود کو ان کے وزن اور طرز کا مقلد کہتا ہے۔ وہ معنی خیز اشعار یہ ہیں:

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را
بسم‌اللہ ز اعجاز نفس جان دہ شان باز تا من قلم اندازم و گیرند قلم را
اول رہ این نظم خود ایشان بسپردند پس باز نمودیم بہم منزل ہم را

فی‌الحقیقت یہ بڑا خراج عقیدت ہے جو عرفی نے ابوالفرج کی یاد میں ادا کیا ہے۔

ان اشعار میں ہمیں تو عرفی کی ممنونیت یا احسان‌مندی کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ وہ جوش خودستائی میں اپنے ممدوح پر ان شعرا کے خلاف اپنی فضیلت اور برتری کا سکہ جمانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کہتا ہے ابوالفرج اور انوری اس زمانے میں ملک عدم میں اپنا بسنا کیوں نہ غنیمت خیال کریں ورنہ میرے ہاتھ سے انھیں کیسی کیسی زکیں اٹھانی پڑتیں۔ اگر اب بھی انھیں کوئی دعویٰ ہو تو خدا کا نام لےکر آپ اپنی مسیح نفسی سے ان کو حیات تازہ دیں تاکہ میں قلم ہاتھ سے رکھ دوں اور وہ قلم سنبھالیں اور اپنے دل کا ارمان نکالیں۔ جہاں تک اس زمین کا تعلق ہے مجھ سے پہلے انھوں نے اس کا راستہ طے کیا ہے۔ میں نے تو بعد میں ان کی ہمراہی کی ہے۔ ہاں تو یہ شعر اس کی عقیدت‌مندی کے افسانہ خواں نہیں ہیں بلکہ اس کے تفاخر و پندار کے آئینہ دار ہیں۔ عرفی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس بحر و قافیہ میں ابوالفرج نے سب سے پہلے قصیدہ لکھا انوری نے اس کا جواب دیا اور خود عرفی دونوں کے بعد آتا ہے۔

صفحہ ۲۴۵ — صائب کے شعر ذیل کے ترجمے میں ایک محاورہ ' آمدن حنا بہند ' کی تشریح ضروری ہے:—

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال تا نیامد سوے ہندستان حنا رنگین نہ شد

There is not in the Persian land the requisite material for perfection in the pœtic art.

Until hena (myrtle) came to India it acquired no colour.

' آمدن حنا بہند ' یا ' بہند رفتن حنا ' ایک محاورہ ہے۔ ہند کے معنے ' سیاہ ' ہیں اس

منا پر «هند حنا» سے مراد سیاهی حنا هے اور «بهند رفتن حنا» سیاهی زدن حنا هے۔ رضی دانش :—

راه دور هند پابست وطن دارد مرا
چون حنا شب درمیان رفتن بهندستان خوش است

بہار نے «آمدن حنا بهند» کی مثال میں صائب کا یہی شعر نقل کیا هے۔

صائب نے اس محاورے کے استعمال میں صنعت ایہام کی رعایت ملحوظ رکھی هے۔

شمس العلما کے کم زور استدلال کی مثال میں ان کا ایک بیان مختصر کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا هے۔ وہ پنجاب میں غزنوی عہد کے دو شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے کلام کے نمونے دے کر یہ بحث چھیڑتے هیں کہ هندستان کی شاعری ایرانیوں کی شاعری کے بالکل مساوی هے۔ اس حد تک هم ان کے ساتھ متفق هیں۔ غزنی اس عہد میں فارسی شاعری کا گہوارہ تھا۔ پنجاب سلطنت غزنہ کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ بہ سلسلۂ ملازمت متعدد خاندان پنجاب میں آکر آباد هوگئے تھے۔ ان آبادکاروں نے اپنی زبان و تہذیب اور دیگر روایات کو محفوظ رکھا۔ اس لیے ان کی شاعری کا وهی درجہ هونا چاهیے جو غزنویوں کی شاعری کا تھا اور اس میں کسی فخر اور تعجب کی بات نہیں وہ فارسی کے اهل زبان تھے اپنے تمدن پر قائم رهے۔ لهذا دوسرے علاقے میں آباد هوجانے سے کم از کم ایک دو سال تک ان کی قومیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ یہ ایک صاف اور کھلا معاملہ هے۔ لیکن پروفیسر اس نقطۂ نظر سے اعراض کر کے ایران و هندستان کی اس هم رنگی کی ایک غیر تاریخی وجہ پوری سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے هیں۔ کہتے هیں :

صفحہ ۲۴۷ — «قرون متوسطہ میں ایران و هندستان کی اس سطح مساوات پر آنے کی خاص وجہ یہ هے کہ عہد قبل از اسلام میں لاکھوں خاندان ایران سے ترک سکونت کر کے هندستان آکر پنجاب میں بس گئے تھے۔ اس طرح محمودی حملوں سے ایک دراز مدت قبل هند و ایران میں ایک تمدنی رابطہ اور لسانی یگانگت قائم هوگئی تھی جس کے نتیجے میں پنجاب نے فارسی زبان اور فارسی شعر کا ذوق اپنے میں رچا لیا۔ اس کے ثبوت میں «تذکرۂ سلاطین آل غزنہ» کی یہ عبارت نقل کی هے :

«و در اطراف لوهور آبادانی است قدیم کہ مردمانش همہ از اهل خراسان اند و فاضل علامہ شهاب الدین ابوعبداللہ یاقوت الرومی در معجم اشارت بآن کردہ کہ آنان در عهد افراسیاب گریختہ در هند اقامت گزیدند»۔

ابراھیم غزنوی (۴۵۱-۴۹۲ھ) نے اپنے زمانے میں ایک لاکھ ایرانیوں کو پنجاب کے اس دارالحکومت سے خانہ کوچ غزنین میں بلوا لیا تاکہ اس کی آبادی اور رونق میں افزایش ھو۔ ھندستان میں ایرانیوں کے اس ازدحام کی مدنی سودمندی اور وہ نفع جو ایرانی تمدن کے ساتھ مستقل اور پایدار ارتباط پیدا کرنے سے اس کو اپنے تعلیمی اور لسانی اداروں میں حاصل ھوا بےحد ھے۔ ان اثرات میں یہاں کے لوگوں کے ادبی مذاق میں اس قدر انقلاب پیدا ھوا کہ پنجاب میں پیہم ایسے شاعر پیدا ھونے لگے جنھوں نے خود اھل ایران سے خراج تحسین وصول کیا اور جو ھر لحاظ سے ایران کے بہترین اساتذہ کے ھمسر تھے'۔

پروفیسر اس بحث سے خواب و خیال کی دنیا میں ھمیں لےجا رھے ھیں جس میں دلیل و حجت کو پس پشت ڈالکر ھر ناممکن دعوے کو ممکن بنادیا جاتا ھے۔ وہ سمجھ رھے ھیں کہ شعر و شاعری افراسیاب کے زمانے سے جس کا ذکر آگے آتا ھے ایرانیوں کی قومی خصوصیت رھی ھے اور جس ملک میں وہ پنھچے ھیں اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ھے۔ چناںچہ جب پنجاب میں آباد ھوے اپنی قومی خصائص اپنے ساتھ لائے اور یہاں ایسی سازگار فضا پیدا کردی کہ شعر و شاعری کی استعداد اھل پنجاب کی طبیعت کا جوھر خاص بن گئی چناں چہ غزنوی دور میں جب شعر و سخن کی آبیاری ھونے لگی اس کے ثمر نورس ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان ھوے۔

ھمارے بزرگ اپنی خوش اعتقادی سے ایسے قصوں میں یقین کرلیا کرتے تھے لیکن آج کل کی دنیا زیادہ چھان‌بین اور تجسس کرنے والی ھے۔ جب تک کوئی بات تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ نہیں لی جاتی نہیں مانی جاتی۔ کہا جاتا ھے کہ یہ ایرانی مہاجر افراسیاب کے عہد میں آئے بہت اچھا مان لیا کہ افراسیاب ھی کے عہد میں آئے لیکن ھمیں افراسیاب کا زمانہ معلوم ھونا چاھیے۔ شاہ‌نامے کی ورق‌گردانی سے پتا چلتا ھے کہ افراسیاب توران کا بادشاہ تھا اور کیانی سلاطین یعنی کیقباد، کیکاؤس اور کیخسرو کے عہد میں گزرا ھے۔ کیکاؤس کا فرزند سیاوش افراسیاب کا داماد تھا۔ اس شہزادے کے قتل کیے جانے پر ایرانیوں نے تورانیوں کے خلاف انتقامی جنگ شروع کردی جو برسوں تک جاری رھی اور افراسیاب کے قتل پر ختم ھوئی۔

شاہ‌نامے میں چار سلسلۂ سلاطین کا ذکر آتا ھے۔ یعنی پیشدادی، کیانی، اشکانی اور ساسانی۔ ان میں پہلے دو پیشدادی اور کیانی بالکل غیرتاریخی ھیں۔ اس لیے

افراسیاب کا زمانہ اساطیری یا داستانی زمانہ ہوا۔ یہ مان کر کہ یہ زمانہ تاریخ سے قبل کا زمانہ ہے سوال کیا جاسکتا ہے۔کیا یہ ایرانی ہزاروں سال تک ہندستان میں رہنے بسنے کے باوجود اپنی قدیم تہذیب اور تمدن پر قائم رہے اور ہندی اقوام سے کسی قسم کا تعلق یا سنگھٹن نہیں رکھا یہ امر ہم کہتے ہیں بہت دشوار ہے۔ ہندستان کی کروڑوں انسانوں کی آبادی میں یہ ایرانی مہاجر آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے۔ جس طرح جزو کل میں جذب ہوجاتا ہے اسی طرح چھوٹی قومیں بڑی قوموں میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ لہذا اس ایرانی جماعت کا ہندستان کی قدیم آبادی میں گھل مل جانا لابدی ہے اگر کسی بنا پر بچ رہی زبان کا سوال پھر بھی قابل غور ہے۔ یہ لوگ کوئی ایسی زبان بولتے ہوں گے جو قدیم فارسی یا اوستا کی زبان سے ملتی جلتی ہوگی اور ہماری فارسی سے اسی قدر مختلف ہوگی جس قدر اوستا کی زبان اس سے مختلف ہے۔ اس صورت میں یہ لوگ ادبی مذاق کی شمع کیا روشن کرتے اور شعر و شاعری کی فضا کیا تیار کرتے جس کے پروفیسر بڑے جوش کے ساتھ مدعی ہیں۔

ہم صوبۂ گجرات کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں پارسیوں کی ایک جماعت عربوں کی فتح ایران کے بعد اس ملک سے ہجرت کرکے کھمبایت اور سورت وغیرہ میں آباد ہوگئی۔ ان کی آمد تاریخی زمانے میں ہوئی ہے۔ پارسی اپنی قومیت محفوظ رکھنے میں البتہ کامیاب ہیں تاہم ایرانیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ ترہندستانی ہیں حتیٰ کہ ان کی زبان بھی ہندستانی ہے۔ اور امور سے قطع نظر ہم پوچھتے ہیں کہ انھوں نے گجرات میں فارسی اور اس کی شاعری کے واسطے کیا موافق ہوا پیدا کی اور ان کے اثر میں گجرات نے کتنے نامی شاعر پیدا کیے جن کا نام ابوالفرج اور خواجہ مسعود کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔

اہل ہند میں فارسی زبان کے واسطے طبعی مناسبت کے اور اسباب ہیں۔ ایران اور ہندستان کی اقوام آریائی ہیں جو ابتدا میں ایک ہی نسل تھیں۔ ایرانی زبانیں قدیم فارسی اور اوستائی وغیرہ سنسکرت سے بہت قریب ہیں اور اس قدر قریب ہیں کہ اس کے آثار فارسی میں اب بھی موجود ہیں۔ سیکڑوں الفاظ ہیں جو فارسی اور سنسکرت میں مشترک ہیں جن کو اہل لغت ' توافق لسانین ' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندستانیوں میں فارسی کی مہارت کے واسطے یہ قدرتی صلاحیت ان کے تمدن اور زبانوں کے قدیم اتحاد کی وجہ سے ہے جس کا پرتو ان کے ذہنی اور عقلی قویٰ پر بھی کار فرما ہے۔ ہمارے نزدیک یہ توجیہ شمس العلما کے مذکورۂ بالا استدلال کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور قرین صحت ہے۔

صفحہ ۲۴۸ — کہتے ہیں 'کئی تصانیف ابوالفرج کی یادگار ہیں ۔ لیکن جو آج باقی ہیں ان میں ایک رسالہ عروض پر ہے اور ایک ضخیم دیوان ہے جو اس نے اپنے مربی سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا ۔ یہ انتساب اس شعر سے شروع ہوتا ہے :

سپہر دولت و دین آفتاب ہفت اقلیم ابوالمظفر شاہ مظفر ابراہیم

ان بیانوں میں سے میرا دل شمس العلما کے کسی بیان پر بھی مہر تصدیق لگانا نہیں چاہتا ۔ عروض کے ساتھ میری قدیم دل بستگی اور اس فن پر ایک بڑا ذخیرۂ کتب و رسائل جمع کرنے کے باوجود (اور اتنا ذخیرہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں) میں شرم کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ابوالفرج کی عروضی تصنیف کا نام نہیں سنا ۔ افسوس ہے پروفیسر نے اس بیان کا کوئی حوالہ نہیں دیا جو ہمارے نزدیک غیرموثق ہے ۔

ابوالفرج کے دیوان کو ضخیم کہنا تصدیق طلب ہے اس کا ضخیم دیوان اگر کبھی تھا فی زمانہ مفقود ہے ابوالفرج سے پچاس ساٹھ سال بعد جب انوری کو اس کے دیوان کی تلاش ہوئی تو اس کو بھی اس کے دیوان کا ایک انتخاب کریم الدین سے دست یاب ہوا تھا ۔

گفت من دارم بلے از انتخاب شعر او نسخۂ بس بے نظیر و شیوۂ بس با نظام

چناں چہ یہی انتخاب آج بھی رائج ہے ۔ اس کا حجم اتنا ہی ہوگا جتنا دیوان غالب اردو کا ہے ۔

شعر انتسابی جو اوپر مذکور ہے موجودہ دیوان کے ابتدائی قصیدے کا مطلع ہے ۔ یہ قصیدہ ابوالفرج نے سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا ہے ۔ اس کو انتسابی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ہے ۔

صفحہ ۲۴۹ کہتے ہیں کہ 'ابراہیم کی وفات سے بیس سال بعد معزالدین بہرام شاہ نے سلطان سنجر سلجوقی کی امداد سے سنہ ۵۱۱ھ میں تخت سلطنت اپنے عم زاد ملک ارسلان سے چھین لیا'۔

لین پول نے بہرام کی تاج پوشی کی تاریخ سنہ ۵۱۲ھ دی ہے ۔ (ملک) ارسلان بہرام کا عم زاد نہیں بلکہ بھائی ہے ۔ علاءالدین مسعود (۴۹۲—۵۰۹ھ) کے تین فرزندوں کا ذکر آتا ہے پہلا شیر زاد ، دوسرا ملک ارسلان (۵۰۹—۵۱۲ھ) ۔

تیسرا بہرام جو ارسلان سے ملک لے کر سنہ ۵۱۲ ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کرتا ہے۔ یہ روایت کہ بہرام اور ارسلان چچا زاد تھے غلط معلوم ہوتی ہے۔

صفحہ ۲۵۳ -- سید حسن غزنوی کے متعلق کہا ہے کہ جب بہرام شاہ پر ان کی ہر دل‌عزیزی اور قبول عام ناگوار گزری، سید حسن مکے چلے گئے اور بارگاہ رسالت میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھ کر روانہ کیا۔ اس قصیدے کے تین شعر نقل کیے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ بہرام (۵۱۲--۵۴۷ ھ) کے عہد میں سلطان ابراہیم کدھر آن گھسا۔ اس کا زمانہ سنہ ۴۵۱ و سنہ ۴۹۲ ھ ہے۔ قصیدے میں ممدوح کا نام بہرام موجود ہے اس سے ظاہر ہے کہ پروفیسر کی عبارت م.ن بہرام کی جگہ ابراہیم کا نام غلطی سے نقل ہوگیا۔

صفحہ ۲۶۲ -- سنائی کی بعض تالیفات Siyarul Ibad سیر العباد، رموزالاصفیہ، طریقت نامہ و بہرام نامے کے نام گنا کر کہا ہے کہ ان کے نام قدیم کتابوں میں ملتے ہیں اور ان کی تالیف سنائی کی طرف منسوب ہے لیکن اب ان کی سراغ رسی نہیں ہوسکتی۔

سنائی کی اکثر تالیفات مثنویاں ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ میرے مجموعۂ کتب میں جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے سنائی کی ذیل کی تالیفات ایک ہی جلد میں منسلک ہیں۔

(۱) حدیقہ۔ (۲) سیرالعباد (صحیح بہ تحریک سین و سکون یا و را)۔ یہ مثنوی ایران میں چھپ بھی گئی ہے۔ (۳) طریق التحقیق۔ (۴) بہرام و بہروز۔

صفحہ ۲۶۰ -- شعر

ہفتہ‌ها باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے‌را حلہ گرد و یا حمارے را رسن

اس شعر میں 'ہفتہ‌ها' کا درست املا 'ہفتها' اور 'ز آب و گل' کا 'زاب و گل' ہے۔ دوسرے مصرع میں 'حمارے را رسن' کے بجاے صحیح قراءت 'شہیدے را کفن' ہے۔

صفحہ ۲۶۱ -- سنائی کے 'ہندی اشعار' کے نمونے میں یہ شعر دیے ہیں:

لنگھنت گر ترا کند فربہ	سیر خوردن تر ز لنگھن بہ
(دیگر) نہ دران معدہ خدرۂ میدہ	نہ دران دیدہ قطرۂ پانی

ان شعروں میں صرف دو لفظ انگھن اور پانی ہندی ہیں لیکن نظرفریب بنانے کے واسطے 'ہندی اشعار' عنوان رکھا ہے جو گم راہ کن ہے۔

صفحہ ۲۶۳ — کہتے ہیں 'ہندستان کا پہلا غوری بادشاہ معزالدین محمد بن سام الملقب بہ شہاب الدین ہے۔

اس سلطان کا نام محمد ہے، معزالدین لقب ہے جو تخت نشینی کے وقت اس نے اختیار کیا۔ قدیم اور معتبر تاریخوں میں نیز اس کے کتبوں اور سکوں پر 'معزالدین محمد پورا نام ملتا ہے۔ پروفیسر اس کو جداگانہ لقب شہاب الدین عنایت کرتے ہیں۔ جو درست نہیں۔ شہاب الدین شہزادگی کے ایام میں اس کا نام تھا جو جلوس کے وقت ترک کر دیا گیا۔

صفحہ ۲۶۳ — معزالدین کے عہد کے ایک شاعر اور اہل قلم کا نام شہاب الدین عرف محمد رشید، دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ نام شہاب الدین محمد (بن) رشید ہونا چاہیے۔ کیوں کہ محمد کی ترکیب سے ناموں کا رواج ان ایام میں نہ تھا مثلاً محمد اکبر۔ محمد ہمایوں۔ محمد جہان گیر وغیرہ کی ترکیب بابر کے عہد سے رائج ہوتی ہے۔

اس شاعر کو مسعود سعد سلمان کا شاگرد بتایا ہے لیکن مسعود کے شاگرد اور اور معزالدین کے مداح کی عمر سو سال کی یا اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔

صفحہ ۲۶۴ — پر 'تاریخ آل غزنیں سے جو اقتباس دیا ہے اس کے الفاظ ہیں: «و بیک واسطہ شاگرد مسعود سعد سلمان بودہ»۔ جس سے ظاہر ہے کہ شہاب الدین خواجہ مسعود کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ پروفیسر کا ترجمہ بھی اس موقعہ پر اصلاح طلب ہے جو یہ ہے: And in a way a pupil of mas'ud sa'd salman بیک واسطہ سے مراد ہے کہ شہاب الدین اور خواجہ مسعود کے درمیان ایک اور شخص جو خواجہ کا شاگرد اور شہاب الدین کا استاد ہے دخیل ہے۔

شمس العلما نے مذکورۂ بالا شاعر کے نام کے ساتھ جس کا تخلص شہاب ہے بےپروائی سے کام لیا ہے۔ عنوان میں اس کو رشید شہاب لکھا ہے جس سے گمان گزرتا ہے کہ نام رشید ہے اور ولدیت شہاب ہے حالاں کہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ 'تاریخ آل غزنیں کے اقتباس میں اس کو امیر شہاب الدین علی لکھا ہے (صفحہ ۲۶۴)۔ لطف علی بیگ آذر کے اقتباس میں 'شہاب الدین و محمد رشید ہے۔ خود پروفیسر نے

جو نام اختیار کیا وہ شہاب‌الدین عرف محمد رشید ہے۔ اس عہد میں چوں‌کہ ولدیت کا لانا ضروری سمجھا جاتا ہے اس لیے اکثر موقعوں‌پر بجاے ابن لکھنے کے اضافت ابنی سے کام لیا جاتا تھا مثلاً محمد رشید سے مقصد محمد ابن رشید لیا جائےگا لیکن شمس‌العلما اس اضافت کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اس لیے ان کے قارئین کو اکثر موقعوں پر ان اسما کے متعلق دھوکا رہےگا کہ آیا وہ مرکب ہے یا مفرد۔ لیکن محمد عوفی نے اس کا نام شہاب‌الدین علی ابی رجاالغزنوی دیا ہے۔ جس سے ثابت ہے اس کا نام علی ہے نہ محمد۔ تعجب ہے کہ پرفیسر نے اس قدیم اور معتبر حوالے کو صرف‌نظر کرکے ایک متاخر اور غیر معتبر راوی کے بیان پر مہر تصدیق لگائی۔

اکثر تذکرہ نگار جن میں عوفی بھی شامل ہے علی کو بہرام شاہ (۵۱۲-۵۴۷ھ) کے عہد کا شاعر مانتے ہیں۔ شمس‌العلما نے جو قصیدہ اور قطعے نقل کیے ہیں وہ بھی بہرام شاہ کی شان میں ہیں۔ تاہم وہ اس شعر کو معزالدین محمد بن سام کے شعرا میں شمار کرتے ہیں ان کے پاس تاریخ آل غزنین کی جو سند ہے وہ بھی اس موضوع خاص پر خاموش ہے۔ چناں‌چہ اس تاریخ کی اصل عبارت ہے۔

« و هم دران زمان امیر شهاب‌الدین علی که شهاب تخلص کرد و بسیار نغزگوی و بیک واسطه شاگرد مسعود سعد سلمان بوده بدارالخلافت مراجعت نمود »

اس عبارت سے اسی قدر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دارالخلافہ میں آیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ سلطان معزالدین محمد بن سام کے دربار کا شاعر اور مداح ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود پروفیسر بھی اس امر کا اظہار نہیں کرتے، پھر معلوم نہیں کہ اس کا نام معزالدین محمد بن سام کے عہد میں کیوں داخل کیا گیا۔ شہاب‌الدین علی ابورجا یقیناً غزنویوں کا مداح ہے اس نے بہرام‌شاہ اور خسروشاہ (۵۴۷ -- ۵۵۵ھ) کی مداح میں قصائد لکھے ہیں اور ضرور ہے کہ خسرو ملک (۵۵۵ -- ۵۸۲) کی بھی مدح‌سرائی کی ہو۔ قصہ مختصر ایک شاعر جو تین پشت تک غزنویوں کا مداح رہاہو اس کو معزالدین کے دور میں داخل کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ شہاب اپنی عمر کے آخری سنین میں غزنیں پہنچا ہے یہ واقعہ سنہ ۵۸۲ھ کے بعد ہونا چاہیے جب لاہور پر معزالدین کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ اس شاعر کا سال وفات سنہ ۵۸۶ھ ہے اور بہ قول تذکرۂ روز روشن سنہ ۵۹۸ھ ہے۔

صفحہ ۲۶۸ — ع ، آمد آن رگ زن مسیح پرست ، الخ۔

اس قطعے کو پروفیسر نے ناتمام صورت میں نقل کیا ہے کل چار شعر دیے ہیں اس میں پانچ شعر اور ہیں جو میں تنقید شعرالعجم میں درج کرچکا ہوں۔ (صفحہ ۵۳۱ رسالۂ اردو اورنگ آباد۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ ع)۔

صفحہ ۲۶۸ — شہاب‌الدین کی رباعی کی مثال میں پروفیسر نے یہ دو بیت دیے ہیں:

شاخکے چند نرگس رعنا گلکے چند تازہ و چیدہ
آں ہمہ دیدہاے بےچہرہ ویں ہمہ چہرہ ہاے بے دیدہ

یہ ابیات رباعی کے وزن میں نہیں ہیں بلکہ بحر خفیف میں ہیں ان کو رباعی نہیں کہا جاسکتا۔

صفحہ ۲۷۰ — کہتے ہیں معزالدین کے عہد میں فارسی ادب کی ترقی کے حق میں ایک اہم محرک، خراسان سے اس کے لشکروں کے ساتھ ادیبوں کی آمد تھی۔ اس لشکر سے اس نے لاہور کی بغاوت فرو کی جو اس کے قیام غزنہ کے زمانے میں وقوع پزیر ہوئی تھی جہاں اس کو اپنے بھائی غیاث‌الدین کی وفات کی وجہ سے بڑی عجلت میں جانا پڑا تھا۔ ایرانی ادیبوں کی یہ ہجرت ہندستان اور ایران کے مابین تمدنی سنگھم قائم کرنے میں درمیان کی کڑی ثابت ہوئی۔

ہندستان میں موقعہ بہ موقعہ وقتاً فوقتاً ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد یا ہجرت کا ذکر پروفیسر کی تالیف کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن ان ہجرتوں کی تفصیل یا ان کے اثرات واضح طور پر کبھی نہیں دکھائے۔ چناں‌چہ یہاں بھی وہی سلوک ہوا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اطلاعیں تاریخی نہیں ہیں بلکہ مفروضہ ہیں۔

پروفیسر نے جو بعض جزئی تفصیل معزالدین کے قیام و سفر کے سلسلے میں دی ہے اس سے ان کے قاری غلط‌فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ لاہور اس کا دارالحکومت ہوگا وہاں سے جب غزنی تک گیا لاہور میں بغاوت پھیل گئی، حالاں‌کہ غزنیں اس کا مستقل تخت‌گاہ تھا اور لاہور ضرورتاً آتا تھا۔

صفحہ ۲۷۰ — کہتے ہیں: امام فخرالدین جو سلطان معزالدین کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے ہفتہ‌واری وعظ کیا کرتے تھے۔ ان وعظوں کا اثر بڑا دوررس ثابت ہوا ان سے لوگوں کے ادبی مذاق میں انقلاب عظیم آگیا اور تعلیم یافتہ اور شاعر طبع جماعت نے فارسی‌نویسی اختیار کرلی۔

یہ بھی فارسی تحریک کے حق میں نرالی وضع کا وجۂ ثبوت ہے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ امام صاحب پند و نصیحت، تعلیم اخلاق، تحریک صوم و صلوٰۃ، گناہ سے پرہیز کرانے، نیکیوں کی ترغیب دلانے، عذاب آخرت سے ڈرانے اور گم راہوں کو راہ راست پر لانے کے بجاے اپنی مجالس وعظ میں شعر و سخن کا دفتر کھولتے، ادب کے غوامض و نکات بتاتے، شعر کے حسن و قبح پر بحث کرتے اور اساتذہ کے کلام پر راے زنی کرتے تھے۔

صفحہ ۲۷۱ — کہتے ہیں۔ ''ایک دن امام رازی نے اثناے وعظ میں ابیات ذیل صریحاً سلطان کو خطاب کرکے پڑھے۔ ان کا مطلب تھا کہ دنیا فانی ہے اور اس کو سب کے ساتھ حتیٰ کہ دشمنوں کے ساتھ بھی آشتی سے رہنا چاہیے:

اگر دشمن نسازد با تو اے دوست		ترا باید کہ با دشمن بسازی
وگر نہ چند روزی صبر فرما		نہ او ماند نہ تو نہ فخر رازی

یہ قصہ پروفیسر نے منتخب التواریخ سے لیا ہے جس کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ مگر بدایونی کا مطلب پروفیسر صاحب کے بیان سے واضح نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے امام صاحب معزالدین کے بھائی سلطان غیاث الدین محمد بن سام کے پاس تھے۔ اس کے نام پر لطائف غیاثی و دیگر کتب انھوں نے تصنیف کیں۔ جب امام ممدوح معزالدین کے پاس آگئے۔ ہر ہفتے وعظ کرتے خود سلطان موصوف ان مجالس میں حاضر ہوتا اور رقّت کرتا۔ لیکن امام صاحب اس نقل و حرکت اور دائمی حاضر باشی سے سخت ملول تھے۔ ایک روز منبر پر سے آپ نے سلطان کو خطاب کیا اور کہا اے سلطان معزالدین کچھ وقت کے بعد نہ تیرا یہ جلال اور کروفر رہےگا اور نہ رازی کا نفاق اور خوشامد باقی رہےگی۔ اور وہی قطعہ پڑھا جو اوپر درج ہے۔ جب سلطان کے قتل کا حادثہ پیش آیا بعض فتنہ پردازوں نے سلطان کے قاتل فدائیوں کے ساتھ امام صاحب کی شرکت کا باندھنو باندھا اور ظاہر کیا کہ امام ان کے ارادے سے واقف تھے۔ اس بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازی سلطان سے ناخوش تھے اور مجبوراً ساتھ رہتے تھے۔ تنگ آمد بہ جنگ آمد۔ دل کی بات زرا پردہ رکھ کر کہ گزرے۔

صفحہ ۲۷۳-۴ — شیخ معین الدین کے تذکرے میں شیخ علی بن عثمان الھجویری کے ساتھ ہمارا تعارف کرایا گیا ہے کہ سنہ ۴۳۳ھ میں لاہور تشریف لائے اور سنہ ۴۵۵ھ میں انتقال فرمایا۔ پھر خواجہ معین الدین کے ساتھ ان کا مقابلہ کرکے خواجہ کی برتری ثابت کی ہے۔ ابوالحسن کی کشف المحجوب جو انھوں نے لاہور میں

تالیف کی خاص خاص سوالات کا مجموعۂ جوابات ہے جو ان کے دوست اور رفیق طریقت ابوسعید الہجویری نے وقتاً فوقتاً کیے تھے - یہ سوالات اس قسم کے تھے کہ صوفی کون ہے؟ عالم کون ہے؟ دنیا میں ان کی ہستی کی کیا ضرورت ہے؟ ابوالحسن نے جواب میں صوفی کی تعریف نہایت وسیع مفہوم میں کی اور علم و عالم کی شرح قرآن شریف کی توضیح کے مطابق کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر داتا گنج بخش اور ان کے علمی و ادبی مشاغل کا ذکر غزنویوں کے عہد میں لانا بھول گئے - اس فروگزاشت کی تلافی یہاں بہ طور سجدۂ سہو ایک مختصر حاشیے کی شکل میں کی گئی ہے یہ حاشیہ نہ مخدوم کے کمالات کا مظہر ہے نہ ان کی ادبی قابلیت کا۔

مخدوم بڑے سیاح ہیں انھوں نے شام، عراق، بغداد، پارس، قہستان و آذربائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان و ماوراءالنہر تا اقصاے ترکستان (سرحد اسلام) اور ہندستان کی سیر و سیاحت کی ہے۔ ہر جگہ صوفی مشاہیر سے ملے اور ان سے فیض حاصل کیا۔ وہ ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی کے مرید ہیں۔ ابوالعباس احمد بن محمدالاشقانی بعض علوم میں ان کے استاد ہیں۔ ابوجعفر محمد بن المصباح الصیدلانی کی بعض تصنیفات خود ان سے پڑھی ہیں۔ ابوالقاسم قشیری، ابوالقاسم گرگانی اور ابوسعید ابوالخیر و دیگر مشائخ کے ساتھ ہم‌صحبت رہے۔ لکھتے ہیں کہ صرف خراسان میں تین سو مشائخ سے ملا ہوں۔

متعدد تصنیفات کے مالک ہیں مثلاً (۱) منہاج‌الدین یہ کتاب ایک شخص مانگ کر لے گیا اور اپنی طرف منسوب کرلی اگرچہ کام‌یاب نہ ہوسکا۔ (۲) البیان لاہل العیان (۳) اسرارالحزق والموئینات (۴) کشف‌الاسرار (۵) الرعایت لحقوق اللّٰہ (٦) بحرالقلوب (۷) حسین بن منصور حلاج پر بھی کوئی تصنیف تیار کی تھی۔ ایک زمانے میں حسین کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور اس کی تصنیفات کے پچاس رسالے بغداد، خوزستان، فارس و خراسان میں پڑھے تھے۔ (۸) دیوان اشعار۔ کوئی شخص مستعار لے گیا اور واپس کرنے کے بہ جاے غاصبانہ قبضہ کرلیا اور ان کا تخلص نکال کر اپنا تخلص ڈال دیا (۹) کشف‌المحجوب ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور ہے جو اپنے زمانۂ تصنیف سے لے کر اب تک مقبول رہی ہے۔ صوفی حلقوں میں قبولیت کے علاوہ اس کو قدامت کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ پانچویں صدی کے ربع دوم سے تعلق رکھتی ہے اور غزنوی دور کی ان چند تالیفات سے ہے جو دست‌برد زمانہ سے اتفاقیہ

محفوظ رہ گئیں ۔ اس کے ذریعے سے ہم اس عہد میں تصوف کی نشوونما و ارتقا کا صحیح اندازہ لگاسکتے ھیں ۔ کشف‌المحجوب صوفی، اور صوفیانہ زندگی، طریق تصوف، مصطلحات تصوف، مقامات صوفیہ، ان کے مذاھب اور مقالات و رموز و اشارات پر ایک جامع کتاب ھے ۔ صوفی برادری کے ممتاز فرقوں، سلسلے کے بزرگوں اور مصنف کے معاصر صوفیوں کے حالات پر شامل ھے ۔ تاریخ تصنیف سنہ ۴۳۱ھ بتائی جاتی ھے ۔ شمس‌العلما کا یہ دعویٰ کہ لاھور میں تصنیف ھوئی ھماری رائے میں درست نہیں کیوں کہ حضرت مصنف خود اثنائے تصنیف میں ھندستان کا ذکر اس طرح سے کرتے ھیں جس سے صاف پایا جاتا ھے کہ ھندستاں کے باھر لکھ رھے ھیں ۔ ایک جگہ لکھتے ھیں :

« و اندر ھندستان مردے دیدم کہ مدعی بود بہ تفسیر و تذکیر و علم با من اندرین معنی مناظرہ کرد ۔ صفحہ ۱۹۲

ایک دوسرے مقام پر یہ عبارت ملتی ھے :

« و در ھندستان دیدم کہ اندر زھر قاتل کرمی پدید آمدہ بود و زندگئ وے بدان زھر بود » ۔ صفحہ ۳۲۰

کشف‌المحجوب سوال و جواب کی شکل میں مرتب نہیں اور بعد کے تذکروں تذکرۂ عطار و نفحات‌الانس وغیرہ کا ایک نہایت ضروری ماخذ ھے ۔ اس کی فنی اور ادبی حیثیت کی بنا پر پنجاب یونی‌ورسٹی نے فارسی کے اعلی امتحان کے نصاب میں شامل کرلیا ھے ۔

مخدوم علی بن عثمان ھجویری اور خواجہ معین‌الدین چشتی کی فضلیت کا مقابلہ ھمارے خیال میں غیرسنجیدہ اور ناموزوں ھے ۔ ع طالع شہرت رسوائی مجنون بیش است — سے ھمیں انکار نہیں لیکن خواجہ صاحب نے تو خود مخدوم کے مزار پر آکر چلہ‌کشی کی ھے اور رخصت کے وقت اپنا یہ شعر نذر عقیدت کیا ھے :

گنج بخش ھردو عالم مظہر نور خدا   کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رھنما

مخدوم کی وفات با صح اقوال سنہ ۴۶۵ھ میں ھوئی نہ سنہ ۴۵۵ھ میں ۔ سلطان ابراھیم سنہ ۴۷۲ھ میں جب وارد لاھور ھوتا ھے آپ کے مقبرے کی تعمیر کا حکم دیتا ھے ۔ مسعود ثالث اپنے عہد میں آپ کے روضے کی زیارت کو آتا ھے ۔ مزار آج بھی مرجع خلائق ھے ۔ با قاعدہ عرس ھوتا ھے مختصر یہ کہ داتا صاحب آج بھی پنجاب کے سب سے بڑے ولی مانے جاتے ھیں ۔

صفحہ ۲۷۳ — ،خواجہ معین‌الدین چشتی سنجری اصفہانی، کہتے ھیں کہ ،خواجہ صاحب پہلے صوفی ھیں جو بالائی ھندستان میں آکر تصوف کا چراغ روشن کرتے ھیں ۔

بعض ضعیف روایتوں میں انھیں اصفہانی لکھا ہے ۔ ان کو سنجری (بہ‌فتح سین و سکون نون و فتح جیم و تحریک را و سکون یا) کہنا بر بنائے عدم تحقیق ہے ۔ ان کی صحیح نسبت سجزی بہ‌حرکت سین و سکون جیم و کسرہ زائے معجمہ و سکون یا ہے ۔ چوں‌کہ سجستان کے رہنے والے ہیں اس لیے سجزی کہلائے ۔ آئین اکبری میں ابوالفضل کے تقریباً یہ الفاظ ہیں : « خواجہ معین‌الدین از سیستان است بنا برین اورا سجزی می نویسند کہ معرب سکزی است » ۔ فرشتہ کا بیان ہے : تولد او در بلدۂ سجستان بودہ ، (صفحہ ۳۷۵ نول‌کشور) ۔

ابوالفضل اور فرشتہ سے قدیم‌تر حوالہ عصامی کی فتوح‌السلاطین میں آتا ہے جو سنہ ۷۵۰ھ کی تالیف ہے چناں‌چہ :

معین‌الدین آن سجزی دین پناہ کہ خفتہ است باجیر آن مرد راہ

چو اورا زیارت شہنشاہ کرد و زانجا سوے تخت‌گہ راہ کرد

(صفحہ ۴۴۷)

صفحہ ۲۷۶ — ترکوں کے قبیلے کا نام غز بہ‌ضم اول ہے نہ بہ‌فتح اول جیسا کہ پروفیسر نے لکھا ہے ۔ یہ قبیلہ تاتاری نہیں ہے بلکہ ترک ۔

(حاشیہ) اکاف بہ‌تشدید کاف ہے نہ بہ تخفیف تشدید ۔ اندلسی « Undulusi » یہ نسبت تقویم‌البدان میں بہ‌فتح اول و سوم ہے ۔

صفحہ ۲۷۴ — کہتے ہیں کہ خواجہ کے بزرگ سیستان میں رہتے تھے ۔ آپ کی ولادت اصفہان سنہ ۵۳۷ھ میں واقع ہوئی اور نشوونما خراسان میں پائی لیکن

صفحہ ۲۷۵ — پر کہتے ہیں ۔ خواجہ کے والد غیاث‌الدین کی موروثی املاک سیستان میں تھی مگر خواجہ کی ولادت سے دو سال بعد ظالم تاتاری ، غزوں کے حملوں سے تنگ آکر جو وقتاً فوقتاً سیستان پر ہوا کرتے تھے نقل مکان کرکے خراسان چلے گئے اور نواح نیشاپور میں آباد ہوگئے اور وہیں سنہ ۵۵۱ ھ میں فوت ہوے ۔ اس وقت خواجہ کی عمر ۱۴ سال کی تھی ۔

یہ مان کر کہ خواجہ سنہ ۵۳۷ھ میں پیدا ہوے ، دو سال بعد یعنی سنہ ۵۳۹ھ میں ان کے والد سیستان پر غزوں کے حملوں کی وجہ سے ہجرت کرکے نیشاپور کے نواح میں آباد ہوگئے ۔ یہ بیان وہی شخص دے سکتا ہے جو تاریخ سے ناواقف ہو ۔ غزوں سے بچنے کی پناہ ڈھونڈی بھی تو کہاں نیشاپور میں جو غزوں کا خاص اڈا تھا

لیکن اس وقت غز آئے کہاں سے ۔ وہ تو اس تاریخ سے دس سال بعد نمودار ہوتے ہیں جب سنہ ۵۴۹ھ میں سلطان سنجر کو شکست دے کر خراسان پر اپنا قبضہ کرتے ہیں ۔ سیستان میں تو ان کی تاخت پہلی مرتبہ سنہ ۵۶۴ھ میں ہوتی ہے (تاریخ سیستان صفحہ ۳۹۱)

صفحہ ۲۸۱ ،خواجہ صاحب دس محرم سنہ ۵۶۱ھ کو اپنے چالیس مریدوں کے ساتھ اجمیر پہنچے ۔ یہ راے پتھورا کا زمانہ تھا،۔

خواجہ کے سلسلے میں ان کی تاریخ وفات کے سوا تمام تاریخیں قیاسی معلوم ہوتی ہیں ۔ یہاں تو تاریخ اور مہینہ تک دے دیا ہے ۔ ہمارے خیال میں یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تاریخ غلط ہے یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ پرتھی راج کی گدی نشینی سے قبل وارد اجمیر ہوے کیوں کہ سنہ ۵۶۱ھ تک پرتھی راج گدی پر نہیں آیا تھا ۔ یہ تاریخ خواجہ کی آمد اجمیر سے بہت پہلے کی معلوم ہوتی ہے ۔ پرتھوی راج کے قصے کا ادخال خواجہ کے حالات میں اکبری عہد کے بعد ہوا ہے ۔

صفحہ ۲۸۲ — ، آنا ساگر ،۔ صحیح تلفظ بہ فتح الف اناساگر ہے ۔

صفحہ ۲۸۴ — اس صفحے میں عصامی اور اس کی مثنوی فتوح السلاطین کا جس کو ڈاکٹر آغا مہدی حسین پروفیسر آگرہ کالج نے مرتب کیا ہے تذکرہ لایا جاتا ہے ۔ یہ پروفیسر کی فروگزاشت کی نہیں بلکہ ان کے اضطرار کی مثال ہے ۔ بھلا خواجہ معین الدین کے حالات میں فتوح السلاطین کے تعارف کا کیا موقع ہے ۔ اگر پروفیسر عصامی کے وہ اشعار درج کرتے جو خواجہ کے متعلق ہیں تو بھی ایک بات ہوتی مگر انھوں نے یہ بھی نہ کیا ۔ عصامی کا ذکر ان کو محمد تغلق کے عہد میں حسب قاعدہ لانا چاہیے تھا ۔

صفحہ ۲۹۱ — خواجہ معین الدین کے تفصیلی حالات کے بعد جن میں خوش اعتقادی کی حد تک صوفی روایات کی تقلید کی ہے شمس العلما خواجہ صاحب کے دیوان سے مختلف نمونے مع ترجمہ دیتے ہیں ان میں بعض موقع صاف نہیں ہیں ۔ چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں :

بیا و هردو جهاں را به ششدر اندر نه درین قمار بیک داد هرچه هست ترا

دوسرے مصرع ،داد، کی جگہ ،داو، چاهیے ۔ پہلے مصرع کا ترجمہ کیا ہے :

Come out put both the worlds with in the six gate,

ششدر یہاں کنایۃً عجز و حیرانی کے معنوں میں ہے نہ اس کے لغوی معنوں میں ۔

تو باز شاهی و از دست شاہ پریدی بغیر شاہ مکن میل وسوے شه باز آ

مصرعۂ دوم کا ترجمہ ہے : Do not intend to fly in any other direction without the Kings assent, come back to the King. 'بغیر شاہ مکن میل ، کا ترجمہ 'شاہ کے سوا کسی اور کی طرف رغبت نہ کر ، مناسب ہے۔

صفحہ ۲۹۸

مگو کہ کثرت اشیا نقیض وحدت تست تو در حقیقت اشیا نظر فکن همه اوست

یہ شعر ترجمے سے چھوٹ گیا ہے

صفحہ ۳۰۰

ز بحر عشق یک قطرہ ظہور سرّ منصوریست
بطرف همت عاشق ازین کم‌تر نمی گنجد

'بظرف ، کی جگہ بطرف چھپا ہے اور مصرع کا ترجمہ بھی محل نظر ہے۔
Less than this is not possible for a lover's spirit.

صفحہ ۳۰۴

واقف آنست که دل واقف اسرار شود مرد آنست که جان طالب دیدار شود

پہلے مصرع میں 'واقف ، کی جگہ 'وقت ، اور دوسرے مصرع میں 'مرد ، کی جگہ 'جاے ، صحیح ہے۔

صفحہ ۳۰۲

چه رشکها ست که از یاد می‌برم هر شب که روے او ز چه بر روی دوست می‌آید

اور مصرعۂ اول کا ترجمہ :— How jealous am I of my power of remembrance every night. مصرعۂ اول میں 'یاد ، کی جگہ 'باد ، صحیح ہے یعنی باد صبا

صفحہ ۳۰۵

یعنی آن لطف و عنایت که خداوند مراست چه عجب باشد اگر بنده گنهکار شود

پہلے مصرع میں 'آن ، کے بہ جاے 'زان ، بہتر قرات ہے۔

صفحہ ۳۱۸

سرّ غم عشقش را با خلق معین کم گوی احوال سلاطین را با کس نتوان گفتن

دوسرے مصرع میں 'احوال ، کی جگہ 'اسرار ، زیادہ مناسب ہے۔

صفحہ ۳۲۵ خواجہ صاحب کی غزلیات پر راے‌زنی کرتے ہوے کہتے ہیں کہ اپنے عہد کے سب سے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ ان کا انداز رنگین اور واضح ہے اور

کلام جو دقیق خیالات کا مخزن ھے خوب صورتی سے مرتب اور تاثیر کے ساتھ ادا ھوا ھے - ان کے اشعار میں جو عشق حقیقی سے سرشار ھیں ھمیشه پارسایانه متانت اور انبساط موج‌زن ھے - صوفی شعرا میں سے ان کا کلام خواجه حافظ کے کلام کے ساتھ بہت قریبی مشابہت رکھتا ھے - مگر ان کے ھاں باده و مےخانه اور ساقی و شاھد پہلی ھی نگاہ میں روحانی معلوم ھوتے ھیں برخلاف حافظ کے جن کے گل و مل اور بلبل اور گیسوے دل‌بر ان کو اپنے زمانے کے سربرآورده لامذھب اور رند کی حیثیت سے عوام کی تضحیک و تشنیع کا نشانه بناتے ھیں - خواجه معین‌الدین کے ھاں یه الفاظ مادی مفہوم میں ھرگز ھرگز نہیں آے بلکه حقیقت کے حامل ھیں - خدا اور عشق خدا ان کے مشارالیه ھیں - نوجوان عشاق حافظ کے کلام سے لازمی طور پر تسکین پاتے ھیں کیوں که یه اشعار ان کے جذبات اور خیالات کے آئینه‌دار ھیں - یہی وجه ھے جو حافظ اس قدر جاذب قلوب اور مقبول عام ھیں -

شمس‌العلما نے اس کے بعد حافظ کی شاعری کے دو پہلو حقیقت اور مجاز پر بحث چھیڑی ھے لیکن ھم اس سے صرف نظر کرتے ھیں - اسی سلسلے میں وہ حافظ کی موھومه و مفروضه معشوقه شاخ نبات اور اس کے واسطے حافظ کے عشق کو نہیں بھولے ھیں لیکن اس ذکر و اذکار سے میں اپنے اصل مقصد سے دور ھٹ گیا ھوں۔

پروفیسر کا خلاصۂ بحث یه ھے که حافظ ابتدا میں ایک بےقید اور آزادانه زندگی بسر کرتے رھے - آخر عمر میں انھوں نے تصوف کا کوچه اختیار کرلیا -

ادھر خواجه معین‌الدین کی زندگی اور ان کی شخصیت ھرقسم کے شبہے سے بری ھے - وہ شروع سے آخر تک صوفئ صاف باطن رھے - ان کی ابتدائی زندگی اور اس کے مشاغل پاک اور معصومانه ھیں - ان کے نغمے مجازی عشق کی لے میں نہیں جو کرب اور کڑھن اذیت اور ھیجان کا مورث ھے - بلکه ان کی طبیعت عشق حقیقی کے واسطے وقف ھے جو ارفع و اعلیٰ اور خالص ھے اور زندگی کے حقیقی اسرار اور ھمارے مقصد حیات کو واشگاف کرتی ھے - وہ اپنے ناظرین کو وجدانیات کی فضا میں لے جاتے ھیں اور عالم روحانیات کی سیر کراتے ھیں - ان کی شاعری کا سب سے موقر وصف استغنا کا قوی جذبه ھے جو حافظ سمیت اوروں میں غیر حاضر ھے - انھوں نے صلے کے واسطے کسی پادشاہ کی خوشامد نہیں کی نه کسی امیرکبیر یا خسرو والاجاہ کی مدح میں کوئی غزل یا قصیده لکھا - وہ ایک نہایت شان‌دار اور گراں قدر طرز کے مالک ھیں اگرچه عشق اور شراب جو فارسی شاعری کے عام جوھر ھیں ان کے کلام

کے بھی نمایاں عنصر ہیں - خلاصه یه که خواجه صاحب کی شراب عیناً اس شعر کے مصداق ہے :

مرا از قدح بادهٔ سرمدیست و زین باده مقصود من بےخودی است

اور حافظ کی شراب تو ہر حال میں محتمل‌علیه ضرور ہے - اگرچه ان کی شاعری انداز و بیان کے لحاظ سے نہایت دل‌کش اور شیریں ہے - لیکن اس میں خواجه کا سا رنگ ڈھنگ اور حرارت موجود نہیں -

خواجه صاحب نہایت خوش‌قسمت ہیں جنھیں شمس‌العلما کی ذات میں ایسا جوشیلا معتقد مل گیا ہے جس نے تمام دنیا کے برخلاف نه صرف خواجه صاحب کو شاعر ہی ثابت کردیا بلکه پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کے پایے کو حافظ سے بڑی بڑھادیا لیکن کیا یه حقیقت ہے یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں :

آرزو خوبست اما این قدر ہا خوب نیست

ہم مین شمس‌العلما کا سا جوش اور وجدان نہیں جو ان کے ہر بیان کو صوفیانه انداز میں آمنا و صدقنا کہ دیں - ہماری رایے میں یه ایک غلط شناخت والا معامله ہے - جس طرح کوئی مسافر غلط راسته اختیار کر لیتا ہے اور منزل مقصود سے بھٹک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے - یہی کیفیت شمس‌العلما کی ہے انھوں نے خواجه صاحب کے دھوکے میں کسی اور معین کا دیوان اٹھا لیا ہے اور ایک دل‌کش انداز میں اس پر رایےزنی شروع کردی - یه غلطی اسی قسم کی غلطی ہے جو مولانا شبلی سے سرزد ہوئی ہے که رودکی کے گمان پر قطران تبریزی کا دیوان سامنے رکھ لیا اور دل کھول کر داد دیتے رہے -

متاخرین میں سے بعض تذکره‌نگار مثلاً تقی اوحدی، واله ، میرحسین دوست سنبھلی بعض‌اشعار خواجه صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں - لیکن خواجه صاحب کی طرف دیوان کا انتساب گزشته صدی سے شروع ہوتا ہے - منشی نول‌کشور اس کو طبع کرتے ہیں لیکن جیسا که میں اپنے ایک مضمون ، دیوان حضرت خواجه معین‌الدین حسن سجزی، میں دکھا چکا ہوں که متاخرین کی یه شہادت دیوان کا تعلق خواجه صاحب کے ساتھ وابسته کرنے کے لیے ناکافی ہے - سب سے پہلے یه سوال پیش آتا ہے که حضرت کے عہد سے لےکر گزشته صدی تک یه دیوان گنج مخفی کی طرح کہاں غائب رہا اور خواجه صاحب کے سوانح نگاروں کی نظروں سے کیوں کر اوجھل رہا؟

دیوان ھذا طبع نولکشور ۹۱ صفحات پر ختم ھوتا ھے ۔ غزلیات کے سوا اس میں کوئی صنف نظم موجود نہیں ۔ غزلوں کی تعداد ایک سو اکیس ھے اور ابیات کا شمار گیارہ سو بارہ سو کے درمیان ھے ۔ شاعر اپنا تخلص دو طرح سے لاتا ھے یعنی معین اور معینی ۔ متعدد غزلیں حمد و نعت میں ھیں ۔ کلام سراسر عشق و عرفان کے رنگ میں ڈوبا ھے ۔ عشق الٰہی کا جذبہ بہت غالب ھے ۔ رندی اور سرمستی کے مضامین خال خال موقعوں پر نظر آتے ھیں ۔ خمریات کا ذکر جو کہ عراقی اور حافظ کے ھاں بہت غالب ھے یہاں بالکل دھیما ھے ۔ شوخی مطلق نظر نہیں آتی ۔ متین اور سنجیدہ خیالات قدم قدم پر دامن گیر نظر آتے ھیں ۔ مذھب سے عداوت نہیں ۔ نہ شیخ و زاھد کا استخفاف منظور ھے ۔ تجرید و ترک تعلق شاعر کا پیغام خاص ھے ۔ یہاں تک کہ بہشت جو زھاد کی منتہاے مقصود ھے دامگاہ علائق بتادی گئی ھے ۔ اور خیال میں نزاکت اور خوش اسلوبی جو متاخرین کا دست مایۂ ناز ھے غلبہ پاے ھوے ھے ۔ زبان میں ایسا لوچ، گھلاوٹ اور لطافت موج‌زن ھے جو خواجہ صاحب کے زمانے میں قطعی نامعلوم ھے ۔ بندشیں اور ترکیبیں متاخرین کی طرز میں ھیں ۔ اظہار خیال کے واسطے بوقلموں اور متنوع پیراے شاعر کے قبضے میں ھیں جس سے معلوم ھوتا ھے کہ غزل اس عہد تک بہ‌درجۂ کمال ترقی پاچکی تھی ۔

کلام کا جوھر سادگی سادہ بیانی اور سادہ خیالی ھے ۔ تکلفات سے عام طور پر احتراز ھے ۔ خیالات کی رنگارنگی اور تنوع غزل کا طغراے امتیاز ھے لیکن اس دیوان میں بیرونی اور اجنبی خیالات بہت کم چھیڑے گئے ھیں ۔ نفس مضمون پر توجہ مائل ھے ۔ حقائق و دقائق تصوف، واردات سلوک، تجرید و تفرید، فنا و بقا، نفی و اثبات، شوق دیدار وغیرہ کے اظہار پر شاعر کی تمام شاعری مبذول ھے ۔ مضمون کی اس تنگی سے کلام میں ایک خفیف سی جھلک نمودار ھے ۔ جدت اور آمد اچھے خاصے پیمانے پر ھے بعض ابیات ایسے صاف اور ھموار نکل آے ھیں کہ دل میں چٹکیاں لیتے ھیں ۔ یہ ایسے شخص کا کلام ھے جو جذبات عشق الٰہی سے سرشار اور رسول عربی کا عاشق زار ھے ۔ مسافر منزل طریقت ھے لیکن شریعت کی روشنی میں ۔ عشق ھے لیکن متانت کا دامن پکڑے ھوے ۔ دیوانگی میں بھی دانائی کی ادا موجود ھے ۔ مسائل معرفت کے ساتھ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحات بےتکلفی اور خوش‌مذاقی کے ساتھ برتی گئی ھیں ۔ جو بات حافظ اور عراقی کے ھاں موجود نہیں ۔ ان دقائق نے کلام کو بعض اوقات پیچیدہ بنادیا ھے ۔

شاعر اپنے آپ کو مسکین معین کہنے کا عادی ہے ۔ دیوان کے تتبع سے اس قدر اور پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں واعظ ضرور رہا ہے کیوں کہ بعض مقطعوں میں اس نے منبر ، مجلس اور وعظ کی طرف تلمیح کی ہے چناں‌چہ :

معین برآی بمنبر بکوی نکتۂ عشق — کہ بلبل چمن عشق در زمانہ توی
(دیگر)

گرچہ شاہان را بتخت و تاج زینت می‌دہند — جلوۂ مسکین معین بر تاج و منبر کردہ‌اند
(دیگر)

معینی گر ہمی خواہی کہ سرّش بر زبان رانی — مقام آن سر دار است بر منبر نمی‌گنجد
(دیگر)

بیا بوعظ معینی رموز عشق شنو — کہ از حکایت او بوی دوست می‌آید
(دیگر)

خلق گویندم معین این راز بر منبر مگوے — آہ کین آتش ہزاران واعظ و منبر بسوخت

ان اشعار کی شہادت سے شاعر کا واعظ ہونا مفہوم ہوتا ہے اس لیے واعظین کی جماعت میں اس کی تلاش ضروری ہوئی ۔ چناں‌چہ ایک واعظ جو شاعر بھی ہیں بعد تلاش ہمیں ملے ہیں ۔ ان کا نام مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی و الہراتی ہے ۔ سلطان ابوالغازی حسین کے عہد کے زبردست فاضل ہیں اور جامی کے ہم‌عصر ۔ آپ اپنے عہد کے مشہور واعظ اور مصنف ہیں ۔ دنیاوی تعلقات سے اس قدر بیزار تھے کہ سنہ ۹۰۰ ھ میں آپ کے بھائی مولانا نظام الدین قاضئ ہرات کی وفات پر جب سلطان حسین نے بہ اصرار تمام منصب قضا آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے بہ درجۂ مجبوری قبول کیا اور سال بھر کے بعد اس سے دست‌کش ہوگئے ۔ علم و فضل اور زہد و ورع کے لحاظ سے ایک ممتاز ہستی تھے ۔ طبیعت میں بلندی اور مزاج میں استغنا تھا ۔ جامع مسجد ہرات میں ہر جمعے کو آپ کا وعظ ہوتا تھا ۔ تقریر میں تاثیر اور بیان میں دل‌کشی تھی ۔ ان کی مجالس میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہوتے ان میں جلیل‌القدر امرا بھی شامل ہوتے اور مولانا ان کی دنیاوی وجاہت کی پروا نہ کرکے برسر منبر ان کے افعال شنیعہ پر سرزنش کرتے اور وہ دم نہ مارتے ۔ کامل چالیس سال آپ نے وعظ و تذکیر میں صرف کیے ۔ وعظ سے جو وقت بچتا تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ۔ مولانا نے برخلاف دیگر علما کے اپنی مجالس وعظ کو حتی‌الوسع دل‌چسپ اور شگفتہ بنانے کی کوشش کی اور موقع بہ موقع نظم کا عنصر داخل

کرکے ان میں اور بھی دلکشی پیدا کردی ۔ شعر میں آپ کا پایہ بلند ہے اور کلام میں عشق و تصوف کا رنگ غالب ہے ۔ طبیعت زودگوئی کی عادی معلوم ہوتی ہے ۔ حبیب السیر میں (صفحہ ۳۳۸ ، جلد سوم . جزو سوم) جس سے میں نے مذکورہ بالا اطلاع حاصل کی ہے سال وفات سنہ ۹۰۷ھ دیا ہے ۔

مولانا معین الدین کثیر تصنیفات کے مالک ہیں :— (۱) تفسیر بحرالدرر ۔ (۲) تفسیر حدائق الحقائق فی کشف اسرارالدقائق ۔ (۳) واضحه فی اسرارالفاتحه ، سورۂ فاتحه کی تفسیر ۔ (۴) معارج النبوة فی مدارج الفتوة ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی مفصل سوانح عمری ۔ سنہ ۸۹۱ھ میں اس کی ابتدا ہوئی اور کئی جلدوں میں لکھی گئی ۔ اس میں ایک مقدمہ ، چار رکن اور ایک خاتمہ ہے ۔ (۵) روضة الواعظین فی احادیث سیدالمرسلین چار جلدوں میں ۔ (۶) تفسیر سورۂ یوسف ۔ (۷) اعجاز موسوی ، حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک مبسوط تالیف ہے ۔ ان کے علاوہ اور رسالے اور کتابیں کثرت سے ہیں ۔ نظم میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اور غزل و رباعی کثرت سے لکھی ہے ۔ ایک مثنوی بھی ان کی یادگار ہے ۔

دیوان زیر بحث بھی مولانا معین الدین کی یادگار ہے جو انتخاب معلوم ہوتا ہے ۔ ان کی پرگوئی سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پورا دیوان بہت ضخیم ہوگا ۔ مولانا کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں دیگر مشاہیر شعرا کے علاوہ اپنے طبع زاد اشعار بلکہ بعض اوقات پوری پوری غزلیات تک لانے کے عادی ہیں اور مکرر بھی لے آئے ہیں ۔ اس طرح انسان ان کی تصنیفات سے پورا دیوان حاصل کرسکتا ہے ۔ چنانچہ ثبوت میں پروفیسر کی انتخاب کردہ غزلیات سے نمونةً چند غزلوں کی نشان‌دہی ذیل میں مولانا کی تالیفات سے کی جاتی ہے :

صفحہ ۲۵—۳۲۱ :

حمدیکه همچو بحر کرم بیکران بود　　حمدیکه شکر نعمت هردو جهان بود

شمس العلما نے پورا قصیدہ نقل کیا ہے ۔ مطبوعہ دیوان (طبع نول‌کشور سنہ ۱۲۸۸ھ) میں یہ قصیدہ صفحہ ۱۶—۱۹ پر موجود ہے ۔ اس میں ایک کم پچاس اشعار ہیں ۔ مولانا معین الدین تمام قصیدہ اپنی تالیف معارج النبوت (مقدمہ ۔ فصل اول ، تحمیدالثانی عشرہ) میں درج کرتے ہیں ۔ قصیدے کی ابتدا میں یہ الفاظ ہیں : « قال مؤلف الکتاب ختم‌اللہ آماله بالرشد و الصواب » مصنف کی اس عبارت سے ثابت ہے کہ قصید ھذا خود ان کی اپنی تصنیف ہے ۔ اس قصیدے کے چند شعر مولانا کی ایک

دوسری تصنیف 'اعجاز موسوی' میں منقول هیں اور ان کے شروع میں مصنف کا دعویٰ هے « چناں‌که فقیر گوید » ۔

صفحه ۲۹۷ :

کسے‌که عاشق ومعشوق خویشتن همه اوست حریف خلوت و ساقی انجمن همه اوست

دیوان میں یه غزل صفحه ۱۳ پر ملتی هے ۔ اس میں گیاره شعر هیں ۔ معارج النبوت (مقدمه، فصل اول، تحمید الثامن کا آخر) میں تمام غزل مرقوم هے اور شروع میں » لمولفه » آیا هے جس سے ثابت هے که یه غزل مولانا معین‌الدین کی هے ۔

صفحه ۳۰۷ :

راه بکشای که دل میل به بالا دارد پرده برگیر که جان عزم تماشا دارد

دیوان میں صفحه ۲۹ پر یه نو شعر کی غزل ملتی هے ۔ ادهر معارج النبوت (مقدمه، فصل سوم، النعت‌التاسع کا خاتمه) میں کامل غزل تحریر هے ۔ اور گمان غالب هے که مصنف کی ملک هے ۔

صفحه ۳۰۴ :

واقف آنست که دل واقف اسرار شود مرد آنست که جان طالب دیدار شود

شعر هذا جس طرح شمس‌العلما نے نقل کیا هے مهمل بن گیا هے ۔ دیوان میں صفحه ۲۷ پر یه غزل جس میں ۲۱ ابیات هیں درج هے ۔ اس غزل کے سات شعر معارج النبوت (رکن اول، باب دوم، فصل پنجم) میں آتے هیں ۔ ان کا عنوان هے « چناں‌که معین دیوانهٔ تو گوید » ۔ اس غزل کے پانچ اور شعر مع مطلع معارج النبوت مطبوعه (رکن سوم، باب چهارم، فصل بست و چهارم 'در لطائف و اشارات'، صفحه ۲۱۹) میں پائے جاتے هیں اور شاعر حسب معمول گویا هے ۔ « چناں‌چه فقیر تو گوید »

صفحه ۳۰۰ :

مرا در دل بغیر از دوست چیزی در نمی‌گنجد بخلوت خانهٔ سلطان کسی دیگر نمی‌گنجد

اس غزل کے گیاره شعر هیں اور دیوان میں صفحه ۲۵ پر ملتی هے ۔ معارج النبوت (رکن اول، باب هفتم، فصل سیزدهم، لطیفة الثانیه) میں اس غزل کے چار شعر ملتے هیں ۔ ظن غالب هے که مصنف کی ملک هے ۔

اس سے زیاده مثالیں بهم پهنچانا طوالت کا موجب هوگا ۔ ورنه اور مثالیں پیش کی جاسکتی هیں جن میں مولانا معین‌الدین کی تصنیفات اور موجوده دیوان میں

وہی اشعار موجود ہیں - جب دیوان کے اس قدر ابیات مولانا کے ثابت ہوے تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں اور تمام دیوان انہی کی طرف منسوب نہ کریں جس کے فی‌الحقیقت وہ مالک اور جائز مالک ہیں[۱] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالۂ اردو اورنگ آباد، صفحہ ۴۰۹ بابت جولائی، سنہ ۱۹۲۴ع ، جس سے عبارت بالا منقول ہے -

صفحہ ۳۳۰ — قطب‌الدین کے سپہ سالار بنائے جانے کے موقع کے وقت لکھتے ہیں کہ ، سلطان نے اس کو اپنے دشمن کھانڈے‌راے کے خلاف مقرر کیا جو مسلمانی طاقت اور حکومت کے واسطے خطرہ ثابت ہورہا تھا - کھانڈے‌راے نے سلطانی فوجوں کو متواتر شکستیں دی تھیں اور دہلی اور میرٹھ کے قلعوں پر قبضہ کرلیا تھا - قطب‌الدین نے ایک بڑا اور آراستہ لشکر جمع کیا اور سنہ ۵۸۹ ھ میں کھانڈے‌راے اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اس کی کام‌یاب قیادت کی - اسی سال وہ میرٹھ اور دہلی کی طرف بڑھا اور دوبارہ ان پر قابض ہوگیا ،-

لیکن صفحہ ۲۸۷ پر پروفیسر تراوڑی کی جنگ میں جو سال ماسبق میں سلطان معزالدین محمد بن سام اور پرتھی راج کے درمیان ہوتی ہے کھانڈے‌راے کی ہلاکت کا واقعہ ضبط تحریر میں لاچکے ہیں - چناں چہ لکھا ہے :-

صفحہ ۲۸۷ سنہ ۵۸۸ ھ میں شہاب‌الدین نے دوسرا حملہ کیا - اس کی فوج سوار و پیادہ تقریباً ایک لاکھ تھی پرتھی راج کا لشکر اس سے تگنا تھا - دونوں فوجیں تراوڑی کے میدان میں مقابل ہوئیں - دن بھر کی سخت جنگ کے بعد راجا اور اس کے اتحادیوں کی فوجوں کو ہزیمت ہوئی اور کھانڈے‌راؤ سپہ سالار

۱- ہمیں کوئی تعجب نہ ہوگا اگر دیوان ہذا کا انتساب خواجہ کی طرف اکبری عہد میں عمل میں آیا ہو - اکبر کے ساتھ شاہی خاندان کی ارادت نے سلطنت کا ہاتھ چشتیوں کے سر پر رکھ دیا تھا - شاہی معتقدین کی خوش‌نودی حاصل کرنے کے لیے عجب نہیں خواجہ صاحب کو شاعر و مصنف قرار دیا گیا ہو اور کسی بےرو نے دانستہ یا نادانستہ خواجہ کے نام کے ساتھ اس دیوان کو شہرت دی ہو - اس سے زیادہ واضح مثال کتاب ، گنج‌الاسرار ، کی ہے جو اسی عہد میں وجود میں آ کر خواجہ صاحب کے نام کے ساتھ منسوب کردی گئی ہے - اس تالیف کا ایک قدیم مخطوطہ بہ کتابت شرف‌الدین القریشی سنہ ۹۸۰ ھ کا نوشتہ میرے مجموعۂ کتب میں جو اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے موجود ہے اس کا نمبر ۳۷۸ ہے - نسخۂ ہذا کے ساتھ بعض اسناد و وصایا بھی ہیں جو خواجہ قطب‌الدین بختیار کاکی اور شیخ فریدالدین گنج شکر کی طرف سے کتاب ہذا کے تعلق میں دی گئی ہیں -

میدان جنگ میں مارا گیا - رائے پتھورا جو رات کی تاریکی میں نکل بھاگا تھا، گرفتار ہوکر لایا گیا اور قتل کردیا گیا -

یہ بیان ممکن ہے کہ پروفیسر نے فرشتہ سے نقل کیا ہو جو کہتا ہے :-
« و کھانڈےرائے حاکم دھلی و بسیارے دیگر از رایان در جنگ مغلوبہ کشتہ شدند و پتھورا در حدود سرستی گرفتار گشتہ بموجب فرمان سلطان بہ قتل رسید » -
لیکن اس جنگ کی سب سے قدیم یادداشت میں جو طبقات ناصری میں محفوظ ہے ترائن کی دونوں جنگوں میں کھانڈےرائے کی جگہ گوبندرائے کا نام ملتا ہے - پہلی جنگ میں سلطان کے نیزے کی ضرب سے اس کے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں - دوسری جنگ میں گوبند رائے کی لاش اس کے ٹوٹے دانتوں کی وجہ سے میدان میں پہچانی جاتی ہے -

بہرحال اس کھانڈےرائے کی نسبت جس کا وجود ہی مشتبہ معلوم ہوتا ہے یہ دعوی کرنا کہ اس نے سلطان (معزالدین محمد) کی فوجوں کو متواتر شکستیں دیں قطعاً ایک غیر تاریخی بیان ہے -

صفحہ ۳۳۱ — ، Khakkar ، صحیح لفظ کھوکھر ہے - قدیم تلفظ بہ تخفیف واو تھا - ہائے مخلوط فارسی میں لکھی نہیں جاتی اس لیے ککر (بہ ضم اول) لکھتے ہیں -

، Dumyak ، بہ فتح دال ہے نہ بالضم جیسا کہ پروفیسر نے لکھا ہے - سلطان معزالدین کے قاتل کھوکھر نہیں تھے بلکہ ملاحدۂ فدائی -

صفحہ ۳۳۱ — پروفیسر کا قول ہے کہ ، ایک قابل ذکر امر جو تاریخ سے معلوم ہوتا ہے اور ہماری دلچسپی کے سامان رکھتا ہے یہ ہے کہ اس زمانے میں فارسی ادیبوں اور باکمالوں کی ایک بڑی تعداد طوس نیشاپور اور غور و غزنیں سے رضاکارانہ طور پر سلطانی افواج کے ساتھ ہندستان آئی جس کے ذریعے سے فارسی بول‌چال اور شاعری کا ذوق اس ملک میں اسی معیار پر قائم رہا جو سلطان محمود کے زمانے میں پہنچ چکا تھا - ان میں سے بعض سلطانی انعام سے مالامال ہوکر اپنے وطنوں کو لوٹ گئے اور بعض اسی ملک میں آباد ہوگئے ، -

، قبل مغل فارسی ، میں ہم وقتاً فوقتاً ایرانی ادیبوں کا ذکر پڑھتے ہیں - معلوم نہیں پروفیسر کے کون سے ذرائع ہیں جن سے یہ ادبی قسم کی اطلاع انھوں نے حاصل کی ہے جن تک اور لوگوں کی رسائی نہ ہوسکی - پروفیسر کا بیان شاید درست ہو

لیکن تصدیق اور تفصیل کا محتاج ھے ۔ اس کے بغیر ھماری سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں ھے۔

صفحہ ۳۳۲ — اسی طرح قطب‌الدین ایبک کے تذکرے میں کہا ھے کہ اس نے فارسی کی سرپرستی میں اپنے آقا کی روایات کو قائم رکھا لیکن اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہیں دیا صرف بہاءالدین اوشی کی رباعی پر قطبی قدردانی کی تمام داستان ختم کردی ھے۔ شمس‌العلما اگر زرا تکلیف گوارا کرتے تو اس دور کے لیے جس پر تاریکی کا پردہ پڑا ھوا ھے کم از کم ایک دو اهل قلم کے نام بہ‌آسانی حاصل کرسکتے تھے۔ مثلاً مولانا حسن نظامی تاریخ تاج‌المآثر کے مصنف بہ ھندستان کے پہلے مورخ ھیں۔ تاج‌المآثر میں موقع بہ موقع انھوں نے اپنا کلام درج کیا ھے۔ دوسرے فخرالدین مبارک‌شاہ المعروف بہ فخر مدبر غزنوی ھیں جن کی ساری عمر ھندستان میں گزری ھے ۔ ان کی کتاب سلسلۃ الانساب قطب‌الدین کے نام پر معنون ھے۔ دیباچے میں عہد قطبی کی مختصر تاریخ حوالۂ قلم کی ھے ۔ یہ حصہ ڈاکٹر ڈینی سن‌راس نے بہ نام ' تاریخ فخرالدین مبارک‌شاہ ' طبع بھی کردیا ھے۔

صفحہ ۳۳۴ — عہد شمسی میں فارسی شعرا کے تازہ واردین کے ذیل میں پروفیسر نے ناصری اور روحانی کے دو نام دیے ھیں اور اس امر پر مصر ھیں کہ یہ ایرانی شعرا محض قدردانئ ھند کی بنا پر آتے تھے نہ بہ‌غرض سیر و تفریح ۔

پروفیسر کا دعویٰ مغلیہ عہد کے واسطے صحیح مانا جاسکتا ھے لیکن اس عہد کے واسطے غلط۔ یہ فتنۂ چنگیزی کا زمانہ ھے۔ ماوراءالنہر اور ایران پر قیامت صغریٰ گزر رھی ھے اور ان ممالک کے لوگ ان وحشیوں سے پیاری جان بچانے کے لیے ھر طرف بھاگ رھے ھیں۔ ان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد ھندستان بھی پہنچی۔ محمد عوفی صاحب لباب‌الالباب انھی پناہ گزینوں میں شامل ھے۔

صفحہ ۳۳۵ — مشہور صوفی شیخ ابوسعید ابوالخیر کا نام پروفیسر نے بالکل الٹ دیا ھے یعنی ابوالخیر ابوسعید۔ ابوسعید، خود شیخ کی کنیت ھے اور ابوالخیر ان کے والد کی کنیت ھے جو یہاں بہ‌حیثیت اسم آتی ھے دونوں ناموں کے درمیان اضافت اپنی ضروری ھے لیکن پروفیسر بالعموم یہ اضافت ترک کر دیتے ھیں جو ھر حال میں قابل اعتراض ھے۔

صفحہ ۳۳۶ — روحانی کے قصائد کے ذکر میں جو اس نے بعض قلعوں کی فتح کے موقع پر لکھے ھیں پروفیسر سے ان کی املا میں سہو سرزد ھوا ھے انھوں نے

لکھا ہے ' Mandu اور Ratanbhur رتن بھور کسی قلعے کا نام نہیں ۔ یہ نام Ranthanbhor ہے ۔ دوسرا نام منڈو عہد شمسی میں وجود میں بھی نہیں آیا تھا ۔ نویں صدی ہجری میں مالوے کے سلاطین اس کی تعمیر کرتے ہیں ۔ یہ نام دراصل منڈور Mondawr ہے جو راج پوتانہ میں جودھ پور کی بنا سے قبل اس خطۂ ملک کے راجاؤں کا دارالریاست تھا ۔

صفحہ ۳۳۶ حاشیہ ۔ میں کہا ہے کہ عطارد کا مرادف فارسی زبان میں دبیر فلک ہے جیسے منشی فلک بڑی کہتے ہیں لیکن یہ تو کنایہ ہے ۔ عطارد کی فارسی 'تیر' ہے ۔

صفحہ ۳۳۷

' یا قلم تا قرین شدم بجہاں روز من گشت چون جہان قلم

آخری مصرع میں قافیہ ہمارے خیال میں 'زبان' چاہیے ۔ 'جہان' بالکل نامناسب ہے ۔

صفحہ ۳۳۸ — تاج الدین دبیر دہلوی کے واسطے لکھتے ہیں کہ 'اس کا دادا غزنویوں کے آخری تاجدار خسرو بن ملک شاہ کے عہد میں ہندستان آیا تھا اور شاہی فوج میں شامل ہوگیا تھا ۔ نوجوان شاعر کا باپ سنہ ۵۸۰ ھ میں اس خاندان کی آمد کے بہت جلد بعد پیدا ہوا' ۔

پروفیسر نے یہ نہیں بتایا کہ خود تاج دبیر کب پیدا ہوا ۔ نہ اس جزئی اطلاع کے لیے انھوں نے کوئی حوالہ دیا ۔ غزنویوں میں کوئی ملک شاہ نہیں گزرا ۔ خسرو نام کے اس خاندان میں دو بادشاہ ہیں پہلا معزالدولہ بہرام شاہ (۵۵۵-۴۷) تاج الدولہ یا سراج الدولہ خسرو ملک (۵۸۲-۵۵ھ) ۔

دہلی سنہ ۵۸۰ھ میں پرتھی راج کے قبضے میں تھی ۔ مسلمانوں کا قبضہ اس پر سنہ ۵۸۹ ھ میں ہوتا ہے ۔ یہ فرض کرکے کہ تاج دبیر کے بزرگ فتح دہلی کے فوراً بعد آئے تو بھی سنہ ۵۹۰ھ سے قبل نہیں آسکتے ۔ اگر تاج کا باپ سنہ ۵۹۱ھ میں پیدا ہوا اور اس کی عمر کے بیسویں سال یعنی سنہ ۶۱۱ھ میں تاج پیدا ہوا تب بھی شاعری میں نام پیدا کرنے اور شمس الدین التمش کا مداح اور دبیر بننے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے ۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب سنہ ۶۲۶ھ میں خلیفۂ عباسی المستنصرباللہ (۶۴۰-۶۲۳ھ) کا سفیر التمش کے واسطے خلعت لے کر آتا ہے، تاج الدین مبارک باد میں اس موقع پر ایک قصیدہ لکھتا ہے جس کا مطلع ہے :

مژدہ عالم را ز عالم آفرین آوردہ اند
زان کہ شہ را از خلیفہ آفرین آوردہ اند

سنہ ٦١١ و سنہ ٦٢٦ میں صرف پندرہ سال کا فرق ہے - چودہ سال کی عمر میں نہ دبیر مملکت بن سکتا نہ ایسا پختہ مغز شاعر ہوسکتا کہ التمش کے سامنے قصیدہ‌خوانی کرسکے - اس لیے ہم پروفیسر کے بیان بالا کی تائید نہیں کرسکتے۔

تاج‌الدین کے اپنے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندستان میں پیدا ہوا اور ہندستان میں تربیت پائی چناں‌چہ کہتا ہے:

مولد و منشا ببین در خاک ہندستان مرا
نظم و نثرم بین کہ با آب خراسان آمدہ‌است

اسی قصیدے کے بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنا گھربار چھوڑکر ان ممالک (مراد دھلی) میں ایک مدت سے پڑا ہے مگر ابھی تک اس کو کام‌یابی نصیب نہیں ہوئی - چناں‌چہ:

سالہا شد بندہ را کز لطف ہر آزادۂ
در حریم این ممالک حصہ حرمان آمدہ‌است

خانمان بگذاشتہ بر سمت شہری رفتہ کو
از علو قدر شاہش چون قدرخان آمدہ‌است

بےخیانت ہست مقناطیس در باب ہنر
بندہ سوے این دیار از جذبۂ آن آمدہ‌است

اس بیان سے اس قدر واضح ہے کہ تاج ریزہ یقیناً دھلوی نہیں ہے - اس قصیدے کا مخاطب التمش کا وزیر نظام‌الملک قوام‌الدین جنیدی ہے -

حاشیے میں بہ‌حوالۂ سیرالسالکین ، تاج‌الدین کا نام ، تاج‌الدین شمس دبیر بتایا ہے اور کہا ہے کہ وہ نظام‌الدین اولیا کا استاد تھا -

یہاں سیرالسالکین کے مصنف نے دو مختلف شخصوں کو ایک شخص سمجھ لیا ہے - تاج‌الدین ریزہ اور شمس دبیر دو جداگانہ شخص ہیں - ان میں آخرالذکر شیخ نظام‌الدین اولیا کا استاد تھا - جب عہد بلبنی میں شمس‌الدین مستوفی‌الممالک بنایا جاتا ہے تاج‌الدین نے مبارک‌باد میں اسے لکھا:

شمسا کنون بکام دل دوستان شدی ‏ ‏ ‏ ‏ مستوفی ممالک ہندوستان شدی

صفحہ ۳۳۹ — کہتے ہیں فیروزشاہ (رکن الدین) کی تعریف میں تاج الدین کے قصیدوں کا مورخین نے ذکر کیا ہے ان میں سے جو موجود ہیں قصیدۂ ذیل کے صرف ابتدائی اشعار دیے جاتے ہیں جو فصاحت اور تاثیر کی رو سے قابل لحاظ ہیں:

مبارک باد ملک جاودانی ملک را خامہ در عہد جوانی
یمین الدولہ رکن الدین آمد درش از یمن چون رکن یمانی

پروفیسر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قصیدہ محفوظ ہے حالاں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر کے منقول عنہ منتخب التواریخ بدایونی میں بھی یہی دو شعر دیے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین جن کے پاس تاج ریزہ کے تعلق میں تمام مآخذ موجود ہیں لکھتے ہیں کہ اس قصیدے کے صرف دو شعر فرشتہ اور بدایونی اور مصنف عرفات العاشقین نے دیے ہیں یہ امر قابل افسوس ہے کہ تمام قصیدہ کسی کتاب میں نقل نہیں ہوا۔

صفحہ ۳۰۴ — شہاب مہمرہ کے ذکر میں ایک موقعے پر کہتے ہیں کہ عرفی نے ہندستان آنے پر قصائد میں شہاب کی طرز نگارش اور تخئیلی رجحان کا تتبع کیا ہے۔

یہ بیان ہمارے لیے موجب حیرت ہے۔ شہاب کا انداز، علمیت، سنگلاخ زمین اور صنعت لزوم مالایلزم و دیگر صنائع ہیں۔ یہ رنگ جو زیادہ‌تر چھٹی ساتویں صدی میں مرغوب طبائع تھا بھلا دسویں صدی میں عرفی اور اس کے معاصرین کو کیوں پسند آنے لگا نہ عرفی کے قصائد سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ شمس العلما کا یہ قول اس قدر معتبر مانا جاسکتا ہے جس قدر ان کا یہ قول "کہ عرفی نے دوسرے شعرا کی طرح قصیدے کو اپنا پیشہ نہیں بنایا نہ انعام کی تلاش میں وہ سلاطین و امرا کے درباروں کا مشتاق رہا"۔

عرفی کے قول "قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی" کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس ہوس پیشہ جماعت سے کبھی اعتزال نہ کرسکا نہ غزل کا وظیفہ اس کو راس آیا۔ اس کی شہرت کا مدار انھی قصائد پر ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی تو ہے کہ قصیدے کا لپکا اس میں اس قدر شدید تھا کہ اگر کوئی ممدوح نہ ملتا تو "قصیدہ در مدح خود گفتہ" عمل پیرا ہوتا۔ بہرحال عرفی ان سینکڑوں ایرانی شعرا میں سے ایک ہے جو قسمت آزمائی اور قدردانی کی امید میں ہندستان آتے تھے اور یہاں کے امرا کی بھٹئی کیا کرتے تھے۔

صفحہ ۳۶۳ — عمید سنّامی کی نسبت ' نوتکی ' بیان کی ہے مگر اس نام کا کوئی قصبہ معلوم نہیں۔ اس کی دوسری شکل لومک ہے بہت ممکن ہے کہ ' نوالک ' ہو۔ جس کا ذکر طبقات ناصری میں آتا ہے اور غور میں ایک قصبے کا نام ہے اس سے ' تولکی ' نسبت بنےگی لیکن پروفیسر اس کو سنّامی کیوں نہیں کہتے۔ عمید کے اشعار سے پایا جاتا ہے کہ اس کا وطن ' سنّام ' ہے۔ عرفات العاشقین میں تقی اوحدی نے (جیسا کہ ڈاکٹر اقبال حسین نے ' ہندستان کے قدیم فارسی شعرا ' میں نقل کیا ہے) اس کا مولد سنّام بتایا ہے۔

صفحہ ۳۷۰ عمید سنّامی کے مشہور قصیدے کا عنوان جس کا مطلع ہے:

من که چون سیمرغ در یک گوشه مسکن کرده‌ام
ماورای مرکز خاکی نشیمن کرده‌ام

پروفیسر نے « فی التوحید » دیا ہے۔ حالاں کہ یہ قصیدہ عمید کا مشہور حبسیہ قصیدہ ہے جو اس نے بہ حالت قید لکھا ہے۔ قصیدے میں صریح اشارے ایک برج میں قید کیے جانے اور پانو میں بیڑیاں پڑنے کے متعلق موجود ہیں۔ چناں چہ:

ره درین یک برج بی‌روزن نمودندم ولی
من بهمت ره برون از هفت روزن کرده‌ام
برج قوس است این و من خورشید سان برعالمی
نوبهاری را ز آه سرد بهمن کرده‌ام
مسند خورشید زرین تخت می‌زیبد مرا
حالی (کذا) را من تکیه بر کرسی آهن کرده‌ام
در گریبان سر فرو برد اژدهای هفت سر
تا من این مار دو سر در زیر دامن کرده‌ام
بند بیژن می‌کنندم عرض در چاه ستم
نی منیژه دیدم و نی جرم بیژن کرده‌ام
همدمانم هر یکی در شغل و من در بند حبس
حاش لله زین سخن، تنها گنه من کرده‌ام

صفحہ ۳۷۳ — بہ سلسلۂ قصائد عمید ایک قصیدے کا عنوان « در مدح سلطان سنجر » تحریر کیا ہے۔ ہمیں اچنبھا ہوا کہ عمید سنامی کے زمانے میں ایک صدی بعد

سلطان سنجر کیسے نمودار ہوگیا۔ آخر قصیدے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ وہ کسی امیر تاج الدین سنجر کی مدح میں ہے چناں چہ :

خجستہ شیر کین تاج دین حق سنجر
کہ شرزۂ فلکش ہست در شمار آہو

لیکن پروفیسر اس شعر پر غور نہ کرتے ہوے صفحہ ۳۷۶ پر کہتے ہیں: 'جس قدرت اور جدت پسندی کے ساتھ سلطان سنجر کی مدح میں یہ قصیدہ طیار ہوا ہے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

صفحہ ۷۹ — ۳۷۸ علاءالدین جہاں سوز کی دو فخریہ غزلیں دی ہیں۔ ان کے مطلعے ہیں:

جہان داند کہ من شاہ جہانم چـــراغ دودۂ عبـاسیـانم
(دیگر)
آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را آنم کہ ہست فخر ز عـدلم زمانہ را

لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر ان کو قطعات میں شامل کررہے ہیں اور قطعۂ اول کے واسطے فرماتے ہیں 'اس عہد کے نائکوں Na'iks اور مغنیوں نے تین مختلف پردوں ترکی، ہندستانی اور فارسی میں گایا' - یہ بیان میرے لیے اور بھی عجیب ہے اگر صحیح ہے تو ماننا پڑےگا کہ مسلمانوں میں ہندی موسیقی نے امیرخسرو سے بہت پہلے غزنوی دور ہی میں قبول عام کا خلعت حاصل کرلیا تھا۔ میں اس بیان پر مطمئن نہیں مگر پروفیسر طبقات ناصری کا حوالہ دیتے ہیں۔ 'نائک' کا لفظ جو بہ جنسہ پروفیسر نے استعمال کیا ہے، معلوم نہیں اسے ہندی مانا ہے یا فارسی؟ نائک ہندی میں استاد و امام موسیقی ہے۔ فارسی میں نائی بہ معنی نےنواز ہے۔ کاف تصغیر کے اضافے سے نائیک واحد میں آتا ہے لیکن بہ حالت جمع سراسر تکلف ہے۔

عضدالدولہ شیرزاد فرزند علاءالدین مسعود (۴۹۲-۵۰۹ھ) جب والئ لاہور تھا۔ مسعود سعد سلمان نے اس عہد کے درباریوں اور مغنیوں کا ایک خاکہ اپنی مختصر مثنوی میں یادگار چھوڑا ہے جو دیوان میں موجود ہے۔ عضدالدولہ کے درباری حالاں کہ ہندستان میں موجود ہیں دن رات ہندووں سے تعلق میں آتے ہیں لیکن مسعود سعد سلمان جو ہندی میں بھی صاحب دیوان بتائے جاتے ہیں عضدالدولہ کے دربار میں ہندی موسیقی کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کرتے۔

۔شمس العلما نے علاءالدین جہاں سوز اور اس کی شاعری کا ذکر « غوریوں اور غلاموں کے دور میں ہندستان کی فارسی شاعری کی خصوصیات » کے زیر عنوان درج کیا ہے۔ ایسا کرنے میں ہم سمجھتے ہیں وہ تقدیم و تاخیر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں سوز کا ذکر ہندستان کی فارسی شاعری کے مذکور میں ہر جگہ ناموزوں ہے۔ نہ وہ ہندستانی ہے نہ ہندستان میں رہا نہ ممالک غور شامل ہندستان ہیں۔ جب ہندستان کے ساتھ اس کو دور کا تعلق بھی نہیں تو پھر اس کا ذکر ہندستان کے شعرا میں کیوں لایا جائے۔

دوبارہ غور کرنے پر ایک بات ذہن میں آئی کہ شمس العلما کے زعم میں شاہد عمید اور جہاں سوز ایک ہی زمانے میں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ عمید بھی سلطان سنجر کی تعریف میں قصیدہ لکھ رہا ہے اور علاءالدین جہاں سوز بھی سلطان سنجر کی شان میں رباعیاں لکھ رہا ہے اس لیے قدرتاً یہی نتیجہ نکالا کہ دونوں معاصر ہیں۔ اس لیے دونوں کا تذکرہ ایک ہی جگہ یکے بعد دیگرے تتھی کردیا :

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

صفحہ ۳۸۱ — پانچویں باب کا عنوان ہے : « خلجیوں، تغلقوں اور خاندان غلامان کے آخری تین سلاطین، سلطان معزالدین کیقباد اور بلبنوں کے دور میں فارسی ادب کی حالت »۔

گھوڑے کو گاڑی کے آگے رکھنا اگر صحیح طریقہ ہے تو اس جملے میں شمس العلما نے گاڑی گھوڑے سے آگے کھڑی کردی ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ انھوں نے خاندان غلامان کا ذکر خلجیوں اور تغلقوں سے بعد کیا ہے۔ یہی جملہ اسی ترتیب سے پروفیسر باب ماسبق میں دوہرا چکے ہیں اور دوبارہ متن میں لارہے ہیں۔ اس سے ناظرین کتاب کے ذہن میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہی نہیں انھوں نے معزالدین کیقباد (۶۸۶-۶۸۹) کو جو پوتا ہے پہلے جگہ دی ہے اور بلبن (۶۶۴-۶۸۶ھ) کا جو دادا ہے بعد میں مذکور لائے۔ مزید براں بلبن کو ہر جگہ جمع کی صورت میں لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک سے زیادہ بلبن ہیں۔ بہرحال تاریخی ترتسب سے یہ کج روی قابل اعتراض ہے۔

صفحہ ۳۸۲ ' خسرو ایٹہ والے '۔ امیرخسرو کا ایٹہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ پٹیالی میں پیدا ہوے۔ پٹیالی اگر آج ضلع ایٹہ میں شامل ہوگئی تو لازم نہیں

آنا کہ امیرخسرو کی نسبت بھی بدل دی جاے - خسرو کی تعلیم و تربیت دهلی میں هوئی اور دهلی هی میں تمام عمر بسر کی چناںچہ دهلوی کہلاتے بھی هیں- اس نسبت کے هوتے هوے ان کو ایٹہ والے کہنا بالکل نامناسب معلوم هوتا هے -

صفحہ ۳۸۴ —کہتے هیں۔ "خسرو کے والد سیف‌الدین محمود اپنے وطن موضع کیش واقع ترکستان سے چنگیزخاں اور اس کی تباہ کاریوں کے خوف سے بھاگ کر سلطان ناصرالدین محمود خلف التمش کے ابتدائی عهد میں هندستان آکر موضع پٹیالی تحصیل ایٹہ میں آباد هوگئے -

چنگیزخاں سنہ ۶۲۴ ھ میں فوت هوتا هے - ناصرالدین محمود سنہ ۶۴۴ سے سنہ ۶۶۴ ھ تک سلطنت کرتا هے اس لیے اگر سیف‌الدین اپنے هم‌نام ناصرالدین کے عهد میں آے تو یہ چنگیز کے عهد سے بہت بعد کا زمانہ هے - نہ چنگیز خاں کا زمانہ -

صفحہ ۳۸۴ —کہتے هیں خسرو کے والد نے مشہور خوش‌نویس مولانا سعدالدین خطاط کو ان کا استاد مقرر کیا جو خسرو کو نستعلیق اور شکستہ خطوں کی تعلیم دیتے تھے -

پروفیسر نے خسرو کے حالات کے ماخذ میں دیباچۂ غرۃالکمال و دیباچۂ تحفۃالصغر، شعرالعجم و فهرست کتب فارسیہ از ریو کا نام لیا هے لیکن یہ معلوم نہ‌هوسکا کہ اس خاص بیان کے واسطے وہ کون‌سی کتاب کے منت‌پزیر هیں - بہرحال همارا اعتراض یہ هے کہ خسرو طفلی کے زمانے میں جب ان کی عمر سات آٹھ سال کی هوگی یعنی سنہ ۶۶۰ ھ کے قریب خط نستعلیق و خط شکستہ دنیا کے پردے پر موجود نہیں تھے - نستعلیق کے موجد، جس کو نسخ اور تعلیق سے مرکب بتایا جاتا هے، مولانا میرعلی بن الیاس‌الطبّاخ تبریزی هیں جو امیرتیمور کے عهد میں گزرے هیں- مولانا سلطان علی مشهدی نے اپنے رسالۂ آداب‌الخط (تالیف سنہ ۹۲۰ ھ) میں نستعلیق کے تین اساتذہ کے نام گنائے هیں - اول یہی مولانا میرعلی تبریزی جنھوں نے سنہ ۷۹۸ ھ میں خواجوے کرمانی کی مثنوی کمال نامے کی جو برٹش میوزیم میں محفوظ هے کتابت کی هے - دوسرے مولانا جعفر جن کو میرعلی موصوف کا شاگرد کہتے هیں - تیسرے مولانا اظهر تبریزی، انھوں نے سنہ ۸۷۷ ھ میں خمسۂ نظامی و خمسۂ خسرو کی کتابت کی هے - یہ نسخہ راقم کے کتاب خانے کی زینت رہا هے - هندستان میں نستعلیق کا رواج غالباً نویں صدی هجری سے شروع هوجاتا هے - میرے

کتب‌خانے میں اس کے بعض قدیم نمونے موجود ہیں مگر بدقسمتی سے بے‌تاریخ ہیں۔ سب سے قدیم تاریخ والا نسخہ صلٰوۃ مسعودی ہے جو سنہ ۸۶۰ھ کا نوشتہ ہے۔ یہ خط اگرچہ نستعلیق ہے لیکن نہایت ابتدائی حالت میں ہے۔ بہر حال ساتویں صدی ہجری کے وسط میں خط نستعلیق کا رواج ہندستان میں من قبیل محالات ہے۔

وہ خط جس کو ہم شکستہ کہنے کے عادی ہیں شاہ‌جہاں کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا بانی کفایت‌خاں ہے۔ اس لحاظ سے یہ خط کفایت‌خانی کہلایا۔ اس کے فرزند درایت‌خاں نے اس کو اور زیادہ پیچ‌دار اور مشکل بنادیا جو خط درایت‌خانی کہلایا۔ انھی خطوں کی بگڑی شکل بعد میں خط شکستہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ امیر خسرو کے عہد میں خط شکستہ کے وجود کا دعوٰی کرنا تاریخ سے بے‌خبری کا ثبوت دینا ہے۔

صفحہ ۳۸۵ — کہتے ہیں کہ خسرو نے ماں کی گود ہی سے شاعری شروع کردی تھی۔ اس دعوے کے ثبوت میں ذیلی حاشیے میں خسرو کا فقرۂ ذیل نقل کیا ہے:

«در ان صغر سن کہ دندان می‌افتاد سخن می‌گفتم و گوہر از دہانم می‌ریخت»
(دیباچۂ غرۃ‌الکمال)

حضرت امیر کا تو یہ مطلب ہے کہ جب ان کے دودھ کے دانت ٹوٹنے لگے تھے اس وقت سے انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں بچوں کے دانت گرتے ہیں۔ اس عمر میں ذہین اور طبّاع بچوں کے لیے شعر کہنا بالکل ممکن ہے نہ ماں کی گود میں۔

صفحہ ۳۸۹ — امیرخسرو کی تصنیفات اور ان پر تبصرے کے ضمن میں ایک مثنوی کا نام تاج‌الفتوح دیا ہے جو جلال‌الدین فیروزشاہ کے جلوس کے سال میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی کا نمبر بارھواں ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے امیرخسرو نے تاج‌الفتوح نام کی کوئی مثنوی نہیں لکھی لیکن جلال‌الدین فیروز کی تاج پوشی اور اس کے دیگر حالات کے مذکور میں جو مثنوی انھوں نے لکھی اس کا نام مفتاح‌الفتوح ہے۔ یہ مثنوی اورینٹیل کالج میگزین میں غرۃ‌الکمال کے ایک نہایت قدیم نسخے سے جو یقیناً حضرت مصنف کے عہد کا نوشتہ ہے عزیزم یاسین‌خاں نیازی نے چھاپ دی ہے (دیکھو میگزین مذکور بابت ماہ مئی و ماہ اگست سنہ ۱۹۳۶ع)

صفحہ ۳۹۷ — ضیاء برنی کی روایت سے کہتے ہیں کہ "شاہی دربار کے ایک معاصر شاعر خواجہ سنائی نے خسرو کی شان میں یہ شعر کہا ہے:

بخدا ار بزیر چرخ کبود ہمچو او ہست و بود و خواہد بود

اور توضیح کی غرض سے حاشیے میں اضافہ کیا ہے کہ "یہ مشہور خواجہ حکیم سنائی سے جو غزنوی دور میں گزرے ہیں مختلف ہیں۔

یک نہ شد دو شد ۔ شمس العلما نے بہ یک جنبش قلم ایک سنائی کے دو سنائی تراش دیے۔ مگر شعر بالا حکیم سنائی غزنوی متوفی سنہ ۵۴۷ھ کی معروف مثنوی حدیقۃالحقائق میں موجود ہے جو غالباً سنائی نے اپنے متعلق کہا ہے۔ برنی نے مناسب موقع سمجھ کر اسی شعر کو خسرو کے حق میں نقل کردیا ۔ اکثر مورخ دیگر اساتذہ کے اشعار اپنی تالیف میں نقل کرتے آے ہیں - بہر حال پروفیسر کا یہ نظریہ کہ سنائی تخلص کے دو شاعر ہیں پہلا غزنوی اور دوسرا خسرو کا معاصر ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے ۔

صفحہ ۳۹۱ — معلوم ہوتا ہے شمس العلما امیر خسرو کے باقی کلام پر تبصرہ کرنے سے گھبرا گئے لہذا باقی کتابوں کے صرف نام ایک فقرے میں گنا کر آگے بڑھ گئے وہ نام یہ ہیں:

(۱) تغلق نامہ (۲) مفتاح الفتوح (۳) افضل الفوائد (۴) خزائن الفتوح (۵) تاریخ دہلی ۔

ان میں سے تغلق نامہ جس کا صرف ایک نسخہ مملوکۂ نواب صدر یار جنگ معلوم تھا محترمی سید ہاشمی نے انجمن مخطوطات فارسی حیدرآباد کے واسطے بڑی قابلیت کے ساتھ مرتب کرکے چھاپ دیا ہے ۔ نمبر چہارم خزائن الفتوح انجمن سلطانیہ (مرحوم) علی گڑھ کی طرف سے سنہ ۱۹۲۷ع میں طبع ہوچکی ہے اگرچہ بےانتہا غلط چھپی ہے ۔ پروفیسر حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خزائن الفتوح کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کردیا ہے لیکن سخت غلط ۔

تاریخ دہلی ۔ یقیناً امیر کی تصنیف نہیں نہ کسی نے امیر کے تعلق میں اس کا تالیف کا ذکر کیا ۔

صفحہ ۴۰۰ — خان شہید کے ساتھ تاتاریوں کی جنگ کا موقع بہ حوالۂ برنی دیپالپور اور لاہور کے وسط میں کہیں بتایا ہے اور ان کے سردار کا نام تیمور خان تاتار لکھا ہے۔

لیکن امیرخسرو دہلوی اور حسن دہلوی جو اس جنگ میں موجود تھے اپنے اپنے مرثیوں میں جن کی نقلیں پروفیسر نے اپنی تالیف میں درج بھی کی ہیں صاف بیان دیتے ہیں کہ یہ جنگ دریاے لاہور پر ہوئی ہے ۔ چناں‌چہ خسرو خان‌شہید کے تعلق میں لکھتے ہیں :

بک‌کشش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد　　یعنی اندر عہد من کافر تواند سرکشید
(صفحہ ۴۰۳)

لڑائی دریاے راوی کے کنارے پر ہوئی تھی بالکل واضح ہے ۔ خسرو کہتے ہیں کہ کافروں نے دریا پار کرکے مقابلہ کیا

آں چہ ساعت بد کہ کافر برسرش لشکر کشید
جوق جوق از آب بگزشتند و تاگہ در رسید　　(صفحہ ۴۰۳)

حسن دہلوی بھی خان‌شہید کے مرثیے میں خسرو کے ہم‌زبان ہیں ۔ لکھتے ہیں :

« و بیک فرسنگی آں ملاعین پیش باز آمدہ موضع مصاف در حدود باغ سرپر بر کرانۂ آب لاہور اختیار کرد چناں‌چہ متصل آب دیہی بزرگ بود آں را حصن حصین ساخت (صفحہ ۴۳۰)

« و کفار تتار علیہم‌الخذلان والخسران از آب لہاور عبرہ کردند و مقابل صف اسلامیان درآمدند (صفحہ ۴۳۱)

تاتاریوں کے سردار کا نام تیمور نہیں ہے بلکہ ایتمر ہے جیسا کہ حسن دہلوی نے اپنے مرثیے میں تحریر کیا ہے :

در بر راے مشکل‌کشاے عرض داشتند کہ ایتمر با تمامی لشکر بہ سہ فرسنگی فرود آمدہ است » (صفحہ ۴۳۰)

برنی نے یہ نام بہ تخفیف یا ‹ اتمر › قلم بند کیا ہے :

درمیان لوہور و دیوپال‌پور بہ اتمر ملعون...... محاربہ و مقاتلہ افتاد » (صفحہ ۴۰۰) ۔

چوں‌کہ ‹ اتمر › کا الف باے جارہ کے ساتھ ملا کر لکھا گیا یعنی ‹ باتمر › پروفیسر نے الف کو متحرک پڑھنے کے بجاے ساکن پڑھا اور ت کو متحرک کردیا چناں‌چہ قدرتاً تمر یا تیمور ہوگیا ۔

صفحہ ۴۱۴ — کہتے ہیں کہ خان‌شہید کی شہادت کے بعد امیرخسرو کچھ سال تک ملک امیرعلی کے پاس رہے جو غیاث‌الدین بلبن کا درباری امیر تھا ۔ وہ عام طور پر حاتم‌خاں کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا کیوں‌کہ شعرا کے حق میں حاتم کی

طرح فیاض تھا خسرو نے اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے اور ایک منظوم اسپ‌نامہ بھی اس کے واسطے تالیف کیا وغیرہ۔

یہ بیان ہمیں الجھن میں ڈال رہا ہے۔ خان‌شہید یوم جمعہ سلخ ذیقعدہ سنہ ۶۸۳ھ کو غروب آفتاب کے وقت شہادت پاتا ہے:

جمعہ بود و سلخ ذیحجّہ کہ بود آن کارزار — آخر ہشتاد و سہ آغاز ہشتاد و چہار

دوسرے دن سنہ ۶۸۴ھ شروع ہوتا ہے۔ خسرو گرفتار ہوتے ہیں اور دو سال بلخ میں گزارتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔ یہ مدت ہمیں سنہ ۶۸۶ھ تک پہنچا دیتی ہے جو غیاث‌الدین بلبن اور معزالدین کیقباد کی تخت‌نشینی کا سال ہے۔ کیقباد انہیں بلاتا ہے مگر ملک اختیارالدین وزیر کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے خسرو دربار میں نہیں جاتے اور خان‌جہاں کے ساتھ اودھ چلے جاتے ہیں جو اس صوبے کا والی تھا۔ تعجب یہ ہے کہ خسرو اسی خان‌جہاں کو حاتم کا خطاب دیتے ہیں: خان‌جہاں حاتم مفلس نواز — دو سال اس کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اس وقت تک سنہ ۶۸۸ھ شروع ہوگیا ہے یا ہونے والا ہے۔ اسی سال ربیع‌الاول کی کسی تاریخ سے وہ قران‌السعدین کی تصنیف پر بہ حکم کیقباد مصروف ہیں اور رمضان میں ختم کردیتے ہیں۔

اس بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ امیرخسرو کو اس ملک امیرعلی کے پاس جس کا نام بھی زمانۂ حا۔ نا سا ہے جانے اور کچھ سال گزارنے کے لیے موقع نہیں مل سکتا۔ پروفیسر نے خسرو کی قید کے زمانے کو محسوب نہیں کیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ پروفیسر کے ماخذ شعرالعجم میں ملک امیرعلی کا اس موقع پر کوئی تذکرہ نہیں آیا۔

صفحہ ۴۱۷ — کہتے ہیں کہ جلال‌الدین خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو علاءالدین کی ملازمت میں آ گئے۔ انھوں نے اس کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے اور ایک مثنوی جس کا نام خزائن‌الفتوح ہے اس کی جنگوں اور فتوحات کے بیان میں لکھی۔

کئی قصیدے کیسے؟ علاءالدین (۶۹۵-۷۱۵ھ) کا زمانہ خسرو کی تالیفی زندگی کا خوش‌ترین و بہترین زمانہ ہے۔ ان کی اکثر تصنیفات اس عہد میں ختم ہوتی ہیں۔ خمسے کی پانچوں مثنویاں۔ دول رانی خضرخان۔ خزائن‌الفتوح اور

کم از کم دو دیوان غرۃالکمال وغیرہ اسی عہد میں تیار ہوتے ہیں ۔ اعجاز خسروی کا بڑا حصہ اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ قصائد و غزلیات تو بےشمار ہیں ۔

خزائن‌الفتوح مثنوی نہیں ہے بلکہ نثری تالیف ہے ۔ اس میں علاءالدین کی جنگوں اور اقتصادی اصطلاحات کے مختصر ذکر کے علاوہ دکن کی مہموں کا کسی قدر مفصل بیان ہے ۔ خسرو کی نثر خاص قسم کی ہوتی ہے جس کے وہ خود ہی موجد ہیں ۔ خزائن‌الفتوح سنہ ۷۰۹ ھ میں ختم ہوئی ۔

صفحہ ۴۱۷ — یہاں خسرو کے خطابات کی تفصیل دی ہے اور خطاب دینے والوں کے نام گنائے ہیں مثلاً ,طوطئ ہند، کے واسطے کہا ہے کہ یہ خطاب اہل ہند نے دیا اور ایرانیوں نے اس کی تائید کی ۔ خواجہ حافظ، شہاب معمائی اور عرفی نے اسی نام سے انھیں یاد کیا ہے ۔ ثبوت میں حافظ کا یہ شعر دیا ہے :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند　　　زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می‌رود

اس شعر میں خسرو کی طرف اشارہ ہمارے نزدیک بعید از قیاس ہے البتہ شعراء ہندستان مراد ہوسکتی ہے ۔ لیکن یہ کہنا کہ ,طوطیان ہند، سے مقصد امیر خسرو ہیں، صریح زبردستی ہے ۔

ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ ,طوطئ ہند، کا خطاب خسرو کو کسی نے نہیں دیا بلکہ خود انھوں نے اختیار کیا ہے ۔ چناں‌چہ فرماتے ہیں :

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی　　　ز من ہندوی پرس تا نغز گویم
(دیباچۂ غرۃالکمال)

صفحہ ۴۱۹ — کہتے ہیں کہ ,امیر خسرو نے مطلع‌الانوار کی طرح اپنے دیوان غرۃالکمال کو جو مجموعۂ قصائد و غزلیات ہے صرف پندرہ روز میں تیار کیا تھا،۔

یہ بیان ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے ۔ غرۃالکمال ایک ضخیم چیز ہے ۔ اس کے صفحات پانسو سات سو کے قریب ہوں گے ۔ کاتب پندرہ روز میں تو اس کی کتابت بھی نہیں کرسکتا ۔ اس کے علاوہ جہاں تک مجھے یاد ہے غرۃالکمال میں معزالدین کیقباد (۸۶—۶۸۹ ھ)، جلال‌الدین فیروزشاہ (۸۹—۶۹۵ ھ) اور علاءالدین محمد شاہ (۶۹۵—۷۱۵ ھ) کے مدحیہ قصائد شامل ہیں ۔ یہ قصائد خاص‌خاص موقعوں پر لکھے گئے ہوں گے ۔ یہی حالت غزلیات کی ہے ۔ ان سب کی فراہمی کے واسطے

ایک مدت درکار ہے ۔ لہذا یہ کہنا کہ غرۃالکمال امیر نے پندرہ روز میں تیار کرلیا ہمارے اعتقاد کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے ۔

شمس‌العلما نے بھی بیان صفحہ ۳۸۸ پر غرۃالکمال کی صراحت کے وقت دوہرایا ہے ۔ وہاں میں سہو قلم سمجھ کر چھوڑ آیا تھا ۔

صفحہ ۲۲-۴۲۰ — خسرو کے ہندی کلام کے سلسلے میں تقی‌اوحدی اور اس کے مقلدین کے مبالغہ آمیز اقوال سے انکار کرنے میں میں شمس‌العلما کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ امیر نے ہندی میں کچھ نہیں لکھا ۔ ہندی موسیقی کے ساتھ ان کا عالمانہ تبحر، ہندی اور ایرانی موسیقی کے ملاپ سے ان کا نئے راگ تیار کرنا ثابت کرتا ہے کہ ہندی میں ان کو کافی مہارت ہوگی ۔ خود امیر نے کسی موقع پر کہا ہے :

من ہم قدرے درپئے این کار شدم

'این کار' سے مقصد ہندی گوئی ہے ۔ پروفیسر اگر نہ مانیں تو اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ امیر نے دیباچۂ غرۃالکمال میں صاف فرمایا ہے کہ :

"جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستان کردہ شدہ است این جا اسم بذکرے پیش کردم" ۔

جس سے ثابت ہے کہ غرۃالکمال کی تصنیف کے وقت وہ چند جزو ہندی میں لکھ چکے تھے ۔

صفحہ ۴۲۲ — 'خواجہ حسن سنجری دہلوی' پروفیسر نے جس طرح خواجہ معین‌الدین چشتی کو سنجری بنا دیا ہے اسی طرح امیر حسن دہلوی کو بھی سنجری مان لیا ہے اور پروفیسر بھی کیا کریں فارسی سے عدم مزاولت کی بنا پر ہمارے ہاں جاہل کاتب پیدا ہورہے ہیں اور ان کی جدت کا ایک کارنامہ تو یہی ہے کہ 'سجزی' کا سنجری اور نخشبی کا بخشی بنادیا یہ غلطی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان و قلم سے بھی سنجری ٹپک جاتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ نہ جاننے والے اپنی غلطی پر ضد اور اصرار کرنے لگتے ہیں اور خود کو سچا سمجھتے ہیں ۔ ہمارے شمس‌العلما کی بھی یہی حالت ہے وہ ان دونوں بزرگوں کی نسبت میں صحیح سجزی ترک کرکے غلط سنجری کی حمایت کررہے ہیں ۔ انھوں نے حسن کے تعلق میں جس قدر شواہد پیش کیے ہیں سب جگہ سجزی کی تصحیف سے سنجری بن گیا ہے ۔ ان کا یہ خیال کہ حسن دہلوی کے اسلاف میں کوئی شخص سلطان سنجر سلجوقی

کی ملازمت میں کسی بڑے عہدے پر ممتاز ہوگا، اس وجہ سے خاندانی اعزاز کے واسطے اس کی اولاد نے یہ نسبت امتیازاً اپنے نام کے ساتھ لگالی ۔ یہ عقیدہ مجموعۂ تذکار کے بیان پر مبنی ہے جس کے الفاظ جس طرح کہ پروفیسر نے نقل کیے ہیں یوں ہیں :—

«گویند لقب وے امیر از قدیم است کہ اجدادش در عہد سلطان سنجر سلجوقی از این نسبت ممتاز بودہ‌اند» (صفحہ ۴۲۴) ۔

مصنف مجموعۂ تذکار کا مقصد ‹امیر› کے لفظ سے ہے جو ان کے نام کے ساتھ ہے نہ سنجری سے ۔ بہرحال نہ امیر خاندانی خطاب ہوسکتا ہے نہ سنجری ۔ امیرحسن کو امیر کا خطاب دینے والے سلاطین ہند ہیں اور کوئی عجب نہیں اگر جلال‌الدین خلجی نے حسن اور خسرو کو ساتھ ہی یہ خطاب عطا کیا ہو ۔ سنجری اور سجزی کی بحث کے متعلق بہترین مدارعلیہ قدیم مخطوطات ہیں اور ہم پروفیسر صاحب سے درخواست کریں گے کہ ان الفاظ کی صحت کے واسطے ان مخطوطات کو دیکھیں ۔

صفحہ ۴۲۶ — امیرحسن کے دیباچے کی عبارت حاشیہ :— «و معاملۂ این مصالح را قد لکے پیدا شد» ‹قد لکے› کی جگہ ‹فدا لکے› چاہیے ۔

صفحہ ۴۶۴ — برنی کی عبارت حاشیہ :— «تا روزی در اثنائے سواری کذا غازی بچہ مہپارہ» میں ‹گدا غازی بچۂ مہپارہ› مناسب ہے ۔

صفحہ ۴۶۸ — برنی کی عبارت حاشیہ :— «و سلطان را از شوخی آن رہ دیدگان» میں ‹زہ دیدگان› چاہیے ۔

صفحہ ۴۷۵ — کہتے ہیں ۔ ضیاء برنی کے تعلقات امیر خسرو اور خواجہ حسن کے ساتھ نہایت دوستانہ تھے اور آخر تک پائدار رہے بلکہ یہ برنی ہے جو ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا اور دونوں بہ وجہ ذوق مشترک یعنی شاعری اس کے ساتھ بڑی محبت رکھتے اور عزت سے پیش آتے ۔ یہ اتحاد اس قدر زبردست تھا کہ تینوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے جدائی گوارا نہ کرتا اور نہ ان کی غیرحاضری میں خوش نظر آتا ۔

یہ بیان اگرچہ بڑی حد تک برنی کے اپنے بیان پر مبنی ہے ہمارے خیال میں محل نظر ہے ۔ برنی کے ساتھ خسرو اور حسن کے روابط ان کی عمروں کا فرق دیکھتے ہوئے اتنے گہرے نہیں ہوسکتے ۔ جب برنی پیدا ہوتا ہے، دونوں بزرگ بتیس تینتیس سال اپنی عمر گزار چکے ہیں ۔ عمروں کا یہ تفاوت بجائے خود اس گہرے ارتباط کا

مانع ہے جس کا برنی مدعی ہے ۔ خسرو کے انتقال کے وقت برنی مشکل سے چالیس سال کا ہوگا ۔ شاہی ملازمت میں اگر اس کو کوئی عروج ملا تو وہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ملا ہے اس وقت تک خسرو وفات پاچکے ہیں ۔ رہا ذوق شعر جس کو شمس العلما تینوں میں قدر مشترک مانتے ہیں ۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ شمس العلما پہلے شخص ہیں جو برنی کو شاعر بیان کرتے ہیں اس کی شہرت بہ حیثیت مورخ ہے نہ بہ حیثیت شاعر ۔ برنی کے اس بیان کو بھی ہم مشتبہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا ہے ۔ کیا یہ دو بلند پایہ شاعر جن کی عمر کا اکثر حصہ دہلی میں بسر ہوتا ہے جہاں انہیں سینکڑوں مواقع ملنے جلنے کے میسر ہوسکتے تھے اور دونوں خان شہید کی خدمت میں برسوں ملازم بھی رہے ، برنی کے زمانے تک ایک دوسرے سے ناواقف رہے ہمارے خیال میں ناقابل یقین ہے ۔ برنی کا بیان میرے سامنے نہیں ہے مگر میں سمجھتا ہوں اس کا مطلب جو شمس العلما سمجھے ہیں اس سے مختلف ہے یعنی برنی کے ذریعے سے ان میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے ورنہ ان بزرگوں کے سامنے برنی کی حیثیت خورد اور شاگرد کی سی ہوسکتی ہے ۔

صفحہ ۴۷۵ — کہتے ہیں ۔ "شاعری میں برنی کے پایے کا اندازہ اس کے کلام بالخصوص قصائد، قطعات، رباعیات و مراثی سے ہوسکتا ہے جو ہم تک پہنچے ہیں ۔ بعض کے نمونے درج ہیں ۔

شمس العلما نے کل چھے مختلف نمونے دیے ہیں جن میں تیئیس شعر ہیں ۔ ان میں سے میں تین آخری نمونوں سے یہاں بحث کرتا ہوں ۔ ان نمونوں پر میں نے کتاب میں ترتیب کے مطابق ہندسۂ شمار ڈال دیا ہے ۔

(۴) صفحہ ۴۷۶ — "اس نے متعدد قصائد اپنے سرپرستوں کے اعزاز میں لکھے ہیں جن کے نمونے اس کی تاریخ اور دیگر تاریخی مصنفات میں محفوظ ہیں ۔ ان میں سے ایک سلطان فیروزشاہ کی مہم شکار کے وقت خاص شکارگاہ میں پڑھا گیا تھا ۔ ان اشعار کا بعد میں بھی چرچا رہتا جب کبھی بادشاہ شکار پر جاتے :

پیش تیرش آھوان را از پئے رد و قبول
شیر گردد خون ز بیم و خون شود شیر از رجا
پیش پیکان دو شاخش از برای سجدہ را
شیر چون شاخ گوزنان پشت را سازد دو تا

می‌شنیدم کز نهیب ترس این شیر زمین
شیر گردون را اغثنا یا غیاث آمد ندا

ان اشعار سے قبل پروفیسر کی عبارت حالی نہیں بلکہ خیالی تصور ہونی چاہیے جو زیادہ‌تر اس گمان میں لکھی گئی ہے کہ ان کا قائل برنی ہے - حقیقت میں یہ اشعار خاقانی شروانی کے ایک قصیدے سے ہیں جو اس نے خاقان کبیر منوچہر شروان‌شاہ کے شکار کے بیان میں لکھا تھا۔ اس کا مطلع ہے:

از سر زلف تو بوی سر بمهر آمد بما
جان به استقبال شد کای مهد جانها تا کجا

(قصائد خاقانی، جلد اول صفحہ ۶۳ نول‌کشور)

دوسرے شعر میں 'سازد' کی جگہ 'کردے' صحیح ہے۔

(۵) صفحہ ۴۷۷ -- کہتے ہیں اس کے مرثیے اور بھی زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں - جو مرثیہ اس نے اپنے مربی سلطان محمدتغلق کی وفات پر لکھا ہے سوز و درد، آمد اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت غیر معمولی ہے۔ اس کا کچھ حصہ جو یہاں نقل ہوتا ہے محفوظ ہے:

سر الپ‌ارسلان بینی ز رفعت رفته بر گردون
بمرد اما به خاک اندر تن الپ‌ارسلان بینی
امیرانی که بر قصرش هزاران پاسبان بودی
کنون برقبهٔ گورش کلاغان پاسبان بینی

یہ ابیات نہ برنی کے ہیں نہ کسی کے مرثیے میں لکھے گئے - حکیم سنای غزنوی ان کے مالک ہیں اور ان کے نہایت مشہور قصیدے سے جو پند و عبرت پر لکھا گیا ہے تعلق رکھتے ہیں (اس قصیدے کے لیے ملاحظہ ہو کلیات سنای صفحہ ۱۱۲ طبع طہران)۔ ضیاء برنی کا قصور اتنا ہے کہ اس نے محمد بن تغلق کی وفات کے بیان میں مناسب سمجھ‌کر نقل کردیا۔ باقی امور شمس‌العلما کے سرسبز تخیل کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔

(۶) صفحہ ۴۷۸

مایه زهر است شرب عالم را — میوه مرگست تخم آدم را
ای حریف عدم قدم درنه — کم زن این عالم کم از کم را

صبح محشر دمید ما را خواب بانگ زن خفتگان عالم را
رستخیز است خیز باز شکاف سقف ایوان طاق طارم را
شہ محمد بخفت در دل خاک نیلگون کن لباس ماتم را
بس بدست خروش بر تن دہر خاک زن این قبای معلم را

یہ اشعار بھی خاقانی کے ہیں اور کلیات خاقانی (جلد اول صفحہ ۵۶۲) میں ملتے ہیں۔ قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ برنی کی تاریخ میں ان کا ایراد ہوا اس لیے یہ قرینہ کہ وہ اسی مورخ کے شعر ہوں گے ہمیں کعبے سے ترکستان لے جائےگا۔ برنی کے واسطے شاعری کا دعویٰ ہمارے نزدیک ناقابل یقین ہے۔ نہ کسی نے اس کو شاعر مانا نہ شاعر کی حیثیت سے کبھی اس کا ذکر آیا۔ پروفیسر پہلے شخص ہیں جو اس کی شاعری کی داستان ہمیں سناتے ہیں۔

ایک امر قابل گزارش ہے۔ برنی کے دور میں ضیاء نام کے تین شخص مشہور ہیں۔ پہلا یہی ضیاء برنی۔ دوسرا ضیاء سنامی جو نصاب الاحتساب کا مصنف ہے۔ تیسرا ضیاء نخشبی جو زبردست نثار ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہے۔ اس کا طوطی‌نامہ نہایت مشہور اور مقبول ہے اور درس نظامیہ میں شامل رہا ہے۔ گل‌ریز نخشبی تصوف میں اس کی ایک اور تالیف ہے۔ ممکن ہے کہ پروفسر نے ناموں کی مماثلت کی وجہ سے برنی کو نخشبی سمجھ لیا ہو۔

صفحہ ۴۸۳ -- کہتے ہیں، تاج‌الدین سنگ‌ریزہ ایک خراسانی شاعر جو بہ زمانۂ طفولیت سلطان شمس‌الدین التمش کے دور میں ہندستان آیا ایک قصیدے میں کہتا ہے:

خیز از مئے قدیم مرا سیر کن بہ رطل
بگزر ازین حدیث کہ یک سیر و یک من است

فارسی شعرا کی زبان پر ہندی اثر دکھانے کی غرض سے یہ شعر لایا گیا ہے جس میں سیر اور من ہندی الفاظ ہیں۔ یہ بجائے خود درست ہے لیکن اس موقع پر پروفیسر ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہوے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک دور شمسی میں دو تاج‌الدین ہیں۔ پہلا تاج‌الدین دبیر دہلوی مذکورۂ صفحہ ۳۳۸۔ جس کا دادا سنہ ۵۸۰ھ میں دہلی آیا اور جس کا باپ عنقریب بعد پیدا ہوا۔ دوسرا تاج‌الدین سنگ‌ریزہ شاعر خراسان جو بہ‌عہد شمس‌الدین ہندستان آیا۔ یک نشد دو شد۔ ہمارے خیال میں تاج‌الدین دبیر یا تاج ریزہ یا تاج سنگ‌ریزہ ایک ہی شخص ہے فرہنگ‌نامۂ قواس میں اس کو تاج دبیر عرف ریزہ کہا ہے۔ وہ رشید و طواط کا جواب ہے جس کا قامت نہایت

مختصر تھا۔ تاج بھی اپنی کوتاہ قامتی کی بنا پر سنگ‌ریزہ یا ریزہ کہلاتا تھا۔ وہ ایرانی نہیں ہے بلکہ ہندستانی جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کے اپنے شعر سے ثابت ہوچکا ہے۔ اکثر تذکرہ‌نگار اس کو تاج ریزہ لکھتے ہیں، لیکن سیرالعارفین میں جمالی نے سنگ‌ریزہ تحریر کیا ہے۔ التمش اور رکن‌الدین فیروز کے علاوہ اس نے غیاث‌الدین محمد خلف شمس‌الدین التمش اور التمش کے وزیر قوام‌الدین محمد جنیدی اور غالبا رضیہ سلطان کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں۔ سیرو من والا شعر غیاث‌الدین محمد کے مدحیہ قصیدے میں آتا ہے اس کا مطلع ہے:

ساقی بیا کہ وقت مئے لعل روشن است
میدان خاک تیرہ کنون سبز گلشن است

صفحہ ۴۸۴ -- کہتے ہیں، سلطان معزالدین کیقباد کے کسی درباری شاعر کی تصنیف کردہ خالص ہندی نظم سے شعر ذیل نہایت ضروری ہے:

من کی اوجڑی نگری کو تب کرین آبادان
ناصر دین سے جب ملیں موج دین کبادان

کہا گیا ہے یہ ایک طویل تہنیتی نظم ہے جو امیرخسرو کی قران‌السعدین کے شاہی افراد سلطان ناصرالدین بغراخان والئی بنگالہ اور اس کے فرزند سلطان معزالدین کیقباد بادشاہ دھلی کی تاریخ ملاقات کے وقت جو سنہ ۶۸۸ ھ دارالسلطنت میں ہوئی تھی لکھی گئی تھی۔

شمس‌العلماء امیرخسرو کی ہندی شاعری کے منکر ہیں مگر اسی عہد کے کیقباد کے درباری ہندی شاعر کی شاعری اور اس کی طویل تہنیتی نظم پر بغیر تحقیق و تلاش ایمان لے آئے۔ شعر جو نمونے کا دیا ہے اس کی زبان متاخرین کے رنگ میں ہے اس کو کون سات سو پونے سات سو سال پہلے کی زبان مانےگا۔ کی۔ کو۔ سے۔ تب۔ جب وغیرہ حروف۔ کریں۔ ملیں مضارع زمانۂ حال کے رنگ میں ہیں۔ یہی حالت اس ترکیب کی ہے جو 'من کی اجڑی نگری' میں ہے۔ اس زبان میں معزالدین کے عہد کی بو باس تک نہیں۔

سلطان معزالدین اور اس کے والد ناصرالدین میں ملاقات دارالسلطنت دھلی میں نہیں ہوئی بلکہ کڑہ کے قریب دودریاؤں کے مابین جن کے نام گھگر اور سرو ہیں۔

امیرخسرو قران‌السعدین میں فرماتے ہیں:

نصب شد اعلام شہنشاہ دہر بر لب کھکر بحوالی شہر
کھکر ازین سوی و سرو زان طرف از تف لشکر بلب آوردہ کف

یہاں کتاب کا آخری باب ختم ہوتا ہے۔

اب ہم اور زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ ہندستان میں قبل مغل فارسی ایک صبرآزما مطالعہ اور طویل تحقیقات کی طالب‌کار ہے۔ غوریوں سے قبل کے فارسی شعرا پر کافی کام ہوچکا ہے۔ اسی طرح مغلیہ عہد کے واسطے ضرورت سے زیادہ ذرائع موجود ہیں لیکن غوریوں کے زمانے سے لےکر مغلوں کے عہد تک جو تقریباً ساڑھے تین صدی کا زمانہ ہے فارسی شاعری کا تاریک دور کہا جاسکتا ہے۔ یہ زمانہ فتح دہلی سے جو سنہ ۵۸۸ھ میں ہوتی ہے آغاز پاکر ابراہیم لودھی اور بابر کی جنگ پانی‌پت کے وقت جو ۹۳۲ھ میں ہوتی ہے ختم ہوتا ہے۔ اس عہد کے شعرا و دیگر مصنفین اور ان کے حالات سوائے چند کے جو زیادہ مشہور ہیں بالکل نامعلوم ہیں۔ شمس‌العلما کی غایت اصلی یہی دور ہے مگر وہ حشو و زوائد میں اس قدر مشغول رہے ہیں کہ اصلی مضمون پر کافی وقت اور توجہ نہ دے‌سکے: ع غم بیرون گرفت از ما ہوائے منزل‌ما را نہ ان کی تحقیقات اس تمام زمانے پر حاوی ہے بلکہ برنی کی وفات پر جو سنہ ۷۵۸ھ میں ہوتی ہے کتاب کو ختم کردیا ہے۔

شمس‌العلما اس تمام تحقیقات سے جو پچھلے چند سال میں اسی مضمون پر ہوئی ہے اور ملک میں شائع ہوچکی ہے بالکل بےخبر معلوم ہوتے ہیں۔ میں بعض نام یہاں درج کرتا ہوں۔

(۱) تنقید شعرالعجم جو رسالۂ اردو اورنگ آباد میں سنہ ۱۹۲۲ سے سنہ ۱۹۲۷ع تک شائع ہوتی رہی اور اب انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کتابی صورت میں شائع کررہی ہے۔

(۲) دی ارلی پرشین پوئٹس آف انڈیا (ہندستان کے قدیم فارسی شعرا) از ڈاکٹر اقبال‌حسین پروفیسر پٹنہ کالج۔ طبع سنہ ۱۹۳۷ع یہ مختصر جلد تقریباً وہی زمین طے کررہی ہے جو خود پروفیسر نے طے کی ہے۔

(۳) امیرخسرو، از ڈاکٹر وحید مرزا پروفیسر عربی لکھنؤ یونیورسٹی۔ جسے پنجاب یونیورسٹی نے اب سے چند سال قبل اپنے صرفے سے شائع کیا ہے۔

(۴) مفتاح الفتوح از امیرخسرو دھلوی طبع شدۂ اورینٹل کالج میگزین مئی و اگست سنہ ۱۹۳۶ء

(۵) عزیزم آغا عبدالستار کے بعض مضامین شائع شدۂ اورینٹل کالج میگزین بدین تفصیل :-

(الف) 'سلطان ناصرالدین قباچہ اور اس کے درباری شعرا' بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۸ و فروری سنہ ۱۹۳۹ء

(ب) 'التمش کے دور میں علمی و ادبی تحریکات' مئی سنہ ۱۹۳۹ء

(ج) 'روحانی' اگست سنہ ۱۹۴۰ء

(د) 'عہد شمسی کا ایک مؤرخ شاعر' مئی ۱۹۳۸ء

(۶) دہلی کا ایک قدیم شاعر تاج الدین سنگ ریزہ یا ریزہ' از یاسین خان نیازی نومبر سنہ ۱۹۳۴ء

(۷) 'دیوان خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری'۔ 'رسالۂ اردو' اورنگ آباد۔ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

یہ فہرست ابھی ناتمام ہے۔ تلاش سے اور مضامین دست یاب ہوسکتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ جس قدر کام پروفیسر نے کیا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً قباچہ جو سنہ ۶۰۲ھ میں والئی ملتان مقرر ہوتا ہے علم و ادب و شعر و سخن کا بڑا سرپرست تھا اس کا دربار مرجع اہل کمال تھا۔ اس کے وزیر عین الملک اشعری کی معارف پروری کی بنا پر اچھے اچھے شعرا اور فضلا ملتان میں جمع ہوگئے تھے۔ محمد عوفی اس وزیر کو صاحب اسمعیل عبّاد اور نظام الملک کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ عوفی اپنے تذکرے میں تمام شعراء دربار کا ذکر نہیں کرتا کیوں کہ وہ کہتا ہے مجدالدین سیدالافاضل نے اپنے دیوان (تذکرہ) میں ان کا ذکر کیا ہے اس لیے وہ صرف چند نام پر کفایت کرتا ہے یعنی تاج الفضلا شمس الدین محمد کاتب بلخی جو شعر میں عدیل انوری اور خط میں ابن مقلہ کا ہم پایہ تھا۔ وہ قباچہ کے مداحین میں سے ہے۔ اس کے ایک مدحیہ قصیدے کے مطلع پر قناعت کرتا ہوں:

اے لب لعلت مزاج آب حیوان یافتہ
بر جہان دلبری حسن تو فرمان یافتہ

تاج الفضلا فضلی ملتانی، بخارا میں عوفی کا ہم مکتب تھا۔ جامع الصغیر قاضی امام فخرالدین جان، دونوں مل کر حفظ کرتے تھے۔ نمونۂ کلام:

اے ظفر ہمدم ترا از بخت برنا آمدہ نامۂ تائید تو انا فتحنا آمدہ

فخرالشعرا ضیاءالدین سجزی۔ منه:

خیل لالہ گزکین کہ بہار آمد پدید
بر بساط باغ آنک با زمانه در وغاست

صدرالاجل........جنھیں سلطان جلال الدین نے 'بغروش' خطاب دیا تھا۔ منه:

گفتم بدان نگار که خورشید انوری گفتا زوے نکوترم ار نیک بنگری

سدیدالدین محمد عوفی بخاری المولد، امام رکن الدین بخاری استاد ہیں۔ شوق علم میں سمرقند۔ خوارزم۔ نیشاپور۔ ہرات۔ اسفزار وغیرہ شہروں کا سفر کیا۔ پہلے قلج ارسلان خان نصرۃالدین عثمان بن ابراہیم کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ سنه ۶۱۷ھ میں ملتان آپہنچا۔ کمبایت کا قاضی بنا کر بھیج دیا گیا جہاں کتاب 'الفرج بعد شدة' کا فارسی میں ترجمہ کرکے سلطان قباچہ کے نام معنون کیا۔ فارسی کا سب سے قدیم اور اہم تذکرہ عوفی نے ملتان میں بیٹھ کر تالیف کیا ہے جس طرح یہ تذکرہ اہم ہے اسی طرح اس کی دوسری تصنیف جوامع الحکایات فارسی زبان کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ دونوں کتابیں عین الملک اشعری کے نام پر لکھی گئی ہیں۔ عوفی نے بیسیوں دعائیہ قطعے اس وزیر کی شان میں لکھے ہیں۔

قاضی منہاج سراج بھی اولاً دربار قباچہ سے رجوع کرتے ہیں۔ جب ملتان پر التمش کا قبضہ ہوگیا قاضی اور محمد عوفی التمش کی ملازمت میں داخل ہوگئے۔ ناصرالدین قباچہ کا عہد جو سنه ۶۲۵ھ میں ختم ہوتا ہے ہر حال میں فارسی شاعری اور اس کی تاریخ کا ایک زریں دور ہے جس کو دنیا فراموش کرچکی ہے۔

سلطان شمس الدین کے عہد میں امیر بہاءالدین علی الجامجی مجدالملک کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو ایک کامیاب فاتح سپاہی ہونے کے علاوہ ایک خوش طبع شاعر بھی ہے جس کو سیاسیات کے مد و جزر نے کبھی قید اور کبھی فتح کی دوعملی میں آباد رکھا۔ عوفی اس کے مفصل حالات دیتا ہے اس کی رباعیاں خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

فخر مدبّر کتاب آداب الحرب جو عہد شمسی کی سب سے اہم تالیف ہے التمش کے نام پر لکھتے ہیں یہ فنون جنگ و طریق حرب پر بہترین کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

مؤید جاجرمی اس عہد کا مشہور فاضل التمش کے نام پر امام غزالی کی احیاء العلوم کا فارسی ترجمہ تیار کرتا ہے ۔ اس ترجمے کا ایک قدیم نسخہ آٹھویں صدی ہجری کا نوشتہ پرنسپل محمدشفیع کے کتب خانے کی زینت ہے۔

اسی عہد میں امام رازی کی عربی تالیف 'سرّمکتوم' کا ترجمہ رکن الدین فیروز کے حکم سے فارسی میں لکھا جاتا ہے۔

سلطان رضیہ کے زمانے میں امیر امام ناصر (ی) شاعر کا نام سنا جاتا ہے۔ ناصرالدین محمود اور اس کے جانشین بلبن کے زمانے میں شمس دبیر ہے جس نے شیخ فریدالدین شکرگنج کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے شمس نظام الدین اولیا کا استاد ہوی ہے۔ انہوں نے مقامات حمیدی اس سے پڑھی اور علم حدیث حاصل کیا۔ بلبن شمس کو اپنے فرزند بغراخاں کا مستوفی بناتا ہے ۔ تاج ریزہ مبارکباد میں کہتا ہے :

شمسا کنون بکام دل دوستان شدی مستوفیٔ ممالک ہندوستان شدی

اعجاز خسروی کے ایک فقرے سے مفہوم ہوتا ہے کہ شمس دبیر نے اپنا دیوان امیرخسرو کو دیا تھا :[1]

« و دیوان خاص کہ نظمش از نثرہ و شعری سخن میگوید یادگار بکاتب سپرد »
قران السعدین سے پایا جاتا ہے کہ بغراخاں نے اس کو اپنا ایلچی بناکر کیقباد کے پاس[1] روانہ کیا تھا :

دید کہ کس نیست ز برنا و پیر در خور این کار چو شمس دبیر

شمس کا ایک قصیدہ بدایونی کی تاریخ میں محفوظ ہے اس کا مطلع ہے :

اے ہمہ کار دلم از تو بنادانی خام دادۂ دوش مرا وعدۂ مہمانی خام

شمس العلما صوفی شعرا کی طرف خاص طور پر مائل ہیں ۔ تعجب ہے کہ وہ شیخ جمال الدین قطب ہانسوی متوفی سنہ ۶۵۹ ھ کو بالکل فراموش کرگئے وہ ایک ضخیم دیوان کے مالک ہیں جو گزشتہ صدی میں طبع بھی ہوگیا ہے۔

---

۱ اورینٹل کالج میگزین صفحہ ۴۸

جلال‌الدین خلجی خود شعرگوئی کی طرف رغبت رکھتا تھا - انھی کے اشعار برنی اور بدایونی کے ہاں ملتے ھیں - اس کے درباری شعرا میں بدایونی نے موید جاجرمی - امیر ارسلان - کاتبی - سعد منطقی - باقی خطیب اور قاضی مغیث‌الدین ھانسوی کے نام دیے ھیں - ان میں مغیث زیادہ مشہور ھے اس نے ایک غزل لکھی تھی جو انتیس وزن میں پڑھی جاسکتی تھی - مغیث کے کلام کے نمونے شرح مخزن‌اسرار اور دستورالشعرا مرتبۂ سنہ ۸۰۳ھ میں جو مبارک‌شاہ شرقی والئی جون‌پور کے نام پر لکھی جاتی ھے درج ھیں -

عہد علائی میں فخرالدین مبارک قوّاس غزنوی مولف فرہنگ‌نامہ ایک مشہور شاعر اور صاحب دیوان ھیں - برنی اور مولانا رفیع دونوں ان کا ذکر کرتے ھیں - رفیع نے انھیں استادالشعرا کے لقب سے یاد کیا ھے - شہاب‌الدین جوھری ایک اور شاعر ھیں ان کا ذکر دستورالافاضل میں آتا ھے - جوھری قوّاس مذکور کے حق میں لکھتے ھیں:

فخر دین کان کرم گنج ھنر دریاے فضل
اے بطبعت یک سخن سرمایۂ صد جوھری

حضرت بوعلی شرف قلندر پانی‌پتی صوفی شاعر ھیں - ان کی مثنوی اور دیوان بنا بر کثرت شہرت محتاج بیان نہیں -

غیاث‌الدین تغلق کے زمانے میں سعد فلسفی اور عبید شاعر کا نام ضیاء برنی و دیگر مورخین نے لیا ھے جو بڑے فتنہ‌پرداز تھے - بدایونی کے قول کے مطابق خسرو اپنی تالیفات میں ان دونوں کے شاکی نظر آتے ھیں - عبید اپنے آپ کو خسرو کا مدّ مقابل سمجھتا تھا - خسرو کے حق میں اس کا یہ شعر مشہور ھے:

غلط افتاد خسرو را ز خامی که سکبا پخت در دیگ نظامی

یہی عبید دوسرے موقع پر کہتا ھے:

دوش دیدم نظامی اندر خواب گوئیا شسته خمسه را می شست
گفتم اے شیخ از چه می شوئی آے بزرگ زمانه پشت به پشت
گفت از ننگ خسرو لاچین کو چه داند جواب خمسه گفت

امیرخسرو نے اسی کو الٹ دیا اور لکھا:

دوش دیدم نظامی اندر خواب بر دھان عبید می زد مشت
گفتم اے شیخ از چه رنجیدی چه گنه کرد این خبیث درشت

گفت ینگرچہ افترا کردہ است ۔۔۔ خمسۂ خویش را نظامی شست
بـــدویـــدم بپایش افتادم ۔۔۔ ورنہ این سفلہ را بجامی کشت

بدرچاچ استعارہ گوئی کا بادشاہ ہے ۔ اس کے قصائد درس‌نظامیہ میں اب تک داخل رہے ہیں اس کا شاہ نامہ محمد بن تغلق کی تاریخ میں تیس‌ہزار ابیات پر مشتمل تھا۔ تاریخ گوئی میں بامعنی مادۂ تاریخ کا فقرے کے ذریعے سے استخراج سب سے پیشتر اس کے ہاں ملتا ہے۔ قلعۂ نگرکوٹ کی تاریخ فتح ' ادخلوافیہا ' اس نے کہی ہے جس سے سنہ ۷۳۸ ھ برآمد ہوتے ہیں۔ نصرالدین ایک اور شاعر ہے جس کی ہجو میں بدرچاچ نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

مولانا رکن‌الدین مرید شیخ نصیرالدین‌محمود ایک فقیہ اور مشاق شاعر ہیں جو فیروزشاہ تغلق کے ابتدائی دور میں اپنی مثنوی طرفۃالفقہا فقہی موضوع پر تالیف کرتے ہیں۔ اس مثنوی میں تیس‌ہزار سے زاید اشعار ہوں‌گے اس تالیف کا ایک مخطوطہ جو بہ‌ظاہر مصنف کے قلم کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہے (نمبر ۱٦۸۵)۔

اسی زمانے میں حمید قلندر ایک اور شاعر گزرے ہیں جو نظام‌الدین اولیا اور چراغ دہلی کے مرید ہیں۔ خیرالمجالس چراغ دہلی کے ملفوظات (سنہ ۵۵--۷٦۰ھ) حمید قلندر نے تدوین کیے ہیں وہ شاعر بےبدل مانے جاتے ہیں ۔ نمونۂ کلام دستورالشعراء میں موجود ہے۔

امیراحمد خسرو کے فرزند ایک خوش مذاق شاعر مانے جاتے ہیں ان کے ساتھ ایک اور شاعر قاضی عابد کا بھی نام لینا چاہیے۔ جب فیروزشاہ پدماوتی اور برم‌تلہ کے جنگلوں میں ہاتھیوں کا شکار کھیلتا ہے۔ ملک ضیاءالملک نے یہ رباعی نذر کی:

رباعی

شاہیکہ ز حق دولت پایندہ گرفت ۔۔۔ اطراف جہان چومہر تابندہ گرفت
از بہر شکار فیل در جاجنگر ۔۔۔ آمد، دو بکشت وسی و سہ زندہ گرفت

اس عہد کا سب سے معروف شاعر مطہر کڑہ ہے جو فیروزشاہ اور اس کے امرائے عہد کا مداح ہے۔ مطہر بھی چراغ دہلی کا مرید تھا۔ بدایونی اس کا دیوان پندرہ‌ہزار ابیات پر شامل بتاتا ہے، اکبر کے زمانے میں مولانا محمد صوفی نے اس دیوان کا ایک انتخاب جس میں پانچ‌ہزار شعر ہوں‌گے تیار کیا تھا۔ ڈاکٹر وحید مرزا پروفیسر

لکھنؤ یونیورسٹی اور پروفیسر محمد شفیع نے مطہر کے حالات و کلام پر ایک طویل تبصرہ اورینٹل کالج میگزین کے کئی نمبروں میں شائع کیا ہے جو مئی نمبر سنہ ۱۹۳۵ع سے شروع ہوتا ہے۔

انشای عین ماهرو کا مصنف یعنی ملک الشرق ملک عین الملک مطہر کا ممدوح خاص ہے جس کی تعریف میں شاعر نے متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ عین ماهرو نے اسلام آباد کے قریب ایک گانو شاعر کو معافی میں دیا تھا۔

مطہر کا نصاب 'نصیب اخوان'، جو بہ تقلید نصاب الصبیان سنہ ۷۷۶ھ میں تالیف ہوتا ہے ہندستان میں بہت مقبول رہا ہے اب بھی اس کے نسخے اکثر مل جاتے ہیں اس نصاب کا ایک مخطوطہ بہ خط محمد زمان ابن عبدالغنی جالندھری نوشتہ سنہ ۱۰۶۹ھ جو میرے مجموعے میں ہے معلومہ نسخوں میں سب سے قدیم ہے۔ اس کا نمبر ۲۱۷۵ ہے۔

شہابی باشندۂ ناگوار اس عہد کے نامی طبیبوں میں سے ہیں۔ بڑے آزاد منش اور مستغنی المزاج تھے۔ خدمت خلق جو فن طبابت کی اصلی غایت ہے مدت العمر، ان کا پیشہ رہی 'طب شہابی' جو منظوم ہے انھی کی یادگار اور بہت مقبول ہے۔ میرے مجموعۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ نمبر ۱۸۶۰ نوشتہ سنہ ۱۰۰۴ھ موجود ہے اس کا کاتب راجو ابن سید محمد ہے۔

غنیۃ المنیہ هندی موسیقی پر ایک قابل قدر تالیف ہے جو فیروزشاہ تغلق کے عہد میں امیر شمس الدولۃ والدین ابراهیم حسن ابورجا حاکم گجرات کی فرمایش پر لکھی گئی ہے۔ یہ تالیف هندی ماخذ پر مبنی ہے اور دو قسم، چار باب، اور اٹھارہ فصلوں پر حاوی ہے چنانچہ قسم اول۔ باب اول در معرفت سرود، ۴ فصل۔ باب دوم در معرفت مزامیر، ۲ فصل۔ قسم دوم۔ باب اول در بیان رقص، ۴ فصل۔ باب دوم در شرائط و آداب سرود، ۸ فصل۔

اس سے پیش تر ایک عربی تالیف فریدالزمان فی معرفت الالحان جس کا موضوع ایرانی موسیقی ہے اسی والی کے ارشاد سے ترجمہ ہوچکی ہے۔

عزالدین خالدخانی ایک شاعر ہے جو 'دلائل فیروزشاهی' بادشاہ کے حکم سے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور سنسکرت تالیف 'براہ سنگتا' ہے جو اسی بادشاہ کے حکم سے عبدالعزیز شمس تھانیسری مولف تاریخ فیروزشاهی فارسی میں ترجمہ کرتا ہے۔ اس کتاب کے دو نسخے میرے کتب خانے میں حاضر ہیں۔

مسعودبک جن کو اقارب فیروزشاہ سے بتایا جاتا ہے صوفی شاعر اور صاحب دیوان ہیں ان کا دیوان حیدرآباد دکن میں چھپ چکا ہے۔

فیروزشاہ کے دور میں یہ امر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ہندوی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا داؤد نے کتاب 'چنداین' جو لورک اور جاندا کا عشقیہ افسانہ ہے جوناشہ خان‌جہاں خلف وزیر خان‌جہاں کے نام پر لکھی ہے۔ اس مثنوی کو ان ایام میں بلکہ بدایونی کے زمانے تک جس سے میں یہ اطلاع لے رہا ہوں بےحد شہرت حاصل رہی ہے حتیٰ کہ اس عہد کے واعظین تک اس کے اشعار اپنے وعظوں میں نقل کرتے تھے (صفحہ ۲۵، منتخب‌التواریخ طبع سوسائٹی)۔

قاضی ظہیر دہلوی سلطان محمد تغلق کے شعرا میں داخل ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔ بدایونی نے نمونۂ کلام دیا ہے۔ ملک عزیزاللہ کا قصیدۂ موشح جو مبارک‌شاہ شرقی (سنہ ۳–۸۰۲) کی تعریف میں ہے دستورالشعرا میں محفوظ ہے۔

اس صدی کے وسط میں ایک شاعر شہابی ہے جس کی مثنوی عروۃالوثقی تالیف سنہ ۸۵۹ بوستان کی طرح اخلاقی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ شہابی ایک مشاق شاعر ہے اور اس کا کلام استادانہ ہے۔

شرف‌نامہ کے مصنف ابراهیم فاروقی ہیں انھوں نے اپنا کلام الفاظ و لغات کی مثال کے واسطے بہت نقل کیا ہے۔

اس صدی کے آخر میں سلطان سکندر لودھی قابل ذکر ہے اس کی طبیعت نظم کے واسطے بہت موزوں تھی۔ گل‌رخی اس کا تخلص تھا۔ مولانا جمالی اسی عہد کی پیداوار ہیں جامی کے ساتھ ان کے لطیفے مشہور ہیں۔

بدایونی سکندر لودھی کے عہد میں ایک برہمن شاعر کا ذکر کرتا ہے جو کتب رسمی کا درس دیتا تھا۔ اس نے اس برہمن کا ایک شعر جو مسعودبک کی زمین میں ہے نقل بھی کیا ہے۔

دل خون نشدی چشم تو خنجر نشدی گر
رہ گم نشدی زلف تو ابتر نشدی گر

میں نے یہ چند نام نہایت عجلت میں یہ دکھانے کے لیے نقل کردیے ہیں کہ شمس‌العلما نے یہ موضوع جس پر تحقیقات کی بےحد ضرورت ہے بالکل تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ فہرست دگنی ہوجائےگی اگر اس میں ہندستان کی صوبہ‌داری سلطنتوں کے شعرا

اور اہل قلم بھی داخل کرلیے جائیں گے یعنی گجرات۔ سندھ کشمیر۔ مالوہ۔ جون پور۔ بنگالہ۔ دکن وغیرہ۔ میں اس قسم کے بعض اسما بھی یہاں درج کرتا ہوں۔

دستورالشعرا، جون پور میں سنہ ۸۰۳ میں تدوین ہوتی ہے - یہ اشعار کی بیاض ہے اور نسخۂ اصل برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں بعض ہندستانی شعرا کا کلام بھی ملتا ہے۔

تفسیر بحرمواج از قاضی شہاب الدین ملک العلما۔ اس کا ایک عمدہ قدیم نسخۂ نوشتہ سنہ ۸۵۹ھ دو جلدوں میں میرے کتب خانے میں موجود ہے (نمبر ۱۵۷۱) قاضی صاحب متعدد رسالوں کے مصنف ہیں مثلاً رسالۂ ارشاد در نحو۔ تیسیرالاحکام (نمبر ۱۵۲۵)۔ اصول ابراہیم شاہی (نمبر ۹۹۸)۔ چہل حدیث (نمبر ۱۰۳۹)۔

مکتوبات شیخ شرف الدین یحیٰی منیری۔ صوفی حلقوں میں قبول عام کے مرکز تھے۔ تحفۃ المجالس از برہان بن بدو ترجمۂ رسالۂ امام غزالی در عہد سلطان محمود والئ مالوا۔ اس کا ایک مخطوطہ نمبر ۱۶۰۷ میرے مجموعۂ کتب میں موجود ہے۔ رسالہ در سیرۃ النبی از میر عبدالاول بن علی بن الحسن الحسینی تالیف سنہ ۷۴۱ «وقتیکہ لشکر خراسان و دلی متوجہ گجرات شدند» (۱۶۴۵) عیون الشرع از قاضی نعمت اللہ ابن طاہر بہ نام محمود شاہ بیگڑہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ۔ میزان العدالت از قوام بہ نام مظفرشاہ گجراتی۔

مجمع النوادر[۱] از فیض اللہ بن زین العابدین بن حسام الدین بتیانی المخاطب بملک القضاۃ صدر جہان معنون بہ نام محمود بیگڑہ تالیف سنہ ۹۰۳ھ در محمد آباد چاپانیر۔ کاتب خواجہ عبدالقادر بن محمود قریشی سنہ ۹۳۰ھ اس کا موضوع چہار مقالۂ نظامی عروضی اور جوامع الحکایات کے ساتھ مشترک ہے۔ نسخۂ ہذا راقم کے مجموعۂ کتب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا نمبر ۱۶۸۱ ہے۔ شفاءالعلیل از کریم بن محمد بن عثمان دبیر خان اعظم قتلغ خان (۱۶۹۸)۔

فارسی ترجمۂ وفیات الاعیان لابن خلکان از یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان بن علی بن احمد الشجاع الشعری جو سنہ ۸۹۳ھ میں ختم ہوتا ہے۔ محمود شاہ بیگڑہ کے واسطے تیار ہوتی ہے۔ میرے ہاں اس تالیف کا نمبر ۱۹۹۳ ہے۔

حمزہ نامہ۔ غالباً آٹھویں صدی ہجری کی یادگار ہے۔

ہدایت الرمی در تیراندازی از محمد بدھ عرف سید میر علوی بہ نام علاءالدین حسین شاہ والئ جون پور (نمبر ۱۵۹۱)۔

---

۱ اس تالیف پر دیکھو ڈاکٹر محمداقبال ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی کا مضمون شائع شدہ اورینٹل کالج میگزین۔ اگست سنہ ۱۹۳۹ء

کفایۂمجاھدیہ از منصور بن محمد بن احمد بن یوسف برائے سلطان زین العابدین والئ کشمیر (۳۵۱) ۔ مفرح القلوب ترجمۂ ھتپدیش از تاج الدین مفتی الملکی بہ فرمان ملک الملوک الشرق و الغرب نصرۃالدولۃ والدین مقطع شق بہار ۔

ھمیں تعجب آتا ھے کہ شمس العلما چند شعرا کے نام پیش کرکے ان کی بنا پر ھندستانی شعرا کی ایرانی شعرا پر فضلیت کے خواب دیکھ رھے ھیں حالاں کہ جو امور فارسی کے میدان میں ھندیوں کو ایرانیوں پر تفوق دے سکتے ھیں انھی کو پروفیسر نے پس پشت ڈال دیا ھے ۔ مثلاً سب سے قدیم تذکرۂ شعرا اسی سر زمین میں تالیف ھوتا ھے ۔ ایک جماعت شرح نگاروں کی ھے جس نے فارسی اساتذہ نظامی ' انوری ' خاقانی وغیرھم کے کلام کا مطالعہ کرکے اس پر شرحیں تیار کیں اور ان کے مشکل ابیات کی روایتی تشریح محفوظ رکھی ۔ مولانا محمد بن قوام بن رستم کڑئی گجراتی مخزن اسرار کی شرح سنہ ۷۹۵ھ میں تالیف کرتے ھیں ۔ جس کو شرح نگاری کے نمونے یا معیار کے طور پر پیش کیا جاسکتا ھے ۔ اس شرح میں تمام فنی اور علمی نکات و غوامض پر آیات کلام پاک احادیث نبوی اور کلام شعرا کی امداد سے پوری روشنی ڈالی ھے ۔ اور ادبی و تاریخی اطلاع بہم پہنچائی ھے ۔ متعدد ھندستانی شعرا مسعود سعد سلمان ۔ تاج الدین ریزہ ۔ عمید لومکی خسرو ۔ امیرحسن سجزی یا امیر نجم الدین حسن سجزی ۔ قیصر سجزی ۔ مولانا بہاء کاری (کذا) ۔ جمال الدین استاجی ۔ حمید قلندر ۔ مولانا فخرالدین ۔ ابوبکر نسعی (کذا) ۔ مغیث الدین ھانسوی ۔ عبید منجم وغیرہ کے اشعار موقع بہ موقع نقل کیے ھیں ۔ اس شرح کے اختصار عام طور پر رائج ھیں اور مفصل شرح نہیں ملتی ۔

اسپرنگر کی فہرست سے معلوم ھوتا ھے کہ مولانا فضل الدین محمد نے سکندر نامہ کے دونوں حصوں پر بھی حواشی لکھے ھیں ۔ ان کی ایک اور تصنیف جواھر المعادن ھے جو فنون بدیع و بیان و عروض پر شامل ھے ۔

مولانا محمد بن داؤد شادی آبادی قصائد خاقانی و قصائد انوری پر جدا جدا شرحیں تیار کرتے ھیں ۔ یہ مانڈو کے رھنے والے ھیں اور غیاث شاہ (سنہ ۸۸۰–۹۰۶ھ) ناصرشاہ (سنہ ۹۰۶–۹۱۶ھ) والیان منڈو کے دور میں گزرے ھیں ۔ شرح انوری ناصرشاہ کے نام پر منسوب ھے ۔

مولانا نظام الدین سکندر نامۂ نظامی گنجوی پر ایک مختصر شرح لکھتے ھیں ۔ ان کا زمانہ دسویں صدی ھجری کا پہلا منتصف ھے ۔

اس سے بھی اہم اور قیمتی کام ہندی فرہنگ نگاروں کا ہے۔ اساتذہ کے مطالعے کے وقت قدم قدم پر الفاظ کے معنی کی تلاش رہتی ہے۔ اس غرض سے ایک بڑی جماعت ان فرہنگ نویسوں کی پیدا ہوگئی۔

ان میں سب سے مقدم مولانا فخرالدین مبارک شاہ غزنوی عرف کمان گر یا قوّاس ہیں جو دوستوں کی فرمایش سے شاہ نامہ وغیرہ کے لغات تیار کرتے ہیں۔ فرہنگ نامے کے پانچ حصے ہیں ہر حصہ 'بخش' کہلاتا ہے۔ بخش کی ذیلی تقسیم گونہ ہے اور گونہ کی ذیلی تقسیم بہرہ ہے۔ فرہنگ نامے کا حجم ایک رسالے سے زیادہ نہیں ہے۔ قوّاس علاءالدین خلجی (سنہ ۶۹۵–۷۱۵ ھ) کے عہد کے مشہور شاعر ہیں۔

دوسرا نمبر دستورافاضل کا ہے جو مولانا رفیع دہلوی عرف حاجب خیرات کی یادگار ہے۔ یہ محمد بن تغلق (سنہ ۷۲۵–۷۵۲ ھ) کے زمانے میں گزرے ہیں۔ دہلی سے بعض حوادث کی بنا پر سفر اختیار کرتے ہیں اور قصبۂ 'بیر' میں جا نکلتے ہیں۔ یہاں شمس الدین محمد احمد ججنیری وزیر سے ملاقات ہوئی وزیر انھیں آستان آباد آنے کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں اس کی فرمایش سے مولانا یہ فرہنگ سنہ ۷۴۳ ھ میں جیسا کہ شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے تیار کرتے ہیں:

ز هجرت بود هفصد با سه و چهل	مرتب گشته دستورا فاضل

مولانا رفیع پختہ کار شاعر ہیں۔ قطعۂ ذیل رشید و طواط کی مدح میں ان کے قلم سے نکلا ہے:

استاد سخنوران عالم	فرزانه رشید دین و طواط
شیداء فضائلت ارسطو	دیوانهٔ لفظ تست بقراط
در پیش تو شاعران عالم	چون پیش خلیفه خلف اوساط
شد کاتب چرخ در خط از تو	شاگرد صفت به پیش خیّاط
روی فضلا ز رشک تو زود	چون عورت حامله ز اسقاط
در جملهٔ گوشها رسیده	نظم سخنت چو دُر در افراط
هر چند مدایحت نویسد	از طبع رفیع نبود افراط

دہلی سے جدا ہوتے وقت یہ رباعی لکھی تھی:

یکچند دلم دبدبهٔ خانی دید	خود را بمشابهٔ جهانبانی دید
چشم از سر او کشیده بادا یارب	کو بر سر جمع ما پریشانی دید

اداۃالفضلا (تالیف سنہ ۸۲۲ھ) کے مصنف قاضی بدرالدین دھلوی ھیں۔ بحرالفضائل (تالیف سنہ ۸۳۷ھ) مولانا فضل الدین محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدرخزانۃ البلخی المعروف بہ کرڑئی کے قلم سے نکلی ھے جن کا ذکر اوپر آچکا ھے۔ اس کتاب کا ایک معاصر نسخہ میرے کتب خانے میں تھا اس کا نمبر ۱۶۸۹ ھے۔ میں اس کتاب پر ایک مضمون مارچ اور اپریل سنہ ۱۹۲۹ع کے 'مخزن' میں دے چکا ھوں۔ زبان گویا از مصنفات ملا رشیدی برادر جد ابراھیم فاروقی ھے۔ سنہ ۸۷۲ھ میں ابراھیم فاروقی نے شرف نامۂ احمد منیری لکھا جس کی اھل لغات میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ سنہ ۸۷۳ھ میں مولانا محمد بن داؤد شادی آبادی (منڈوی) شارح خاقانی و انوری نے مفتاح الفضلا سنہ ۹۱۶ھ میں مولانا محمود بن شیخ ضیا نے بہ عہد سلطان سکندر لودھی تحفۃالسعادت اور سنہ ۹۲۵ھ میں مولانا محمد لاڈ نے مویدالفضلا تالیف کی۔ ان کے علاوہ قنیۃالطالبین از قاضی شاہ۔ موائدالفوائد۔ فرھنگ شیخ زادہ عاشق۔ فوائدالفضلا۔ لسان الشعرا۔ طب حقائق الاشیا اور فرھنگ شیرخانی اس فن کی دیگر تالیفات ھیں جن کے زمانوں سے ھم ناواقف ھیں اگرچہ ھم جانتے ھیں کہ وہ عہد قبل مغل کی یادگار ھیں۔ اس مواد کی اساس پر مغلیہ دور میں وہ لغات تیار ھوتے ھیں جو آج بھی فارسی لغات کے واسطے سند کا حکم رکھتے ھیں اور یہی ایرانی آغا جو ھر موقع پر ھم ھندیوں پر ناک بھوں چڑھاتے رھتے ھیں ضرورت کے وقت ان ھندی لغات نگاروں سے استفادہ کرتے ھیں۔ خواہ وہ مرزا محمد بن عبدالوھاب قزوینی ھوں یا ملک الشعرا بہار یا کوئی اور، کتاب مشہور برھان قاطع کو اپنا مشعل راہ بنائے بغیر انھیں چارہ نہیں۔ فی الحقیقت ھم ھندیوں کے واسطے یہ بجا فخر کا موقع ھے کہ مغرور ایرانی خود اپنی زبان کے بارے ھمارا منت کش ھے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک واقع کا ذکر کرنا ضروری ھوا جو پروفیسر براؤن سے تعلق رکھتا ھے۔ آں جہانی کو فارسی محاورہ 'بہند رفتن حنا' کے اصلی مفہوم معلوم کرنے کی ضرورت ھوئی۔ جب ان کے ایرانی دوستوں سے مایوسی ھوئی مجبوراً انھوں نے ھندستانی پروفیسر محمد شفیع عربی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی سے دریافت کیا۔ پروفیسر ممدوح نے اس محاورے کے صحیح معنی، اس کا محل استعمال اور اساتذہ کے کلام سے شواھد لےکر آں جہانی کو بھیج دیے جس سے ان کی تسلی ھوگئی۔ کیا اس وقت بھی ایران فارسی کے لغات و محاورات پر وھی سامان رکھتا ھے جو ھندستان میں میسر ھے۔

منشی اجمیری مرحوم

(از حضرت اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی مرحوم)

اس بات کو لوگ کم ہی جانتے ہوں گے کہ اکبراعظم، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب سے لےکر بہادرشاہ ظفر تک ہندستان کے سبھی مغل بادشاہوں نے ہندی کے پد (اشعار) لکھے۔ ممکن ہے کہ ان سب کے نقطۂ خیال سے رعایا کی مروّجہ زبان میں لکھنا کسی حد تک سیاسی مصلحت پر بھی مبنی رہا ہو۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ شاعر کا دل بہت ذی‌حس ہوا کرتا ہے جس پر گرد و پیش کی زرا زرا سی باتوں کا اثر پڑتا ہے، پھر جب کسی وقتی ماحول کو دھیان میں رکھا جائے تو احساس کی گہرائی کہیں زیادہ اور اس کے عمل کا دائرہ کہیں وسیع ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شاعر کی قدرتاً یہ دلی خواہش ہوا کرتی ہے کہ اس کے کلام کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور اس سے لطف اٹھا کر یا سبق حاصل کرکے داد دیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ وہ ماحول پرانی ہندی کا تھا جس میں شاعرانہ اعتبار سے حسن و عشق کی بو باس پوری طرح بس رہی تھی چناں‌چہ انھی حالات کی تحت میں کام کرتے ہوے جہاں ان بادشاہوں نے ہندی پدوں کو رواج دےکر اپنی شاہانہ الوالعزمی، فراخ‌دلی اور علم‌دوستی کا ثبوت دیا وہاں اپنے ان پدوں میں شاعری کے وقتی پہلووں اور ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوے اپنی شاعرانہ اثر پزیریوں کا اعتراف و انکشاف بھی کیا۔ ظفر کا تو اردو کلام بھی دیسی بول چال کا نمونہ پیش کرتے ہوے گویا یہ پکار پکار کر کہ رہا ہے کہ وہ کس ماحول کی پیداوار ہے۔

ہندی کے مسلمان شعرا میں خسرو نے سنہ ۱۲۸۳ع کے قریب لکھنا شروع کیا، انھوں نے اس پرانی ہندی کے زمانے میں جہاں اپنی مکرنیوں، پہیلیوں اور دوسخنوں کو ہندی کی کھڑی بولی (اردو طرز) میں لکھ‌کر اپنی جدّت‌پسندی کا ثبوت دیا وہاں آپ نے گیتوں اور دوہوں کو برج‌بھاشا کے سانچے میں ڈھالتے ہوے عوام میں بولی جانے والی زبان کا بھی اچھا ساتھ نبھایا۔ نرگن‌مت کا پرچار کرنے والے کبیر شہرۂ آفاق شاعر کا جنم سنہ ۱۳۹۹ع میں ہوا۔ یہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر ایسے طبّاع اور ذہین واقع ہوے تھے کہ گیان‌مارگ کی رمزیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں

رکھتے جن کے نمونے ان کی بیجک (مجموعهٔ کلام) میں پائے جاتے ھیں۔ یه شاگرد تو شیخ تقی نامی ایک مسلمان فقیر کے تھے اور لکھا بھی انھوں نے صوفیوں کی طرز پر، مگر جو کچھ لکھا وہ راما نند جی کے اپدیشوں اور دیگر ھندو سادھوؤں کی باتوں کو لے کر۔ قطبن نے سنه ۱۵۰۱ع میں مرگاوتی نامی قصّه لکھا۔ ملک محمد جائسی کا نام تو اس کی امر کتاب پدماوت کے لیے مشہور ھی ھے جس کی ابتدا سنه ۱۵۲۰ع میں ھوئی اور جس کی تقلید میں عثمان نے سنه ۱۶۱۳ع میں اپنی چتراولی نامی کتاب لکھی، جو ایک فرضی قصّه ھے مگر کوئی بھی قصّه اصلی ھو یا فرضی، وہ ھندی زبان میں اور کسی نه کسی ھندو راجا کے تعلّق ھی سے منظوم ھوا ھے۔ پریم باٹکا اور سجان رسکھان نامی کتابوں کا لکھنے والا رسکھان اپنی کرشن بھگتی والی عشقیه شاعری میں کچھ بڑے بڑے ھندو شاعروں سے بھی بڑھا ھوا ھے۔ یہی بات اپدیش والے دوھوں کے تعلق سے عبدالرحیم خان‌خاناں کے متعلّق بھی کہی جاسکتی ھے، جن کے منسکرت والے پد اور ھندی کبت اور سوئیوں سے کرشن والی بھگتی کا بھی بہ‌خوبی اظہار ھوتا ھے۔ خالص عشقیه شاعری کے ناتے بلگرام کے دو شاعر سیّد مبارک علی مبارک اور سیّد غلام نبی رسلین کے نام نامی بھی کسی طرح بھلائے نہیں جاسکتے، جن کے لکھنے کا زمانه ترتیب کے ساتھ سنه ۱۶۱۳ع اور سنه ۱۷۳۷ع کے قریب ھے اور جن کی جادوبیانیوں میں وہ کیف ھے که حسن و عشق کا چرچا چلتے وقت ھمیں اس عامیانه‌پن کا خیال بھی نہیں ھوتا جس کے لیے اس دور کی شاعری کو جائز اور ناجائز طریقے پر بدنام کیا جارھا ھے۔ اسی کیف و محویت کے تعلق سے عالم جیسے باکمال شاعر کا نام بھی یاد آجاتا ھے جن کا زمانهٔ تصنیف سنه ۱۶۸۳ع اور سنه ۱۷۰۳ع کے درمیان مانا گیا ھے اور جن کا کلام عشقیه کیف و محویت کے اعتبار سے بعض کے نزدیک رسکھان کی برابری کا درجه رکھتا ھے مگر یه یاد رھے که ان کی تصانیف میں ان کی بیوی شیخ کا بھی خاصا ھاتھ تھا۔ ایک خصوصیت یه ھے که ان کی جو کبتّیں اردو میں ھیں، ان میں ھندی الفاظ موجود ھیں۔ یہی بات نظیر اکبرآبادی کے اردو کلام کے متعلق بھی کہی جاسکتی ھے جو سنه ۱۷۴۰ع تا سنه ۱۸۲۰ع تک زندہ رھے اور جنھوں نے نه صرف اپنی نظموں میں ھندی الفاظ کا استعمال بہتات کے ساتھ کیا بلکه ان میں ھندو روایات کو بھی بہت کچھ قائم رکھا۔

مگر اس زمانے کی بات ھی اور تھی۔ اردو کا یا تو ظہور ھی نه ھوا تھا یا جس ھندی کے سہارے وہ رفته رفته بن رھی تھی اس سے بالکل الگ تھلگ سی

کوئی دوسری زبان ھی نہ سمجھی جاتی تھی ، اور شعرا کو اس بات کا پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے فطری رجحان کے مطابق بلا کسی روک ٹوک کے چاھے جس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرکے یکساں تحسین و ستایش کے مستحق بن سکتے تھے - اگر کسی زبان کا کسی مذھب کے ساتھ کوئی خاص تعلق بھی تھا تو وہ کم سے کم عوام کے نقطۂ خیال سے بالکل سطحی تھا اور اس میں اتنا زور اور اثر نہ تھا جو اردو ھندی کو مسلمانوں یا ھندووں کے ساتھ ایسی مضبوطی سے جکڑ دے کہ ایک کا دوسرے کی زبان سیکھنا یا دوسرے کی زبان میں لکھنا کفر سمجھا جاے - میرے خیال سے تو اس وقت جو نئی زبان بن رھی تھی اس نے آگے چل کر بدیسی لفظوں کی بڑھتی ھوئی ملاوٹ سے چاھے جو بھی صورت اختیار کرلی ھو مگر وقتی اعتبار سے تو وہ عموماً ھندی کا ایک ایسا سدھرا ھوا روپ ھی سمجھی جاتی رھی ھوگی جو ھندو اور مسلمان دونوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ھوسکے - چناںچہ آج ھندی میں جس کھڑی بولی کا عام چلن ھوگیا ھے ، اگر اس کی صرف اسی خصوصیت پر غور کیا جاے کہ وہ کھڑی بولی کیوں کہی جاتی ھے تو میرے اس خیال کی تصدیق ھی ھوگی - یہ اور بات ھے کہ زمانے کی موجودہ روش نے اس کو اس طرح ھندووں کی زبان بنا دیا ھو جس طرح اردو کو مسلمانوں کی - اب ھندو اور مسلمان ھندی اور اردو میں سنسکرت اور عربی و فارسی کے لفظوں کو زیادہ سے زیادہ ملاکر خوا
جداگانہ زبان پر جتنا بھی فخر کریں مگر سچ بات تو یہ ھے کہ آج دونوں زبانیں عوام سے بہت دور ھوتی جارھی ھیں اور کم سے کم کسی قریب کے آنے والے زمانے میں ان کو وہ ھردلعزیزی کبھی نہیں حاصل ھوسکتی جو پرانی ھندی کو اس کی کھڑی یا پڑی شکل میں آج بھی اسی طرح نصیب ھے جیسے پرانے وقتوں میں -

میرا یہ مطلب نہیں کہ ایک دم پیچھے کو لوٹا جاے - نہ تو گیا ھوا وقت واپس آسکتا ھے اور نہ پڑھے لکھے لوگوں میں اس وقت کی زبان ھی رواج پاسکتی ھے - البتّہ یہ ھوسکتا ھے کہ جس طرح آج عوام کی خاطر سے دنیا بھر کی زبانوں کو سادہ اور سہل بنانے کی کوشش ھو رھی اسی کوشش کے ساتھ ھندی اور اردو کو بھی ایک دوسرے کے قریب لاکر عوام کے قریب لایا جاے - یہ کام آسانی کے ساتھ جبھی پورا ھوسکتا ھے جب ھندووں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کی زبان سے چڑ نہ ھو - بلکہ ھر ھندو اور مسلمان ھندی اور اردو دونوں کو اپنی ھی زبان سمجھ کر اسی مطابق پڑھنا لکھنا بھی شروع کردے - اس طرح جہاں ان باتوں کا علم ھوگا جن کے

وسیلے سے ایک یا قریب قریب ایک مشترک زبان کا پیدا ہونا ممکن ہے، وہاں ہر شخص کو یہ آزادی بھی ہوگی کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی معلومات کے ذریعے اپنے فطری رجحان کے مطابق کسی بھی زبان میں لکھتے پڑھتے ہوئے خاطرخواہ کامیابی حاصل کرسکے۔ ایسی آزادی کا ہونا ایک خاص سبب تھا کہ کچھ قدیم مسلمان شاعروں نے ہندی میں لکھتے ہوئے ایسی زبردست کامیابی حاصل کی جو انھیں وقت اردو میں لکھنے سے نہ ہوسکتی تھی۔ یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ زبان کے معاملے میں انصاف و رواداری سے کام نہ لےکر اس آزادی کو ایک سرے سے مٹادینے کی کوشش کرنا، کسی ایک ہی بنیاد پر قائم ہونے والے علم و ادب کو دو ایسے تنگ دائروں میں محدود کردینا ہوگا جہاں مختلف علمی و ادبی رجحان والے دلوں کا خون ہوجائےگا اور جس کے لیے ہمیں بھارت کی آگے آنے والی نسلیں کبھی معاف نہ کریں گی۔ مگر یہ دیکھکر تسکین ہوتی ہے کہ اس آزادی کی تھوڑی بہت جھلک اب بھی نظر آرہی ہے اور ان کی بدولت دیوری ضلع ساگر کے سید امیر علی میر اور چرکانو (ضلع جھانسی) کے منشی اجمیری صاحب جیسے دو مسلمان شاعروں نے اس زمانے میں بھی ہمارے ملک میں پیدا ہوکر نئی اور پرانی دونوں طرح کی ہندی میں اپنی نظمیں لکھیں اور بعض میں زبان کی اس سادگی اور صفائی کو بھی بہ‌خوبی مدنظر رکھا جس کی آج بڑی ضرورت ہے۔ مگر اس ضرورت کے لحاظ سے اجمیری کا نمبر میر سے بڑھا ہوا ہے۔ دونوں نے اپنے کلام میں ظرافت کا مسالا بھی کافی رکھا ہے مگر کچھ نہ کچھ نصیحت کا پہلو بھی لیے ہوئے جس سے ظرافت زیادہ موثر اور دلکش ہوجاتی ہے۔ پھر بھی دونوں کا کلام قدیم مسلمان شاعروں کے روشن کارناموں کو دیکھتے ہوئے صرف ایک جھلک ہی کہے جانے کا سزاوار ہے جس کا ایک بہت بڑا سبب ہمارے وقتی ماحول کا بالکل بدلا ہوا ہونا ہے اور جس کا اثر معلوم یا نامعلوم طریقے پر دلوں پرپڑے بغیر نہیں رہتا۔ افسوس کہ سنہ ۳۷ ع میں ایک سال کے اندر ہی صرف چند ماہ کے وقفے سے دونوں کے دونوں وفات پاگئے۔ اور اب ان کی جگہ لینے والا کوئی مسلمان شاعر نظر نہیں آتا۔ میر صاحب پر میں اپنا مضمون بہت پہلے لکھ چکا ہوں جو ہندستانی (الہ‌آباد) کے جولائی سنہ ۳۷ ع والے پرچے میں چھپا تھا اور اب اجمیری صاحب پر لکھ رہا ہوں۔

اجمیری صاحب صرف شاعر نہ تھے بلکہ نثر بھی اسی عمدگی کے ساتھ لکھتے تھے۔ انھیں گانے کے فن میں بھی کمال حاصل تھا اور پچپن سال کی بڑی عمر میں بھی ان کی

آواز میں ایسی مٹھاس اور نرمی تھی کہ سنتے ہی بنتا تھا۔ ان میں بولنے کی بھی اچھی سکت تھی اور خود مقرر ہونے کے ساتھ کسی کی تقریر کی نقل بھی بالکل اسی کے لب و لہجے میں اور اسی آن بان کے ساتھ بڑی خوبی سے کرسکتے تھے۔ ان کی یادداشت اتنی زبردست تھی کہ بڑے بڑے جلسوں کی مفصّل رپورٹ کا ہفتوں بعد بھی لکھ دینا ان کے لیے بہت معمولی بات تھی۔ کہانی کہنے کا بھی ایسا اچھا ملکہ تھا کہ بڑے سے بڑا پیشہ‌ور قصّہ‌گو بھی ان کے مقابلے میں ٹھیر نہ سکتا تھا۔ طنز و ظرافت کے ساتھ حاضر جوابی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑگئی تھی۔

غرض کہ اجمیری صاحب کی ذات مختلف اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھی۔ انہی قابلیتوں کی بدولت مہاراجا ویرسنگھ والئ ریاست اورچھا (بندیل کھنڈ) نے انھیں سنہ ۱۹۳۳ اپنا درباری شاعر (راج ی) بنایا تھا اور اس وقت ان کی «مدھو کرشاہ» نامی منظوم کتاب پر ایک ہزار روپے کا انعام بھی دیا تھا۔ اس کے پہلے دسمبر ۱۹۳۲ع میں آل انڈیا ساہتیہ سمیلن جھانسی کے سالانہ اجلاس کے مشاعرے میں شاعر نے اپنی ایک نظم پڑھی تھی* جس پر اورچھا کی «ویریندر کیشوساہتیہ پرشد» نامی ہندی کے مشہور ادبی انجمن کی طرف سے ایک طلائی تمغہ ملا تھا۔ مگر ریاست کی ان ساری قدردانیوں کے باوجود بھی شاعر کے مزاج میں ایسا کھراپن تھا کہ وہ سچائی کی خاطر کسی ذاتی نفع و نقصان اور اپنی نرم‌مزاجی کی پروا نہ کرتے ہوئے کبھی کبھی مہاراجا صاحب تک سے بھی الجھ پڑتا تھا۔

اجمیری کی علمی لیاقت مسلّمہ تھی۔ یوں تو وہ ملک کی کئی زبانوں سے واقف تھے جنھیں وہ اپنی نقل کرنے والی خاصیت کی بدولت مختلف صوبائی طرز و انداز کے ساتھ بہت آسانی سے بول بھی لیتے تھے۔ پھر بھی انہیں خاص کر ڈنگل (راجستھانی زبان) اور برج‌بھاشا پر غیر معمولی قابو تھا۔ چناں‌چہ جب موجودہ دور سے تعلق رکھنے والے پرانی ہندی کے آخری زبردست شاعر بابو جگن‌ناتھ داس رتناکر نے جو برج‌بھاشا کی زندۂ جاوید تصنیف سورساگر کو ہزاروں روپے کے خرچ سے ایڈٹ کررہے تھے،

*اس نظم کا عنوان بندیل کھنڈ تھا۔ جس کی ابتدا اس بند سے ہوتی تھی: چندیلوں کا راج رہا چرکال جہاں رہے ہوئے ویرنرپ گنڈ۔ مون، برحال جہاں پر (چرکال۔ عرصے تک۔ ویرنرپ۔ بہادر راج) اور جس کے آخر میں بندیل کھنڈ کے ہندی شعرا کے نام بھی آگئے تھے: تلسی، کیشو، لال، بہاری، شری پت، گردھر، رس ندھ، رائے پروین، لچ ن، ٹھاکر، پدماکر۔ کوتا مندر کاش سکوی کتنے اپجائے۔ کون گناوے نام ۔ کس سے گن گائے۔

جون سنہ ۳۲ع میں انتقال فرمایا اور ان کے صاحب‌زادے بابو رادھے کرشن‌داس نے وہ سب مسالا بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کے حوالے کردیا تو سبھا نے اس بھاری کام کو پورا کرنے کے لیے منشی اجمیری کو منتخب کیا۔ کام بھی ہو چلا۔ مگر اجمیری کی کچھ شرطیں تھیں جو منظور نہ ہوئیں اور انھوں نے کئی ماہ کے بحث مباحثے کے بعد اس کام سے استعفا دے دیا*۔

اجمیری کتنے ذہین، طبّاع اور زودگو تھے اس کے متعلق شری سیارام سرن گپت نے اپنے ایک مضمون میں یوں لکھا ہے:—

«ان کی سوجھ بوجھ انوکھی تھی......بات کرتے کرتے چھند بناکر سننے والوں کو حیرت میں ڈال دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ آچاریہ (پنڈت مہابیر پرشادجی) ڈویدی نے فرمایش کی......منشی جی نے اپنے کچھ گیت پڑھے......دویدی‌جی بہت متاثر ہوے کہا آپ نے تو بھوشن کو مات کردیا۔ پاس ہی نازک‌خیال پنڈت رام‌چندرجی شکل بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا بھوشن میں ویسی زبان کی صفائی اور درستی نہیں مل سکتی»۔

منشی‌جی نے اپنے ہی ایک کبت کے ذریعے اپنا تعارف یوں کرایا ہے:—

سنسکرت سناؤں چند بھاشا میں بناؤں اور پنگل[۱] کو ڈنگل[۲] سمیت اپناؤں میں
مکھتیں[۳] بجاؤں تیوں ستار اور سرود باد[۴] دیس پردس کے دشیش[۵] گیت گاؤں میں
کتھا تتھا[۶] کیرتن[۷] کہانی اتہاس کہوں نانا[۸] راگ رنگ سوں رئیسوں کو رجھاؤں میں
مول مارواڑ جنم بھوم ہے بندیلکھنڈ ناؤں[۹] اجمیری چرگانو کو کہاؤں میں

وہ چرگانو ضلع جھانسی میں سنہ ۱۸۸۱ع میں پیدا ہوے تھے۔ ان کے والد کا نام بھیکاجی تھا۔ اپنے والد کے نام کی وجہ وغیرہ انھوں نے خود اپنے ایک طویل

---

*ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجمیری صاحب کے دل میں سبھا مذکور کی طرف سے کچھ ناراضگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں نئی ہندی کے نامی گرامی شاعر شری میتھلی شرن‌جی گپت کے چھوٹے بھائی شری سیارام شرن‌گپت جو خود بھی نئی ہندی کے نامور شاعر اور ادیب ہیں اجمیری صاحب کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:— «ناگری پرچارنی سبھا کاشی میں سورساگر کو ایڈٹ کرتے وقت انھیں کھانسی بخار کی شکایت ہوگئی تھی۔ وہاں کی محنت اور آب و ہوا ان کے ناموافق تھی۔ پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ جو کام ہاتھ میں لیا ہے وہ ادھورا نہ ہونا چاہیے مگر وہاں کچھ ایسی باتیں پیش آئیں کہ انھیں استعفا دے دینا ہی پڑا۔ وہاں سے لوٹ‌کر جب وہ گھر آئے تو ہم سب کو بڑی فکر ہوئی۔ میں نے کہا کہ «جن بدسلوکیوں کے سبب آپ کو استعفا دینا پڑا ہے، انھوں نے ہم پر یہ بہت احسان ہی کیا ہے، آج بھی میرا وہی خیال ہے»۔

۱ برج بھاشا ۲ راجستھانی بھاشا ۳ سے ۴ باجہ ۵ خاص ۶ اور ۷ بیان کرنا ۸ طرح طرح کے ۹ نام۔

مضمون میں جو «میرا اور گپت جی کا سمبندھ» (تعلق) کے عنوان سے جولائی سنہ ۱۹۳۶ ع میں روزنامہ پرتاپ (کان پور) کے چھپے شماروں میں مسلسل چھپا تھا یوں بیان کیا ہے: «میرے جنم سے پہلے انھوں نے (بھیکاجی نے) لڑکے کے لیے اجمیر کے پیر خواجہ معین الدین چشتی کی منّت مانی تھی۔ اس لیے میرا جنم ہونے پر انھوں نے میرا نام اجمیری رکھّا تھا۔ میری مادری زبان مارواڑی اور میری مقدمی زبان بندیل کھنڈی ہے۔ میرے پتاجی مارواڑ کے تھے۔ اور میرا جنم اگہن سدی سمبت ۱۹۳۸ کو چرگانو میں ہوا تھا۔ اس طرح میں مارواڑی ہوتا ہوا بھی بندیل کھنڈی ہوں»۔ اب ان کے منشی کہے جانے کی وجہ بھی اسی مضمون کے ایک اقتباس میں ملاحظہ ہو۔ «سمبت ۱۹۶۰ (سنہ ۱۹۳۰ ع) کی دیوالی کو داؤجی (شری میتھلی شرن گپت کے والد) بھی وفات پا گئے...... میں پہلے داؤجی کی نظمیں صاف کیا کرتا تھا۔ جب سے میتھلی شرن جی لکھنے لگے تب سے آپ کی نظمیں صاف کرنے لگا تھا۔ آپ نظم لکھ کر مجھے سناتے۔ میں......اپنی راے دیتا اور کہیں کچھ اصلاح بھی پیش کرتا۔ میری کسی اصلاح پر آپ بہت خوش ہوتے اور کسی پر بحث بھی چھڑ جاتی (جس میں) کبھی کبھی ہم زیادہ بھڑک بھی اٹھتے مگر پھر جلد ہی شانت بھی ہوجاتے۔ اس طرح آپس میں تبادلۂ خیالات اور بحث مباحثے کے بعد ایک راے قائم ہوجاتی اور تب میں اس نظم کو بڑھیا، مضبوط کاغذ پر سندر اچھروں میں لکھتا (اور) پھر وہ چھپنے کے لیے بھیج دی جاتی۔ ہر نظم کے لیے یہی دستور تھا۔ آپ کی طرف سے خطوط بھی میں ہی لکھتا تھا۔ آپ کبھی دستخط کردیا کرتے۔ اس طرح میں صلاح کار اور پرائیوٹ سکریٹری کا کام ساتھ ساتھ کرتا تھا۔ اس وقت سے مجھے لوگ منشی جی کہنے لگے»۔

کچھ آگے لکھنے کے پہلے یہاں یہ ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جن دو مضامین کا حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک تو خود اجمیری صاحب کا لکھا ہوا ہونے کے سبب بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا بھی اس لیے بہت مستند ہے کہ وہ ایک ایسے قابل شاعر و ادیب کا لکھا ہوا ہے جن کے گھرانے سے مرحوم کا بڑا گہرا لگاو تھا اور جو قابل مضمون نگار کے اس مجموعۂ مضامین میں چھپا ہے جس کا عنوان «جھوٹ سچ» ہے۔ دونوں مضامین بہت جامع و بسیط ہیں جن سے مرحوم کے سوانحی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے، لہذا ان کے حالات کے متعلق سب کا سب خود اپنے ہی الفاظ میں لکھنے کے بجاے مجھے یہ بہتر اور زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں انھی دونوں مضامین سے ضروری اقتباسات کو لیتا ہوا اپنے اس مضمون کی تکمیل

کروں جیسا کہ میں نے ابھی کچھ کچھ اوپر کی سطر میں کیا ہے ۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ناظرین کو ملک کے مشہور و معروف ہندی لکھنے والوں کی اور خصوصاً منشی جی کی طرز تحریر کا پتا چل جائےگا ۔

منشی جی کا تعلق گپت گھرانے سے کب اور کیسے پیدا ہوا اور گپت بھائیوں سے ان کی دوستی کس وقت شروع ہوئی اس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں :-

" وہ (دوستی) تو سمبت ۱۹۵۶ (سنہ ۱۸۹۹) سے ہوئی اور برابر بڑھتی گئی...... بڑے سیٹھ جی (گپت جی کے والد سیٹھ رام چرن) مجھے پہلے ہی سے جانتے تھے ۔ میں اپنے پتاجی کے ساتھ ان کے یہاں جایا کرتا تھا ۔ میرے پتا بوبکاجی بڑے گنی آدمی تھے ۔ ہم لوگ جیسلمیرراج کے باسی پالیوال برھمنوں کے بھاٹ ہیں ۔ پر ہیں مسلمان ۔ بادشاہی زمانے میں کبھی مسلمان ہوگئے تھے ۔ شاعری اور موسیقی یہ دونوں فن آبائی ہیں ۔ میرے پتا ان دونوں کے ماہر اور بڑے سبھا چتر آدمی تھے ۔ چرگانو کے مارواڑی راؤ بہادر سیٹھ گوبند رام جی نے انھیں چرگانو ہی میں بسایا تھا ۔ راؤ بہادر سے اور سیٹھ رام چرن جی سے عموماً ان بن رہا کرتی تھی ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی بڑھتی نہ سہ سکتے تھے ۔ میرے پتاجی کو تھا راؤ بہادر کا سہارا ، مگر وہ سیٹھ جی کے پاس آتے جاتے تھے ۔ سیٹھ جی ان کا بہت آدر کرتے تھے ۔ گنی کا آدر کرنا وہ اچھی طرح جانتے تھے ۔ سمبت ۱۹۴۹ (۱۸۹۲ ع) میں راؤ بہادر کا انتقال ہوگیا تب سے میرے پتاجی سیٹھ جی کی جانب خاص طور سے کھنچ گئے تھے ۔ سمبت ۱۹۵۵ (سنہ ۱۸۹۸ ع) میں میرے پتاجی نہ رہے ۔ سمبت ۱۹۵۶ کا قحط تھا ۔ باپ کا مرنا اور آدل کا پڑنا یہ کہاوت میرے حسب حال ہوگئی ۔ گھر کا بار ایک دم میرے اوپر آپڑا ۔ گھر میں ہم چار آدمی تھے ۔ میری ماں اور ایک چچی ، میں اور میری بیوی ۔ اس وقت میں اٹھارہ برس کا تھا ۔ میری یہ حالت دیکھ کر سیٹھ جی پسیج گئے اور انھوں نے مہربانی کرکے مجھے اپنا لیا ۔ اس وقت رام کشور جی (میتھلی شرن جی کے بڑے بھائی) ۱۶ برس کے اور میتھلی شرن جی ۱۳ برس کے تھے ۔ اس وقت سے میرا اور ان کا تعلق ہے " ۔

اس کے کچھ سال پہلے یہ سب کے سب مقامی اسکول میں پڑھتے بھی تھے جس کا ذکر یوں ہے :- " میں جب مدرسے میں پڑھتا تھا تب وہ بھی پڑھتے تھے ۔ میں ان سے اونچے درجے میں تھا ۔ تھا بھی تو پانچ برس بڑا ۔ ان دنوں چرگانو کا

مدرسہ تیسرے درجے تک تھا۔ درجے الٹے چلتے تھے.........میں نے تیسرے درجے تک تعلیم پائی۔ میں نے سمبت ۵۲--۱۹۵۱ (سنہ ۹۵--۱۸۹۴ء) میں مدرسہ چھوڑ دیا تھا۔ میں جب مدرسے سے نکلا تھا تو میرے والد نے مجھے دیس بدیس گھمانا شروع کردیا تھا۔ وہ اپنے ججمانوں کے یہاں جاتے تھے۔ مجھے ساتھ لےجاتے تھے"۔ ان کا یہ گھومنے والا سلسلہ بھیکاجی کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ جس سے ان کے دنیوی تجربے میں معقول اضافہ ہوا۔ سیارام شرن‌جی نے یوں لکھا ہے:--
"منشی‌جی نے اپنی زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ جب ان کے باپ مرے ان کی عمر ۱۶--۱۷ سال کی تھی......کمزور کندھوں پر گھرستی کا بوجھ آ پڑا تھا۔ روزی کے لیے انھیں دور دور تک اونٹ کی سواری پر گھومنا لازم ہوا۔ اس سفر میں انھیں نہ جانے کتنی مختلف طبیعتوں کے لوگ ملے، نہ جانے کتنے رنج و راحت، امید و یاس کے واقعات ان کے سامنے آئے۔ ان کا حافظہ اتنا زبردست تھا کہ برسوں بیت جانے پر بھی معمولی سے معمولی بات انھیں یاد رہتی تھی۔ ان کی یادداشت میں وہ سب باتیں آج بھی اسی دن کی تازگی کے ساتھ قائم تھیں"۔ مگر سیارام شرن‌جی کے متواتر تحریک پر عمل کرنے کی خواہش کے باوجود وہ اپنے خود نوشت حالات مفصل طور پر نہ لکھ سکے۔ ان کی زندگی کا بھی اچانک خاتمہ ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ منشی‌جی کی اسکولی تعلیم بہت ہی معمولی یا برائےنام تھی، پھر بھی خوش‌قسمتی سے جہاں ان میں آبائی خاصّہ تھا انھیں کم عمری ہی سے طرح طرح کی صحبتوں کے بدولت اپنے تجربے میں ترقی اور وسعت لانے کا برابر موقع ملتا گیا۔ اس کے علاوہ سیٹھ رام‌چرن (داؤجی) کی پدرانہ شفقت نے ان کو صرف فکر معاش سے بہت کچھ چھٹکارا ہی نہیں دےدیا بلکہ انھیں اسی راستے پر لگایا جس پر چل کر وہ ایک کام‌یاب شاعر و ادیب بن گئے۔ اس واقعے کو منشی‌جی نے یوں بیان کیا ہے:--
"میں بچپن سے اپنے والد کی باتیں سنتا آرہا تھا اور تین سال تک ان کے ساتھ سیر و سیاحت بھی کرچکا تھا اس لیے اس وقت بھی بہت سی باتیں جانتا تھا۔ کبت، سوئیا اور اشلوک کہتا تھا۔ کہانیاں سناتا تھا، پد بھجن گاتا تھا اور شعر بھی بنا لیتا تھا، مگر مجھے پنگل (عروض) کا گیان نہ تھا۔ میں یہ نہ جانتا تھا کہ کبت میں کتنے اچھر (حروف) ہوتے ہیں اور دوھے میں کتنی ماترائیں۔ میں تو وزن کی تول پر چھند بناتا تھا........پرتھوی‌راج راسو پڑھنے کے سبب مجھے چھندوں کی کتنی بحریں معلوم ہوگئی تھیں۔ پنگل کی باتوں کا گیان تو بعد میں مجھے داؤجی نے کرایا۔

اتنا ہی نہیں ، علم موسیقی میں بھی مجھی مدد دی ۔ انھوں نے اپنے ایک بنائے ہوئے پد سیکھنے کو مجھ سے کہا اور جتنے پد سیکھ کر (اور) گا کر انھیں سناؤں اتنی ہی چونیاں مجھے دینے کا قاعدہ بنالیا........پدوں کے علاوہ ایک راماین بنانا بھی انھوں نے ان دنوں شروع کردیا تھا اس کا نام تھا رہسّہ راماین ۔ وہ اسے لکھ کر مجھے دے دیتے تھے اور میں اسے صاف کرتا تھا ۔ کسی پد میں جہاں مجھے کچھ کسر جان پڑتی تھی ، میں انھیں بتلاتا........وہ بڑے خوش ہوتے کہتے ، تمھیں اتنا گیان ہے ، اسی سے ہم تم سے لکھاتے ہیں ۔ پھر مجھے وہ غلطی سمجھاتے ۔ کہتے ، دیکھو ! اس میں اتنی ماترائیں ہوتی ہیں ۔ اس میں ایک ماترا کم ہے......اس طرح ماترا کا فرق بتاتے........ان کی مجھ پر بڑی کرپا (نوازش) تھی ۔ انھوں نے مجھے پانچ بیگھے زمین بھی دی تھی ۔ سیٹھ بھگوان داس جی (داؤجی کے چھوٹے بھائی) بھی مجھ پر ویسی ہی کرپا کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنے گھی کے گودام میں میری چنگی مقرر کر دی تھی ۔ کسی دن پاؤ بھر ، کسی دن آدھ سیر اور کسی دن سیر بھر گھی مجھے مل جاتا تھا ۔ غرض کہ میری ہر طرح پرورش کی جاتی تھی "۔ آگے چل کر کہا ہے " داؤجی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے پانچ لڑکے ہیں اور چھٹے تم ہو ! تب سے میں انھیں اور وہ پانچوں بھائی مجھے اپنا بھائی ہی مانتے تھے ۔ داؤجی کی کہی بات کو ہم کوئی بھی نہیں ٹال سکتے ۔ اور میری ترقی کے بنیادی سبب تو داؤجی ہیں انھی کو میں اپنا ودّیا گرو (استاد) مانتا ہوں ۔ میرا جو کچھ ارتقاء ہے انھی کی کرپا کا پھل ہے اور انھی کے آشرواد (دعا) کا پھل ہے بھیّاجی (میتھلی شرن جی) کی شعرگوئی "۔

اس میں شک نہیں کہ شروع میں بھیّاجی کے والد نے اپنے بیاض پر ان کا لکھا ہوا ایک چھند دیکھ کر خوشی میں یہ آشرواد دیا تھا کہ تو مجھ سے ہزار گنی اچھی کوتا (شاعری) کرے گا ، مگر بھیّاجی کی بگڑتی ہوئی عادتوں کو سدھارنے ، انھیں پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کرنے اور سب سے بڑھ کر ان میں موجودہ زمانے کا ایک بہت بڑا ہندی شاعر بنانے میں شروع سے آخر تک اجمیری جی کا جیسا کچھ ہاتھ تھا اسے اجمیری ہی کے اس بیان میں ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ آئے دن کی اصلاح اور مدد کے بغیر گپت جی کو وہ عزت و شہرت مل سکتی تھی جس کے آج وہ بہمہ وجوہ مستحق ہیں :- " اس وقت (شروع میں) میتھلی شرن جی پتنگ اڑانے ، کشتی لڑنے ، تیرنے وغیرہ میں اپنا وقت گزارتے تھے ۔ عموماً ڈھیلا کرتا پہنتے تھے اور بڑا صافہ باندھتے تھے........یہ سب باتیں بھائی رام کشور کو اچھی

نہ لگتی تھیں، پر وہ آپ سے کہتے کچھ نہ تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میتھلی شرن بگڑ رہے ہیں، آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتے ہیں، بازار میں چاہے جہاں آلہا پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں، یہ سب باتیں اچھی نہیں ہیں۔ انھیں کسی طرح سدھارو۔ ابھی نہ سدھریں گے تو پھر سنبھلنا مشکل ہوجائے گا........بھائی رام کشور کی بات سن کر میں نے میتھلی شرن جی کی طرف دھیان دیا۔ پہلے میں آپ کو کہانیاں سنا سنا کر اپنی طرف مائل کرنے لگا........اس طرح کہانیاں سناتے سناتے میں آپ کو کبت اور سوّئے سنانے لگا۔ آپ کو عشقیہ پد پسند آئے۔ کئی پد آپ نے لکھ کر یاد بھی کرلیے۔ پھر میں نے سنسکرت کے اشلوک خوش آوازی کے ساتھ سنائے جو آپ کو بہت پسند آئے۔ کہا، ہمیں سکھادو۔ میں روز ایک دو اشلوک لکھ دیتا، اس طرح کوئی ۲۵، ۳۰ اشلوک میں نے سکھائے۔ اشلوکوں کی لے بھی آپ نے سیکھی۔ پھر تو بڑے زور سے اسی لے میں اشلوک پڑھنے لگے۔ میرے کہنے سے آپ نے اپنا وہ لباس بھی بدل دیا۔ خاکی رنگ کا وہ بڑا صافہ جو آپ باندھا کرتے تھے، مجھے دےدیا اور آپ پگڑی باندھنے لگے۔ آپ نے ان کھلاڑی لڑکوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ رویہ ھی بدل گیا۔ بعد کو مہینے دو مہینے کے لیے میں سفر میں چلا گیا۔ لوٹ کر دیکھتا کیا ہوں کہ آپ نے کئی کتابیں منگالی ہیں........ اور بہت سے اشلوک یاد کرلیے ہیں۔ میں خوش ہوگیا۔ پھر میں نے آپ کو گانا سکھانا شروع کیا........مگر میتھلی شرن جی کا وہ شوق زیادہ دن نہ چلا۔ آپ کو اپنی آواز اچھی نہ لگی، پس کچھ دنوں کے بعد آپ نے گانا سیکھنا چھوڑ دیا۔ مگر پڑھنے لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ شری وینکٹیش سماچار اور ہندی بنگباسی یہ دو ہفتہ وار اخبار آتے تھے۔ پھر پیچھے بھارت متر بھی آنے لگا۔ اخباروں کے علاوہ کاکا بھگوان داس کو ناولوں کا بھی بہت شوق تھا، ان دنوں چندر کانتا اور چندر کانتا سنتت کی دھوم تھی۔ ہم سب لوگ خوب پڑھتے تھے۔ بنگلہ سے ترجمہ کیے ہوئے جاسوسی ناول بھی آنے لگے تھے۔ بھرتری شتک، ہت اپدیش، چانکیہ نیت کئی پستکیں (کتابیں) میتھلی شرن جی نے منگالی تھیں۔ اس طرح وہ نوعمری کا زمانہ تفریحی مشغلوں میں گزر رہا تھا"۔

یہ تو نوعمری کے زمانے کی بات ہوئی۔ جب منشی جی کی حیثیت ایک اتالیق کی تھی۔ بعد کو وہ گپت جی کے صلاح کار اور پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ پھر اس کے بعد صلاح کار تو وہ آخر تک

رہے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے "اب مجھ سے اتنی محنت نہیں ہوتی اس لیے میں اتنا کام تو نہیں کرتا مگر نظموں کے متعلق مشورہ اب بھی دیتا ہوں۔ آپ جو نظم لکھتے ہیں، مجھے سنا دیتے ہیں۔ مجھے سنائے اور میری صلاح لیے بغیر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا۔ آپ نظمیں سناتے ہیں، میں مگن ہوکر سنتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اکثر آنسوؤں کی دھارا بہنے لگتی ہے۔ میں اپنی رائے دیتا ہوں اور کہیں ضروری سمجھتا ہوں تو اصلاح بھی جو باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد منظور یا نامنظور ہوجاتی ہے۔ یہ اصلاحی کام میں شروع ہی سے کرتا آیا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں مگر اب عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب تو بھیّاجی واقعی اتنی اونچی شاعری کرنے لگے ہیں کہ کبھی کبھی اس کا مطلب ہی میرے سمجھ میں نہیں آتا، سمجھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی میں اپنی آن بان نہیں چھوڑتا۔ جو بات بھرم (بھول) سے میری سمجھ میں نہیں آتی اسے تو میں مان لیتا ہوں مگر جو مشکل یا مہمل ہونے سے بھی سمجھ میں نہیں آتی اسے نہیں مانتا۔ اس کے بارے میں کہہ دیتا ہوں کہ جب میں نہیں سمجھتا تو میرے جیسے اور لوگ نہیں سمجھیں گے۔ اسے بدلیے۔ بھیّاجی کہتے ہیں کہ ہم تمھاری خوشی کے لیے بدلنے کو تیّار ہیں مگر یہ غلط نہیں ہے۔ پھر اسے میری خواہش کے مطابق بدل دیتے ہیں"۔

مختصر یہ کہ اجمیری جی کی گپت جی سے اتنی زیادہ قربت تھی اور گپت جی کی نظموں پر اجمیری جی کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ اکثر لوگوں کو گپت جی کی شاعرانہ اہلیت، صلاحیت اور کارگزاریوں کے متعلق بھی غلط فہمی ہو رہی تھی۔ خود اجمیری صاحب نے یوں لکھا ہے "کچھ بھولے بھالے اور انجان آدمیوں کی ایسی بات بھی سننے میں آتی ہے کہ لکھتا سب اجمیری ہے اور چھپتا ہے میتھلی شرن کے نام سے۔ یہ بات سن کر مجھے تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ تعجب تو کہنے والوں کے بھولے پن پر ہوتا ہے اور افسوس ہوتا ہے ان کی سمجھ پر.........بھیّاجی لکھ رہے ہیں ۳۵ برس سے اور میں نے لکھنا شروع کیا ہے سنہ ۱۹۲۰ء سے کل ۱۶ برس ہوئے*۔ ایسے شعر کہہ لینے کی سکت تو مجھ میں بہت دنوں سے ہے۔ جب ۱۳، ۱۴ برس کا تھا، جبھی شعر کہہ لیتا تھا۔ مگر پستک کے روپ میں میں نے کبھی کچھ نہیں لکھا تھا۔ ایسی میری پہلی نظم ہیملا ستّا ہے۔ میرے بڑے مہربان دوست شری گوروچرن نواس مشر**

---

* یاد رہے کہ وہ مضمون جس سے یہ سطریں لی گئی ہیں سنہ ۳۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ سحر

** رادھا سوامی مت والوں کے گرو مہاراج شری پنڈت برہمہ شنکرجی مشر مرحوم کے بڑے صاحب زادے۔ سحر

جو اب ڈپٹی کلکٹر ہیں سنہ ۱۹۲۰ ع میں قیصر گنج (بہرائچ) میں تحصیل دار تھے۔ میں ان سے ملنے قیصر گنج گیا تھا۔ وہیں میں نے وہ کتاب لکھی تھی۔ ۲۲ مارچ کو لکھنا شروع کیا اور ۲ اپریل کو ختم کردیا۔ منشی جی کو وہ کتاب پسند آئی۔ بولے، اسے کسی اپنے دوست کو ارپن کردینا۔ میں نے انھی کو ارپن کردیا۔ وہ پستک یہاں بھی سب نے پسند کی۔ بھیّاجی تو بہت ہی خوش ہوئے۔ تب سے بھائی سیارام شرن جی میرے پیچھے پڑگئے۔ ادھر میں نے جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر انھی کی تحریک سے لکھا ہے اور لکھتا ہوں*۔ مگر اپنی نظموں پر مجھے اتنا آنند نہیں ملتا جتنا بھیّاجی کی نظموں میں۔ میرا اور ان کا سمبندھ ہی ایسا ہے»۔

میرے خیال میں جہاں منشی جی اسی سمبندھ کے سبب اور سیارام شرن جی کے پیہم اصرار سے مجبور ہوکر تھوڑا بہت لکھ سکے وہاں ان کی وہ شاعرانہ امنگ جس کی بدولت وہ اور کچھ بھی لکھ سکتے، اسی سمبندھ کی نظر ہوکر اسی میں بالکل جذب ہوگئی تھی اور جو کچھ انہوں نے کیا اس سے زیادہ کرنا ان کے لیے غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہو، مگر سیارام شرن جی کے

*سیارام شرن جی یوں لکھتے ہیں «دس بارہ دن میں......انھوں نے اپنی مشہور کتاب ہیلاستا لکھ ڈالی۔ اسی کو دیکھ کر پہلے پہل میرے من میں آیا کہ کیا اچھا ہو، منشی جی ایسا ہی کچھ اور ادبی کام کریں......میں نے منشی جی کو تنگ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے برا نہیں مانا......کچھ لکھا بھی مگر موجی جیو تھے زیادہ دھیان نہ دے سکے (کہنے لگے) اب میرے لیے یہی ٹھیک تھا کہ پریم سے تمھاری رچناؤں (تصانیف) کا آنند لیتا رہتا مگر تمھاری لگاتار تحریکوں نے اس عمر میں بھی آرام نہ لینے دیا۔ اٹھایا، بٹھایا اور دوڑایا بھی۔ میں نے بہت کہا کہ میں کہیں گر کرا پڑوں گا پر تم نے میری ایک بھی نہ مانی۔ اس دوڑ دھوپ میں مجھے کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو، تمھیں میری کچھ تک بندیاں مل گئیں۔ تم ان سے خوش ہوتے ہو، اس سے مجھے بھی اطمینان ہے۔ ان میں سے یہ گوکل داس تمھیں سب سے زیادہ پسند ہے اس لیے اسے دلی دعا کے ساتھ تمھیں دیتا ہوں۔ لو بھیا! میرے اس سنانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقت میں ہوجاتے تھے ان کا دل ایسا ہی نرم، نازک، پرکیف اور جذبات سے بھرا ہوا تھا»۔ اس ستانے اور اس سے خود لطف اندوز ہونے کے متعلق شری میتھلی شرن گپت نے بھی اجمیری کی مدھوکرشاہ نامی منظوم کتاب کے دیباچے میں یوں لکھا ہے: «......بات کرتے کرتے چھند بنا لینا ان (اجمیری) کے لیے معمولی بات ہے......مگر اپنی شاعری کی طرف کبھی انھوں نے خاص توجہ نہیں کی......تاہم ان کی شاعرانہ قابلیت ایسی نہ تھی کہ وہ کام میں نہ لائی جائے۔ سیارام شرن کی لگاتار تحریکوں نے انھیں موج میں رہنے نہ دیا اور وہ «رام جی بڑا کشٹ دیا، کہہ کر کچھ لکھنے کے لیے اٹھنے پر مجبور ہوئے اور مجھے بھی ان کے «دوسرے کے دکھ میں ہنسی ہے»۔ سننے کا ایک اور موقع مل گیا»۔ خود منشی جی نے اپنی گوکل داس نامی کتاب کے شروع میں سیارام شرن جی سے خطاب کرتے ہوئے یوں لکھا ہے: «تم نے دیا تو کشٹ ہے پر تمھاری تمھارے ساتھ ہے، میں تمھیں آشیش (دعا) ہی دوں گا»۔

الفاظ میں « خود لکھنے کے بہ نسبت دوسروں کے اشعار میں اصلاح دینے اور انھیں مناسب مشورہ دینے میں ان کی شاعرانہ قوت آسودہ اور مطمئن ہوجاتی تھی۔ کوئی نیا شاعر آتا تو اسے معقول وقت دینے میں انھیں کبھی تامل نہ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ لکھ تھوڑا سکے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کے خصوصیت کی چھاپ ہے۔ لکھتے بھی بہت جلد تھے۔ ایک دن کہیں جاتے تھے انھوں نے ایک بڑے چھند میں ۵۰، ۶۰ سطریں تیّار کرڈالیں۔ آکر جب انھوں نے مجھے سنایا تو میں نے کہا ' ان سطروں کا بوجھ سر سے اتار کر کاغذ پر رکھ دیجیے '۔ منشی جی نے میری بات مان کر وہ نظم جتنی اس وقت تک تیّار ہوچکی تھی، لکھ کر رکھ لی...... مگر کاغذ پر اتار دینے ہی سے جیسے ان کا کام پورا ہوگیا۔ پھر وہ نظم کبھی پوری نہ ہوسکی »۔ آگے پھر لکھتے ہیں « منشی جی میں خودداری تھی........پھر بھی وہ اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں پہنچ کر وہ غرور میں بدل جاتی ہے۔ بڑے بڑے علما اور بڑے بڑے لوگ ان کے گن کا آدر کرتے تھے۔ راجا مہاراجاؤں تک میں ان کی عزت تھی۔ پھر بھی چھوٹے کہے جانے والے آدمی کے پاس بیٹھ کر اس کا جی بھر دینے میں بھی ان کے دل کو بڑی راحت ملتی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کرتا کہ گھر سے کہیں دوسری جگہ کے لیے نکلے ہیں اور بیچ میں کسی بڑھئی، لوہار، درزی کے یہاں جم گئے۔ گھنٹوں ان لوگوں کا دل بہلاؤ کرنے کے بعد ہی تب کہیں وہاں سے اٹھتے تھے۔ ایسے میں عموماً انھیں اپنے خاص کام کی سدھ بھی بھول جایا کرتی تھی.......اگر انھیں وقت کا خیال ہوتا تو وہ جتنا کام کرگئے ہیں اس سے بہت زیادہ کرگئے ہوتے.........رات میں سوتے بہت دیر سے تھے۔ ایک دو بجا دینا ان کے لیے سہل بات تھی۔ کبھی کبھی گھڑی دیکھ کر کہنے لگتے ' یہ غلط ہوگئی ہے ابھی اتنا وقت نہیں ہوا »۔

وقت کے متعلق خود منشی جی کا پروگرام بھی بہت دلچسپ ہے فرماتے ہیں: « تب تک (دوپہر لوٹے) میں بھی نہا کر اور کھانا کھا کر آجاتا ہوں۔ آپ (گپت جی) کی گدّی کے پاس ہی میرا آسن رہتا ہے.........گدّی کے ادھر ادھر کتنی ہی کتابیں پڑی رہتی ہیں۔ شام کو آپ پانچ بجے ہی بیالو (شام کا کھانا) کرلیتے ہیں۔ میں بیالو کبھی کبھی کرتا ہوں، روز نہیں۔ مجھے جب جو چیز کھانی ہوتی ہے، وہ اسی وقت بنوائی جاتی ہے۔ جب میں اپنی اچھا کی کوئی چیز بنواتا ہوں اور آپ کے بھتیجے آپ سے بھی پوچھتے ہیں کہ ددا تم بھی لوگے؟ تب کہتے ہیں، لاؤ بھائی!

منشی جی کا پرساد تھوڑا سا ہم بھی لےلیں - پھر مجھ سے کہتے ہیں " تمھاری بدولت ہمیں بھی مل جاتا ہے - ہے بھی بات ٹھیک ، کیوں کہ آپ بہت سادہ کھانا کھاتے ہیں...... اور میں ہوں ذائقےدار کھانوں کا شائق - آپ کو ہیں باسی پوری پسند! اس بات پر مجھ سے کھٹ پٹ ہوجایا کرتی ہے - میرا زیادہ وقت آپ ہی کے یہاں گزرتا ہے - عموماً روز ہی آدھی رات تک لطف صحبت رہتا ہے - نہ جانے کتنی راتیں ہم لوگوں نے جاگ کر ہی کاٹ دی ہیں - باتوں ہی باتوں میں سویرا کردیا ہے "-

گپت خاندان اور خصوصاً گپت جی کے ساتھ منشی جی کے اس ہر وقت کے گہرے میل جول کا قدرتاً یہ اثر ہوا کہ ایک طرف تو منشی جی کی بدولت گپت جی اور ان کے بھائی سیارام شرن جی* کی شاعری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا - اور دوسری طرف منشی جی کو بھی ہندو مذہب اور معاشرت سے پوری دلچسپی ہوگئی - بےشک اس میں منشی جی کے آبائی سنسکاروں کا بھی شمول تھا - چناں چہ وہ ہندوؤں کے کتھا پران سے بھی خوب واقف تھے - سور اور تلسی وغیرہ کے پد اس انداز سے گاتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے اور بھکتی میں بالکل مگن ہوکر جھومنے لگتے - سیارام شرن جی فرماتے ہیں :- " منشی جی جنم سے مسلمان ہوکر بھی سرشت سے ویشنو تھے......... ہندو دھرم سے ان کی عقیدت ایسی ہی اٹل تھی - بھکتی رس' والی شاعری سے ان کے آنسو بہ نکلتے تھے......... بہت دن پہلے منشی جی کو کوئی روگ ہوا......... اس سے انھیں بڑی چنتا ہوئی - اس وقت انھوں نے اپنا دستور بنالیا کہ وہ روزانہ......... مندر میں جا کر کیرتن کریں گے - تھوڑے ہی دنوں میں ان کا روگ آپ دور ہوگیا......... ان کا وشواش تھا کہ شدھ من سے جب کبھی وہ پرارتھنا کریں گے وہ یقیناً پوری ہوگی......... ہندو پن کا اثر ان پر اتنا زیادہ گہرا تھا کہ کبھی کبھی وہ مجھے ناگوار ہوتا تھا - کھانے پینے میں چھوا چھوت کا بچار کچھ کٹرائی سے کرتے تھے - کئی بار مجھے یہ شکایت ہوئی کہ آپ نے تو ہندوؤں کے عیب بھی اپنالیے ہیں - اتنے زیادہ ویشنو خیال کے ہوکر بھی وہ تنگ دل نہ تھے - اکثر دیکھا ہے کہ پیغمبر صاحب کی استتی (نعت) میں اردو کی ایک نظم گاتے گاتے ان پر محویت اور بےخودی چھا گئی ہے......... ہندو سنگھٹن کے سلسلے میں لوگوں نے کہا ، منشی جی آپ شدھ ہوکر ہندو ہوجائیے ، بچاروں سے تو آپ

*خود لکھتے ہیں کہ " میں شروع میں جب کوئی نظم لکھتا تو مشورے اور اصلاح کے لیے انھی کے پاس جانا پڑتا......... جب میری وہ کوئی نظم صاف کردیتے تو ایسا لگتا جیسے وہ میری نہ ہو "

ہندو ہی ہیں ۔ انھوں نے جواب دیا ایسا مجھ میں اشدھ کیا ہے جو میں شدّھی کرائے جاؤں ؟ شاید وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوؤں میں اس بل کی کمی پڑگئی ہے جس سے ان کے بیچ میں اپنے ہی اپنے بن کر نہیں رہ جاتے "۔

مزاج میں انتہائی بےتعصبی اور سادگی اور وضع قطع بھی بہت سادہ تھی ۔ کھادی کا لمبا کرتا ، دھوتی اور بڑی پگڑی اور ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا ڈنڈا ، اسی وضع میں وہ ہمیشہ رہتے اور اسی طرح وہ راج درباروں تک میں جاتے ۔ سدا خوش رہتے اور خود ہنسنے کے ساتھ ہی دوسروں کو بھی ہنساتے رہتے ۔ جس طرح ان کی باتیں بار بار سننے کی چیز ہوتی تھیں اسی طرح ان کے خطوط بھی بار بار پڑھنے کی چیز ہوا کرتے تھے ۔

منشی جی کو اندر اور باہر کی صفائی کا بڑی بہت خیال رہتا ۔ وہی بات لکھنے میں بھی برتی جاتی ۔ سیارام شرن جی کے لفظوں میں " کسی ایک جگہ زرا سا کٹ کٹ جانے پر پھر سے پورا کا پورا صفحہ لکھتے........میں بیسیوں بار دیکھ چکا ہوں "۔ وہ بڑے خوش نویس بھی تھے ۔

افسوس کہ ایسے باکمال شخص کا ۲۵ مئی سنہ ۱۹۳۷ع کی رات کو صرف پچپن سال کی عمر میں سرگباس ہوگیا ۔ یوں تو منشی جی کی صحت ایسی اچھی تھی کہ ظاہر میں ۴۰--۵۰ سال سے زیادہ نہ معلوم ہوتے تھے ۔ مگر قضا کو ان باتوں سے کیا واسطہ ؟ ایک پھوڑا تھا جس کا ہسپتال میں اپریشن بھی ہوا ۔ اس کے کئی دن بعد لو لگنے کا احساس ہوا اور بخار ہوگیا ۔ بخار کے ساتھ غشی بھی تھی ۔ جھانسی سے ڈاکٹر بلایا گیا تو اس نے زہرباد بتایا ۔ ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے سیارام شرن جی نے اپنے مضمون میں یوں لکھا ہے : "........ان کے جسم پر وہ پھوڑے موجود تھے جن میں سے ایک نے زہرباد بن کر ایک پکھواڑے کے اندر ہی ان کو ہمارے بیچ سے چھین لیا ۔ جس رات کو مرے اس شام ہی کو جھانسی کے ایک ہوشیار ڈاکٹر پورا اطمینان دلا گئے تھے کہ کوئی فکر کی بات نہیں........بھیّا نے کہا چلو منشی جی کو قبرستان تک اور پہنچا آئیں ۔ رات کو منشی جی کے مرنے سے ۱۰--۲۰ منٹ پہلے وہ وہاں سے ہٹ آئے تھے ۔ اس لیئے کسی نے بتایا کہ مرنے سے کچھ پہلے منشی جی نے بڑے زور سے کہا تھا " میتھلی شرن ! میتھلی شرن ! "........ منشی جی کے تین لڑکے ہیں........پورے بالغ........عجب ہیجان تھا........تینوں جیسے ایک ہی لوک کے تین مختلف نقشے ہوں ۔ سوچا یہاں سے ہٹ کر منشی جی ہی کے

درشن کیوں نہ کرلوں.........اندر جا کر جھک کر پرنام کیا، پیر چھوئے، مگر ان کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکا.........ارتھی (جنازہ) اٹھی - بہت بڑی تعداد میں ہندو مسلمان سب کے سب ماتم میں سر جھکائے ہوئے چپ چاپ!.........قبرستان میں اسی جگہ سے ملی ہوئی قبر کھودی گئی تھی جہاں ۲۰--۲۲ برس پہلے منشی جی ہماری بھابھی کو سلا آئے تھے - پتنی کی بغل میں آج بناسنکوچ سومکنے کے لیے ہی منشی جی نے دوبارہ بیاہ نہیں کیا تھا - وہاں کھادی کے صاف چادر پر وہ لٹادیے گئے تھے - بھیّا جنک پور اور اجودھیا کے تیرتھوں کی مٹی بالو اور گنگاجل ساتھ لے گئے تھے اسے چڑھانے کے متعلق مسلمان بھائیوں نے اعتراض نہیں کیا - بھیّا نے اسے مجھے سونپتے ہوئے کہا، لو چڑھا آؤ - میں نے مشین کی طرح سب کام کردیا - بھیّا مٹی دے کر آئے اور انھوں نے کہا، دیکھا تم نے اجمیری کی طرف؟ گویا انھوں نے اس طرف سے، اس لوک سے نگاہ پھیرلی ہو، کہیں دوسری طرف ان کا دھیان چلا گیا ہو - شکل کتنی مطمئن، سنجیدہ اور اس پر کتنا جلال ہے!......... منشی جی کو منوں مٹی کے نیچے چھپا کر ہم سب لوگ لوٹ پڑے.........» -

اس کے بعد ۳۰ مئی کو انھوں نے ہندی کے مشہور فسانہ نویس شری جینیندر کمار کو ایک خط میں لکھا تھا* اور انھی کو شری میتھلی شرن نے بھی

*اسی جگہ بیٹھ کر جہاں منشی جی اطمینان سے برسوں تک بیٹھے ہیں، اسی تکیے کا سہارا لے کر جیسے سر کے نیچے دبا کر منشی جی آس پاس آنند اور جیون کی دھارا بہاتے تھے آج یہ خط لکھ رہا ہوں۔ جی پر کیا بیت رہی ہے، جیسے اس کا علم نہیں ہو پاتا - بیچ بیچ میں بےچینی بڑھتی ہے، آنکھیں گیلی ہوجاتی ہیں اور نہ جانے من کیسا ہونے لگتا ہے - جیون میں جو سوناپن آگیا ہے وہ کیسے پورا ہوگا کچھ سمجھ میں نہیں آتا.........

منشی جی چلے گئے ہیں، اس پر کیسے وشواش کروں - وہ چلے گئے ہیں، خود ہم ہی انھیں قبرستان میں سلا آئے ہیں، خود ہم ہی ان پر منوں مٹی ڈال کر اس دن سب کے ساتھ اکیلے اکیلے لوٹ آئے ہیں - پھر بھی وشواش نہیں ہوتا، اتنی جلد وہ چلے کیسے گئے۔

معلوم ہونے لگتا ہے بازار، گھر یا اور کہیں کو تھوڑی دیر کے لیے چلے گئے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں آئیں گے - معلوم ہوتا ہے اپنا اونچا بلم لیے ہوئے کہیں سے تھکے تھکے آ کر وہ......... پھاٹک کے اندر داخل ہوئے.........آنکھیں نہ جانے کس طرح ان کا پھاٹک کے اندر آنا دیکھ لیتی ہیں پھر بھی وہ دکھائی نہیں دیتے!.........ان کا وجود آج وہم ہی وہم میں رہ گیا ہے.........یہ وہم بھی بہت نہ رہ سکےگا - جب تک ہے اسی سے جی بھرنے دو.........

کچھ سوچتے سمجھتے، کرتے، دھرتے نہیں بنتا.........بیچ رات کو منشی جی منشی جی کہہ کر جاگ پڑتے ہیں گھر کا سنگیت (موسیقیت) چلا گیا ہے.........» -

۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۷ ع کو یہ خط لکھا تھا " بھائی جینیندر جی - تار ملا، کیا کہوں، روتے روتے ہی جیون بیت رہا ہے - پربھو کی اچھا (خدا کی مرضی) - میں ٹھیک ٹھیک یہ بھی انومان (اندازہ) نہیں کر پارہا ہوں کہ میرا کیا کیا گیا ہے - تمھارا میتھلی شرن - ان خطوط سے گپت بھائیوں کے انتہائی رنج و الم کا اندازہ ہوسکتا ہے -

یہاں تک منشی اجمیری صاحب کی زندگی کے حالات زیادہ تر ان کے اور سیارام شرن جی کے الفاظ میں درج کرکے اب آگے ہم منشی جی کی منظوم کتابوں کے متعلق بھی بہت مختصر طریقے پر لکھنے کی کوشش کریں گے - ناظرین کو معلوم ہی ہوچکا ہے کہ وہ بہت تھوڑا لکھ سکے ہیں، پھر بھی یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے یہ بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ایک بلند پایہ شاعر کی زندگی تھی اور وہ موقع اور محل کے لحاظ سے عام اور خاص دونوں کے پسند اور دلچسپی کی چیز لکھ سکتے تھے - ان کی شاعری بیانیہ ہے، مگر خیالات کی خوب صورتی اور بندش کی برجستگی اور زبان کی صفائی سب کی سب ایسی ہیں جو کسی نوعیت کی شاعری کو اس کی شان کے شایاں بنا سکتی ہیں -

اجمیری کی پہلی تصنیف ہیملا ستّا ہے، جو لکھی تو بچوں کے لیے گئی ہے مگر بچہ، جوان، بوڑھا کوئی بھی کافی دلچسپی لیے بغیر رہ نہیں سکتا - یہ ایک چھوٹی سی ۴۲ صفحوں کی کتاب ہے جس میں مارواڑ کا ایک قصہ منظوم ہوا ہے - قصے کا ہیرو ہیملا نامی جاٹ ہے اور ستّا کو ستی کا مذکر سمجھیے - ہیملا اپنی بیوی کے مرنے پر اس کے ساتھ ستی ہوجانے پر آمادہ ہوا روتے روتے کہا " پران اپنے کھوؤں گا - سنتو کی ماں سنگ سنو ستّا ہوؤں گا " - مگر جب چتا میں بیٹھا اور آگ لگائی گئی تو وہ اکلا کر جھٹ کود چتا سے باہر آیا - اندھکار میں کسی نے دیکھ نہ پایا اور ایک پیلو کے پیڑ میں چھپ گیا بعد کو سوچنے لگا کہ گانو جاکر سارا حال کہہ دوں مگر خیال ہوا:

"جیتے جی کس بھانت[1] بھلا میں گھر جاؤں گا		جاؤں گا تو ہائے شرم سے مرجاؤں گا
یوں سب باتیں سوچ چت میں ہوئی اداسی		ہار انت[2] میں بنا ہیملا مرگھٹ باسی
اسی طرح سے بین بین کر گولر کھاتا		کبھی بکریاں پکڑ دودھ لگ کر پی جاتا
بارہ دن یوں وہاں آپ کو چھپا بتائے		جلنے کے بھی گھاؤ بھرے اچھے ہو آئے
ارے ہیملا آج تیرھیں ہوگی تیری		مال پوؤں کی یاد اسے آئی بہو تیری"

۱- طرح ۲- آخر کار

آخر پھر رات گئے نائی اپنی ناین کو ساتھ لیے اور ستّا کے گھر سے پائے ہوئے مال پوؤں کی گٹھڑی باندھے اپنے گانو کو جاتا ہوا وہیں سے گزرا اور اس جگہ ناین سے ہیملا کی خودکشی کی وجہ سے اس کے بھوت ہوجانے کا امکان ہنسی میں بتلایا تو :

کہو نہ ایسی بات بھلا یہ کون ٹھٹھولی ڈر لگتا ہے مجھے بکڑ کر ناین بولی

مگر ہیملا کو بات سوجھ گئی اور :

اٹھا ہیملا اور پکڑ کر پیڑ ہلایا ناین نائی ڈرے کمپ[1] تن میں ہو آیا
کالا کالا بال بکھیرے تنگ دھڑنگا دیا دکھائی ابھیں دور سے وہ مُ ٹنگا
« دڑو دڑو » کہ کود ڈرایا سنمکھ[2] آکر بھاگی ناین اور گرا نائی چلاّ کر
مال پوؤے لیے لوٹ ہیملا پیچھے آیا پر ناین کا پران پکھیرو لوٹ نہ پایا
پہنچ گانو میں بدحواس نائی چلاّیا « ارے ہیملا بھوت ہاے ناین کو کھایا»
اتنا کہ بےہوش ہوا تب گیا اٹھایا ستّا کے ست لگے سوچنے، ہے کیا مایا
اپچاروں[3] سے چیت[4] ہوا جب روتے روتے اس پرکار تب حال سنایا روتے روتے
تھا پورا پچیس ہاتھ کا وہ کالا سا بڑے بڑے تھے دانت ہاتھ میں تھا بھالا سا
« دڑو دڑو » کہ کود سامنے آللکارا بولی سے پہچان لیا تھا باپ تمھارا

غرض کہ بھوت کا شہرہ ہوگیا اور :

کوئی رات برات بھول کر ادھر نہ جاتا دن میں بھی وہ جگہ دیکھ دل دہشت کھاتا
اس پرکار[5] بن گیا ہیملا بھوت بڑا تھا مرگھٹ میں منحوس اکیلا چھپا پڑا تھا

پھر اسی طرح دہشت سے گانو کا مکھیا مرا۔ اور اس کی تیرھویں میں مال پوؤں کے لالچ سے ہیملا اس کے گھر میں یکایک گھس پڑا۔ جس پر کھانے اور کھلانے والے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس واقعے سے لوگوں نے گانو چھوڑ دیا اور قریب کے ایک دوسرے گانو (بڑا گانو نامی) میں چلے گئے۔

پڑاو
بڑے گانو میں کہیں ایک دن ایک سپاہی پہنچا گھوڑے چڑھا حکم جس کا تھا شاہی
بڑا تیز طرّار میاں بگّا چپراسی بنا ٹھنا تھا کہ تھی اوپری پیدا خاصی
آیا نائی نظر مٹی ساری حیرانی بولا « چل بے ادھر پلا گھوڑے کو پانی »
ابھی حجامت بنا اور نہلادے مجھ کو جلدی کر تعمیل حکم دیتا ہوں تجھ کو »

۱۔ لرزہ ۲۔ سامنے ۳۔ علاج ۴۔ ہوش ۵۔ اس طرح۔

اس پر نائی نے وهی تالاب بتایا جو بهوت والے گانو میں تها۔ اس پر سپاهی بولا:

"اچها تو چل وهیں چلیں"، گهبرایا نائی — من میں کہنے لگا هوئی چوپٹ چترائی
نائی کو چپ دیکھ میاں نے بهونہ چڑهائی — کیوں بے چپ هوگیا بول کر حرف اڑهائی

اس پر نائی نے هاتھ جوڑ کر وهاں کے بهوت کا حال بتایا اس پر چپراسی بولا:

"سن بے زندہ بهوت کچهری کے هم بگّے — جس کو هم لگ جائیں چهڑا دیں اس کے چهکّے

اور نائی کو مار مار کر وهاں جانے پر راضی کیا۔ وهاں میخ کے ساتھ اگاڑی پچهاڑی لگا کر گهوڑا باندھ دیا گیا اور چپراسی:

بیٹها بستر ڈال کهوپڑی صاف کرانے — نائی چهرا نکال لگا تها بال بنانے
چوکنّا هو ادهر ادهر وہ دیکھ رها تها — "ابے کدهر"، بس ابهی میاں نے یهی کہا تها
اتنے هی میں دیا هیملا دور دکهائی — بال بنانا چهوڑ اٹها اکلا کر نائی
"کیوں بے کیوں کیا هوا کاٹ بچهو نے کهایا" — "جاتا هوں لے دیکھ باپ تیرا وہ آیا"
اتنا کہہ کر بهاگ گیا جب نائی گهر کو — تب چپراسی اٹها دیکهتا هوا ادهر کو
دیکها سچ مچ بهوت ادهر آرها چلا هے — دهل گیا دل، بول اٹها یہ کون بلا هے
"دڑو دڑو" کا شبد[1] بهیانک دیا سنائی — ادهر نہ دیکها گیا دیہ[2] ساری تهرائی
کس گهوڑے کو چڑها شیگهر[3] بس کهول اگاڑی — گهبراهٹ میں گیا کهولنا بهول پچهاڑی
سنا دوبارہ "دڑو دڑو" کہہ "گهوڑے گهوڑے" — ایڑ لگائی اور سڑاسڑ مارے کوڑے
چرا، پیا تیار خوب تها ٹانگن بونٹا — مارا جهٹکا، اکهڑ گیا پیچهے کا کهونٹا
بهاگا گهوڑا چال لگی جیسے هی بڑهنے — لگی تڑاتڑ میخ سپاهی کا سر گڑهنے
سمجها اس نے یہ کہ مارتا بهوت مجهے هے — بولا "اب مت مار دهرم کی قسم تجهے هے"
اچهل اچهل کر میخ جهٹکے سے جهڑتی تهی — کهٹی کهٹائی صاف کهوپڑی پر پڑتی تهی
هنسا هیملا ادهر تالیاں خوب بجا کر — گرا گانو کے پاس ادهر چپراسی جا کر

وہ بهی آخرش مر گیا۔ یهی حشر ایک جهاڑ پهونک والے خلیفہ جی کا بهی هوا۔ اور ستّا کی دهاک خوب جم گئی۔ بالآخر ایک ٹهاکر صاحب نے همت سے کام لیا اور سسرال جاتے وقت کچھ اپنے نارضامند ساتهیوں کے ساتھ اسی تالاب پر ڈیرا ڈالا۔ حقہ پی رهے تهے اور پاس هی بهری بندوق رکهی تهی۔ لوگوں کو دهیرج دیے جاتے تهے۔ اتنے هی میں هیملا "دڑو دڑو" چلاتا هوا سامنے سے کود چلا۔ لوگ

۱۔ خوف ناک آواز ۲۔ جسم ۳۔ جلدی۔

ڈرکر چلا اٹھے مگر ٹھاکر صاحب نے اپنی بندوق اٹھا کر سیدھی کرلی اور ھیملا کو چپ چاپ پاس چلے آنے کا حکم دیا ۔ ھیملا بندوق کے خوف سے سوچا :

« جو کچھ کہے اسے کرنا ھی ھوگا ۔ نہیں ابھی بےموت مجھے مرنا ھی ھوگا ۔ »

اور پاس جا کر ٹھاکر سے اپنا سارا ماجرا بیان کردیا ۔ ٹھاکر نے اسے ساتھ لیا اور اپنے نائی کے پیچھے اونٹ پر بٹھایا ۔ نائی ڈر تو رھا ھی تھا کہ ھیملا کو چھینک آ گئی اور چھینک کے ساتھ نائی بھی اونٹ سے گر کر ختم ھوا ۔ اس پر ٹھاکر اس « بھوت » کو سسرال نہ لے جا کر بڑا گانو لے گئے اور وھاں لوگوں کو بلا کر انھیں سب حال بتادیا ۔ آخر سب سمجھ گئے اور یوں ٹھاکر کے ھاتھوں ستّا کا ادھار ھوا ۔ ستّا نے آخر میں ٹھاکر سے کہا :

« ناتھ رھوں گا سدا آپ کے میں گن گاتا ۔ آپ نہ ملتے بھوت بنا ھی میں مرجاتا »

مدھوکر شاہ ۳۴ صفحوں کی چھوٹی سی کتاب میں اسی نام کے اورچھا (بندیل کھنڈ) کے مہاراجا کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر ھے ۔ ایک روز شہنشاہ اکبر نے سب راجوں مہاراجوں کو دربار میں بلا کر یہ حکم دیا کہ کوئی تلک لگا کر نہ آئے ورنہ گرم لوھے سے ماتھا داغ دیا جائے گا ۔ سبھی نے حکم کی تعمیل کی اور بلا تلک کے حاضر ھونے مگر مدھوکرشاہ نے اس دن اور بڑا ٹیکا لگایا ۔ دربار میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا :

« مدھوکرشاہ آپ مجھے جانتے ھیں کیا ۔ اور کہیں اپنے کو آپ مانتے ھیں کیا »؟
اورچھا ادھیش لگے کہنے جہاں پناہ ۔ جانتا ھوں آپ کو میں بھارت کا بادشاہ
اور اپنے کو مانتا ھوں آپ کے آدھیں ۔ ....

اس پر اکبر نے عدول حکمی کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا :

« دھرم مجھے پرانوں سے پچاسوں گنا پیارا ھے ۔ دھرم ھی تو لوک پرلوک کا سہارا ھے
تلک لگانا دھرم مرا ھے سدا ھی سے ۔ دھرم چھوڑ سکتا نہیں میں حکم شاھی سے »

اس پر سب راجے مہاراجے هراساں اور ششدر رہ گئے مگر :

.... ۔ بولے بادشاہ واہ مدھوکر شاہ، واہ »۔
آپ ھی نے نت نیم اپنا نبھایا ھے ۔ جان پر کھیل کر تلک لگایا ھے
مجھ کو نہیں ھے چڑھ تلک لگانے سے ۔ میں نے جانچ کی تھی اس حکم کے بہانے سے

"آفریں ہے آپ کے انوکھی آن بان پر - خوش ہوگیا ہوں میں سچائی اور شان پر
آب ہی کے نام سے لگایا اب جائے گا - مدھوکر شاہی یہ ٹیکا کہلائےگا"

بندیل کھنڈ میں آج بھی مدھوکر شاہی تلک لگایا جاتا ہے - (یہی قصے کا خلاصہ ہے)

گوکل داس بھی ۳۴ صفحوں کی چھوٹی کتاب ہے - مہارانا پرتاپ کے بھائی مشکتی سنگی کے خاندان میں گوکل‌داس تھے ان کی اولاد ساور اجمیر میں اب بھی موجود ہے - ساور کا پرگنہ جاں‌بازی اور بہادری کے صلے میں شاہ جہاں سے جاگیر میں ملا تھا - ساتھ ہی خلعت اور منصب بھی -

گوکل‌داس بڑا سخی تھا اور منھ مانگی مراد پوری کرتا تھا - جس مہاراجا کا وہ سردار تھا اس نے ایک چارن (بھاٹ) کو بہت بڑے انعام کا لالچ دےکر نیچا دکھانے کو بھیجا - اس نے جا کر یہ سوال کیا کہ دلی کے تخت پر زرا دیر بیٹھنا چاھتا ہوں - سردار نے منظور کرلیا اور اپنے پانسو چنے سپاہیوں کے ساتھ (چارن کو بھی لیے ہوے) روانہ ہوگیا اور ایک روز بڑے سویرے دلی کے قلعے میں کشت و خون کرتا ہوا گھس پڑا - اس پر چارن نے سوچا کہ آخر میں بھی مارا جاوں‌گا اور یہ بھی - پس اس نے راستہ روک کر اور خودکشی کی دھمکی دےکر عرض کیا کہ بس میں دلی کے تخت شاہی پر بیٹھ چکا - اب آپ لوٹ چلیں - میری منھ مانگی مراد پوری ہوچکی اس پر گوکل‌داس اسی تیزی سے مع اپنے سواروں کے واپس ہوا قلعے میں ہل‌چل مچ گئی - شاہی فوج نے دو چار کوس تک دوڑ دھوپ کی مگر کوئی پتا نہ چلا چارن نے لوٹ کر سردار کے بھرے دربار میں اس کی تعریف کی - (یہی خلاصہ ہے)-

یہ تینوں کتابیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے انھیں بہت چلتے ہوے طریقے پر لکھا ہے مگر اس کی زبردست ادبی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت کا اظہار تو چترانگدا نامی ۶۴ صفحوں کی ایک منظوم کتاب سے ہوتا ہے جو ترجمہ ہوکر بھی ترجمے کی خامیوں سے ایک دم پاک و صاف ہے اور جس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ موافق حالات کے ہوتے ہوے شاعر کے دل و دماغ سے نہ جانے کیسے کیسے اعلیٰ کارناموں کی تکمیل ہوسکتی تھی - یہ کتاب فن مصوّری کے ماہر و نقّاد جناب این، سی، مہتا صاحب آئی، سی، ایس کے نام نامی پر معنون ہے - نظم ردیف و قافیہ کی قید سے آزاد ہے اور ملک‌الشعرا ٹیگور کے چترا کا ترجمہ ہے -

منشی برندابن لال ورما جھانسی کے ایڈوکیٹ اور ہندی کے بہت مشہور تاریخی ناولسٹ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں :- پوری دل‌کشی اصلی بنگلہ نظم میں ہوگی جس سے یہ ترجمہ ہوا ہے ۔ مگر میں بنگلہ نہیں جانتا، اس لیے اصل کتاب کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ مگر شاعر نے خود اصلی نظم کا چترا نامی جو انگریزی ترجمہ کیا ہے اسے اس ہندی ترجمے سے ملاکر میں نے پڑھا ہے ۔ کہتے زرا ڈر لگتا ہے مگر بےکہے جی نہیں مانتا کہ شاعر کے اپنے کیے ہوے انگریزی ترجمے سے یہ ترجمہ بڑھ کر ہے........کھڑی بولی کی بےتک والی نظم میں مترجم نے اپنے موثر اور پرزور بیان کے ساتھ ہی حلاوت اور موسیقیت کو بھی زیادتی سے بھردیا ہے ۔ کہیں کہیں تو مترجم کی زبان میں غضب کی مستی ہے ۔ واقعی اسی ایک چھوٹی سی کتاب سے شاعر کی اس زبردست شاعرانہ قابلیت اور صلاحیت کا بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے جن سے کام لینے پر وہ نہ جانے کیسے کیسے ادبی کارناموں کی تکمیل کرسکتا تھا ۔

چترانگدا منی‌پور کے راجا کی اکلوتی لڑکی ہے جس کی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت سب، لڑکے کی طرح ہوئی ہے ۔ وہ بھی اپنے کو راج کمار ہی سمجھتی ہے مگر مہابھارت کے زمانے میں جب ارجن بارہ سال کے لیے ہستناپور چھوڑکر یاترا پر جاتے ہوے وہاں پہنچتے ہیں اور چترا انھیں بن میں سوتا دیکھ پاتی ہے تو کہتی ہے :

میں نے پرشوں کی سیکھ کے
ودیا اور ویش[1] بھی، انھیں کے سنگ ساتھ سے
بھولی اب لوں[2] جو رہی، دیکھ اسی مکھ کو
اس اپنے ہی آپ آوچل[3] مورتی کو
دیکھ اسی کال[4] میں نے جان لیا من میں
ناری ہوں میں ۔ دیکھا کھڑا سامنے اسی گھڑی
میں نے پہلے ہی بار پرش.........

راج‌کمار کی طرح پالی پوسی ہوئی راج‌کماری کو اپنے پسند والے مرد کی صورت دیکھ‌کر دل کے فطری ایما سے کس طرح خود عورت ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ اسے شاعر نے بڑی سندرتا سے دکھایا ہے ۔ احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ :

« دوسرے ہی دوس[5] پربھات[6] کو
پھینک دیا پرش پر[7] چھد اتار کے ۔

۱ ۔ بھیس ۲ ۔ تک ۳ ۔ نہ ہلنے والی مورت ۴ ۔ وقت ۵ ۔ دن ٦ ۔ صبح ۷ ۔ کپڑا

پہنی سرنگ ساڑی کانچی[۱] اور کنکنی[۲]
کنکنوں[۳] سمیت - اَن ابھیست[۴] ساج لجّا سے
انگ جکڑے سے رہی سنکچت[۵] بھاو سے
نرجن[۶] میں........»

راج کماری نے عورت کے کپڑے اور گہنے پہن تو لیے مگر اسے عادت نہ ہونے کے سبب اس سجاوٹ کی شرم سے سونی جگہ میں سنکوچ کے مارے اپنے ہر عضو کو جکڑے سی رہی (گویا اسے اپنے آپ سے لاج آرہی تھی ، پھر بھی فطرت سے مجبور تھی)

پھر وہ کام دیو نامی عشق کے دیوتا سے اپنی عاجزی بیان کرتے ہوئے یوں ملتجی ہوتی ہے :

« ہے اننگ دیو ، سب درپ[۷] ایک دنڈ[۸] میں
چھین لیا میرا - سب ودیا اور بل بھی
ڈال دیا آپ کے پدوں[۹] میں - دیو ، اب تو
اپنی ہی ودیا مجھے آپ سکھلائیے
کیجیے پردان[۱۰] بل ابلا[۱۱] کا »

آخر دونوں ملتے ہیں بعد کو جب ارجن چترانگدا کا نام دھام پوچھتے ہیں تو وہ کہتی ہے :

« پربھات میں ہے جو یہ جھولتی
کنشک[۱۲] کے ایک نو پلّو[۱۳] کے چھور پہ
ایک بُوند اوس ، کچھ نام دھام اس کا
ہے کیا ؟ اس کا بھی پتا کوئی پوچھتا ہے کیا ؟
چاہا تم نے ہے جسے ، بس ، وہ ایسی ہی
نام دھام[۱۴] ہیں ایک اوس کی سی بوند ہے »

ارجن پوچھتا ہے :

« بندھن نہیں کیا کچھ پرتھوی پر اس کا ؟
ایک بوند سورگ[۱۵] بس ، بھوم پر بھول سے
ٹپک پڑا ہے » ؟

---

۱ - کمربند ۲ - کردھنی ۳ - کنگن ۴ - بلا عادت کے ۵ - سکوچ کے خیال ۶ - سونی جگہ
۷ - غرور ۸ - لمحہ ۹ - پانو ۱۰ - عطا کیجیے ۱۱ - عورت ۱۲ - ٹیسو ۱۳ - نیا پتا
۱۴ - نام دھام سے خالی ۱۵ - جنت

جواب ملتا ہے :

« بس ٹھیک یہی بات ہے
کیول[1] نمیش[2] بھر کے ہی لیے اپنی
اجوّل[3] دی ہے اس بن کے کسم کو »

منشی جی کی متفرق نظمیں بھی بہت انی گنی اور قابل قدر ہیں ان میں تاج محل نامی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اد آشچریہ اکھل اونی کے او سمادھ سکھ کے بھوگی
او آنند نرانندوں کے او جمنا تٹ کے یوگی

(اے کل روے زمین کے عجوبے اور اے سمادھی (مراقبہ) کے سکھ اٹھانے والے ۔ اے غمگینوں کی خوشی (اور) اے جمنا کنارے کے جوگی) ۔

یدّپی مرت ممتاز محل کا ہے تو نرمل نمرت نواس
پر تجھ پر آدرشیہ انکت ہے اتل آگرے کا اتہاس

(اگرچہ تو مری ہوئی ممتاز محل کی صاف اور امر قیامگاہ ہے ۔ مگر تجھ پر بے مثل آگرے کی تاریخ پوشیدہ طور پر درج ہے) ۔

سب کو سگم نہیں ہے تیری سانکیتک سرلپ کا گیان
کٹھن اور بڑی ہے کانوں کو بھاوؤں کی بھاشا کا بھان

(تیری اشاروں والی آواز تحریر کا گیان سب کے لیے آسانی سے جاننے کے قابل نہیں ہے (پھر تیری) جذبات کی بھاشا کا جان لینا اور بڑی مشکل ہے) ۔

ہے تیرا ادیش ۔ « کشٹ نج کو جتنے ہیں ہونے دوں
بیگم بادشاہ سوتے ہیں ، انہیں شانت سے سونے دوں »

(تیرا مدّعا ہے کہ خود کو جو بھی تکلیف ہے ہونے دوں ۔ (مگر) بیگم (ممتاز محل اور) بادشاہ (شاہجہاں جو یہاں) سو رہے ہیں انہیں شانتی سے سونے دوں) ۔

اب اخیر میں ایک کنجڑے کی کہانی بھی سن لیجیے جو اپنی سادگی اور سبق آموزی میں نہایت دل کش ہے :—

« بڈھا ہو سب سے زیادہ جو » بادشاہ نے کہا « وزیر »
ایسا ایک آدمی ڈھونڈو ، ہو غریب وہ یا کہ امیر »
« بڑا حکم » کہ کر وزیر نے دلی بھر میں ڈھونڈوایا
بڑی کٹھنتا[4] سے تب ویسا وردھ[5] ایک کنجڑا پایا

۱ ۔ صرف ۲ ۔ لمحہ ۳ ۔ سفیدی چمک ۴ ۔ مشکل ۵ ۔ بڈھا

«کتنے بادشاہ دیکھے ہیں» دلی پت[1] نے پرشن[2] کیا
تب ڈرتے ڈرتے کنجڑے نے تین چار کا نام لیا
کچھ رک کر تب بادشاہ نے کنجڑے سے اس طرح کہا
«ان تینوں شاہوں میں سب سے اچھا کس کا راج رہا» ؟
ہاتھ جوڑ بولا «حضور، میں ہوں غریب کنجڑا ناچیز
شاہنشاہوں کے بارے میں دے سکتا ہوں کیا تجویز» ؟
«ارے بھلے مانس، کچھ تو کہہ» ! تب پھر زرا دیر کے بعد
ہاتھ جوڑ کر بڈھا بولا «ایک بات ہے مجھ کو یاد»
بڈھا بولا «تیے حضور کے دادا صاحب شاہنشاہ
نوجوان تھا میں، پر میرا تب تک نہیں ہوا تھا بیاہ
گزر چکے تھے باپ اور ماں، میں لاچار اکیلا تھا
اسی سال، اس دن، جمنا پر بڑی تیج کا میلا تھا
چہل پہل تھی خوب اچانک ایک بڑی آندھی آئی
ہوا رنگ میں بھنگ، پڑ گئی بھگدڑ، اندھیاری چھائی
بھاگ بچا میں اس آندھی سے، گھر پہنچا گرتا پڑتا
اتنے میں آ گیا مینھ بھی، مانو آندھی سے لڑتا
ویسے میں، آندھی پانی کے اس چکر میں پڑی ہوئی
ابلا ایک اچانک میرے گھر میں آ کر کھڑی ہوئی»
میں نے کہا «ڈرو مت، اپنا سمجھو مجھے سگا بھائی»
تھی گھبرائی ہوئی دلاسا دیا کھاٹ پر بٹھلائی
میں کچھ ہٹ کر، نیچے بیٹھا، ایک ٹاٹ کا ٹکڑا ڈال
لگا اسے پھر ڈھارس دینے اور پوچھنے اس کا حال
«بہو سیٹھ کی» کہہ کر، اپنا پورا پتا دیا اس نے
نام، مکان، محلہ، مجھ کو سب کچھ بتلا دیا اس نے
میں نے کہا، «بہن، کل تیرے گھر تجھ کو پہنچا دوں گا
بڑے سویرے جا کر، اپنے ساتھ انہیں لے آؤں گا

۱ - دل کا بادشاہ ۰ ۲ - سوال

سیٹھانی تو بہن اور میں مسلمان کنجڑا بھائی
ھنس بولی وہ " پرمیسر کی بڑی دین میں نے پائی
تب میں نے پھل کھلا، پلایا اسے صاف ستھرا پانی
برسا کا کھپریلوں پر سے گرتا ھوا آسمانی
لاکھوں کے گہنے پہنے وہ، سکھ سے سوئی وہ پانو پسار
اور رات بھر جگا کیا میں بن کر اس کا پہرے دار
بڑے سویرے جا پہنچا میں رھتی تھی وہ بہن جہاں
کھوج بھو کی کرتے تھے سب " ھائے ھائے " تھی مچی وھاں
بڑے سیٹھ سے مل کر میں نے اسے حال سب بتلایا
خوش ھوکر وہ میرے گھر پر خود ڈولی لے کر آیا
وہ لڑکی تیار ھوئی جب جانے کو اپنے سسرال
حسب حیثیت اسے دیا تب میں نے سو پچاس کا مال
کہا " بہن کیا دوں تجھ کو تو اپنے گھر کی رانی ھے
تیرے اس غریب بھائی کی لے یہ پریم نسانی ھے "
بیاہ دوسرے برس ھوگیا، تب بی بی گھر میں آئی
اپنے ساتھ کئی باتوں کا میرے لیے فکر لائی
بھرم جال میں بھول گیا سب، پر لگی عمر ڈھلنے
تب اس سیٹھانی والی وہ رات لگی مجھ کو کھلنے
سوچا کرتا میں کہ " ھوگئی مجھ سے کیسی بھاری بھول
اس کے وھی جڑاؤ زیور جاتے تھے آنکھوں میں جھول
چاندی، سونا اور جواھر، اوھو تھا لاکھوں کا مال
لیتا سب اتار، پھر دیتا گھر سے باھر اسے نکال
میں بن کر لکھپتی، مزے سے موج اڑاتا من مانی
گھر آئی لچھمی پھیردی میں نے کر کے نادانی "
کہا چونک کر بادشاہ نے " دادا صاحب جیتے تھے "
بڈھا بولا " انھیں گئے تو بہت برس ھو بیتے تھے
تھے غریب پرور حضور کے والد صاحب ۔ شاھنشاہ
بڑے بہادر، بڑے رحم دل، کیا منصف مزاج تھے واہ "

بادشاہ نے کہا کہ « اب کیا تیرے دل میں آتی ہے ؟
کیا اب بھی وہ یاد جاگ کر تیرا جگر جلاتی ہے » ؟
بڈھا بولا « اب ؟ حضور ! بس، اب کی نہ پوچھیے بات
کیا بتلاؤں، تب سے اب سو گنی سالتی ہے وہ رات
نادانی سے اس جنّت کی نعمت سے منھ موڑ لیا
ہائے ! چاند کے اس ٹکڑے کو بہن بنا کر چھوڑ دیا
بی‌بی اسے بناکر اپنے گھر میں اس دن رکھ لیتا
تو جیتے جی ہی بہشت کا سواد یہیں میں چکھ لیتا »
آنکھ بند کر بادشاہ نے تین بار « توبہ » کی
اور کہا « سب تو کہہ ڈالا، رہا اور اب کیا باقی ؟
سنا وزیر ؟ اف ! ایسا تھا دادا صاحب کا اقبال
رہی رات بھر پاس پری‌رو لیے ہوئے لاکھوں کا مال
پر خیال اس نوجوان کا کہیں زرا بھی بد نہ ہوا
انسانیت، اصول، فرض کا فتویٰ دل سے رد نہ ہوا
پر ویسا اقبال بعد میں والد صاحب کا نہ رہا
جھوٹے لالچ کے دریا میں یہ کنجڑا بے‌طرح بہا
وہ لاحاصل ہوس مگر بس، زیور تک ہی رہی ادھر
اس کے روپ اور جوبن کا اس کے دل پر نہ تھا اثر
پر اب مرنے کو بیٹھا ہے اور نیت کا ہے یہ حال
بس میرا اقبال یہی ہے، کنجڑے نے کردیا کمال
تین پیڑھیوں میں اتنا پڑگیا فرق افسوس وزیر
بیٹھ گیا میرا دل سن کر اس بڈھے کی یہ تقریر
خیر کرے بس، خداوند، مجھ گنہ‌گار کو معاف کرے
میری رعیت کو خلیق، خوش‌حال اور اشراف کرے »
تب « آمین » کہا سب نے پھر بادشاہ نے حکم دیا
تدنسار دے‌کر وزیر نے اس بڈھے کو بدا کیا

خالق باری کے طرز کے تین بہاری مخطوطات

از جناب مختار الدین احمد آرزو فاضل شمسی

[یہ مختصر لیکن قابل قدر مقالہ اردو کانفرنس، دہلی میں پیش کیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی - فاضل مقالہ نگار نے جن رسالوں پر تفصیل سے لکھنے کا وعدہ کیا تھا، امید ہے کہ وہ اسے پورا کریں گے - مدیر]

« خالق باری » کے مصنف حضرت امیر خسرو ہوں یا کوئی دوسرے، ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور ہر زمانے میں قبولیت کی نظر سے دیکھی گئی - اس طرز پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں اور کتنوں نے اس کی پیروی کی لیکن اسے کیا کہیے کہ انہیں وہ قبول عام حاصل نہ ہوسکا جو « خالق باری » کو حاصل ہے۔ سال تصنیف سے لےکر اب تک معلوم نہیں کتنی نقلیں لی گئیں، اور ہندستان میں پریس آجانے کے بعد معلوم نہیں کتنی مرتبہ چھپیں -

« خالق باری » کے انداز پر کتنی لکھی گئیں یہ صحیح طور پر بتانا مشکل[1] ہے لیکن اکثر بعض قدیم کتب خانوں میں اس قسم کے رسالے مل جاتے ہیں ۔ گجرات[2] میں بھڑوچ کے قریب ایک قصبہ انملشور ہے جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا - یہاں عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے - خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم رح ہیں جو اکبر کے معاصر تھے، سنہ ۱۰۰۵ھ میں انتقال فرمایا خاندان کے موجودہ جانشین سید حیدر علی ہیں ان کے پاس عربی و ہندی یا ہندستانی کا ایک لغت ہے جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

اللہ خدا ہے کرتار	الخالق آفرید سرجن ہار
الدنیا کھتی سنسار	الاحمق نادان گنوار
الجنۃ بہشت سرگ	السقر دوزخ مرگ

---

۱ - شیرانی صاحب نے ان رسالوں کا ذکر کیا ہے :—

حامد باری، رازق باری، واحد باری، اللہ باری، ایزد باری، حمد باری، قادر نامہ۔

قادر نامہ میرزا غالب دہلوی ہمارے پاس موجود ہے۔ مختار الدین

۲ - « نقوش سلیمانی » -

الیوم	روز	دیس	الشعر	موئی	کیس
اللیل	شب	رات	القول	گفت	بات
السبیل	راہ	باٹ	السبع	هفت	سات
الاسم	نام	ناؤں	الموضع	دیهہ	گاؤں
الرأس	سر	سیس	العشرین	بست	بیس
العین	چشم	آنکھ	اللحیه	ریش	پانکھ
الاذن	گوش	کان	الورق	برگ	پان
الطعام	خوردن	کهان	السهم	تیر	بان

اسی قسم کا ایک رساله همارے مکرم دوست جناب نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس هے۔ اس کے ابتدائی تین شعر یه هیں :

الاله	پرستیده	پوجیا	المعلوم	دانسته	بوچهیا
المحمد	ستوده	بکهانیا	المعروف	شناخته	پچهانیا
الرسول	فرستاده	بهجیا	الواضح	روشن	سجبا

ان دونوں رسالوں میں اس امر کا التزام هے که ایک لفظ عربی کا هے ایک فارسی کا ایک هندی یا اردو کا جسے آپ « هندستانی » کہ سکتے هیں ۔ مصنف اور زمانۂ تصنیف کا پتا نہیں ۔ همارا خیال هے که پہلا رساله بارهویں صدی هجری کا لکها هوا هے ۔ دوسرے رسالے کی زبان پہلے کی به نسبت قدیم معلوم هوتی هے ۔

حضرت مولانا ظفرالدین صاحب قادری رضوی استاد جامعه اسلامیه شمس الهدیٰ پٹنه کے کتب خانے میں بهی اس قسم کے کئی قلمی رسالے هیں جن میں سے هم بعض کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے هیں :

(۱) « نصاب طفلاں » یه کتابی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر ختم هوا هے هر صفحے میں دس سطریں هیں ۔ اس کتاب خانے میں اس رسالے کے دو نسخے ملتے هیں نسخه (۱) ۳۱ صفحات پر ختم هوا هے هر صفحے میں ۱۵ سطریں هیں به استثنائے صفحات اول و آخر ، کاتب کا نام درویش علی هے تاریخ کتابت ۱۲ ذیقعده روز جمعه سنه ۱۲۲۶ ف هے اور نسخه (۲) اسی سائز کے ۵۲ صفحات پر مشتمل هے ، تاریخ کتابت ۵ رجب المرجب روز دوشنبه سنه ۱۲۴۴ فصلی هے ۔

رسالے کے مصنف پٹنه کے مشهور فاضل ملا سعد پٹنوی هیں ۔ ان کے نام میں تذکره نویسوں کا اختلاف هے ۔ حسین قلی خاں عظیم آبادی صاحب « نشتر عشق » اور

سراج الدین علی خاں آرزو نے 'محمد سعید'، نواب ابراھیم علی خاں خلیل نے شیخ سعید، بندرا بن داس خوش گو نے 'سعید قریشی' اور عبدالرحمن شاہ نواز خاں صاحب «مرأۃ آفتاب نما» نے 'حاجی ابو سعید' لکھا۔ ھے صاحب «درّ منثور» جو ان کی آل و اولاد میں ھیں وہ بھی 'سعید' ھی لکھتے ھیں۔ صاحب «حد تحقیق» 'سعد' نام بتاتے ھیں۔ ھمارا خیال ھے کہ ان کا نام محمد سعید تھا اور سعد تخلص۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا نام درج کیا اور بعضوں نے صرف تخلص پر اکتفا کیا۔ یہ بھی بہ خوبی ممکن ھے کہ وہ اپنے تخلص سے اس قدر مشہور ھوگئے ھوں کہ رفتہ رفتہ لوگ اسی کو نام سمجھنے لگے۔

ملا سعد، پٹنہ (عظیم اباد) کے رھنے والے تھے، وہ یہاں کے فضلاے کبار سے تھے۔ عربی و فارسی کی بہت اچھی صلاحیت تھی، عروض و قوافی اور صرف و نحو میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ صاحب «مجمع النفائس» کا بیان ھے کہ :— «در معقولات و منقولات مهارتے درست داشت» صاحب «مرأۃ آفتاب نما» لکھتے ھیں :— «در علم فقه مهارت کامل دارد»۔

ان کے حالات زندگی تفصیل سے نہیں معلوم، اتنا کہا جاسکتا ھے کہ ابتدا میں نواب عاقل خاں رازی صوبہ دار دھلی سے بہت کافی روابط تھے اور وھیں غالباً قیام رکھتے تھے۔ بعد کو پٹنہ میں سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کی طرف متوجہ ھوگئے۔ خوش گو نے از مصاحبان نواب عاقل خاں لکھا ھے۔ صاحب «مرأۃ آفتاب نما» کے ایک بیان سے پتا چلتا ھے کہ انھیں حکومت وقت کی طرف سے خدمت افتاء بھی تفویض ھوئی تھی اور آخر ایام سلطنت میں حرمین معظمین (زاد اللہ شرفهما) بھی گئے تھے۔ لکھتے ھیں :—

> به مساعدت وقت و مدد روزگار در سلک ملازمان فردوس آشیانی منتظم شده مدتے خدمت افتاے عسکر نصرت اثر داشت۔ و آخر ایام سلطنت آن حضرت بجانب.........روم و شرف حرمین معظمین مستعد شده، والان مورد مراحم و عنایات گیهان خدیو است

مرأۃ آفتاب نما صفحه ۸۱۸

مولوی وحیدالدین آزاد مرحوم نے «حد تحقیق» میں لکھا ھے کہ ملا سعد ابن ملا سید احمد پچھم سے آکر موضع سربہدہ ضلع گیا (بہار) میں سکونت پزیر ھوے

اور سینکڑوں مواضعات بادشاہ دھلی کی طرف سے ملے ، اور یہ ملا سعد استاد شاہجہاں بادشاہ دھلی کے تھے - اور ان کے پسر حاجی سید محمد سعید خاں وزیر سلطنت تھے[1] -

مولوی عبدالرحیم عظیم‌ابادی نے بھی اسی کے قریب لکھا :—

مولانا حفیظ‌اللہ و مولانا حضرت محمد عارف سے لےکر مولانا محمد سعید تک کل حضرات متوسل شاہان خاندان تیموریہ دھلویہ رہے اور ہر ایک کو مواضعات جاگیر میں طرف سے شاہان دھلی کے ملے ،

(دُرّ منشور صفحہ ۳۰)

ان دونوں بیانوں میں ایک بڑا اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ صاحب 'حدتحقیق' ملا سعد کے صاحب‌زادے حاجی سعید کو وزیرالسلطنت بتاتے ہیں اور مولوی عبدالرحیم مرحوم خاجو اسی خاندان کے ایک فرد ہیں لکھتے ہیں کہ ملا سعد آخری وہ آدمی ہیں جو متوسل خاندان تیموریہ ہوے -

ملا سعد کے انتقال کی تاریخ جو خواجہ عبدالکریم قرین مرحوم نے کہی درج ذیل ہے :

کامل وقت عارف دوراں	آہ ملا سعید عالی شاں
نقل فرمود زیں سرایے کہن	جنت عدن ساختو مسکن
خواستم سرّ رحلتش چوں قریں	از سر بام ہاتف غمگیں
سال ترحیل آں خدا آگاہ	گفت 'رفتہ ولی بجنت آہ'
	۱۱۹۴ھ

ان کی قبر پر دو تاریخیں مولوی دلاورعلی صاحب دل مرحوم کی کندہ ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

آں شہ صاحب کمالان زماں ملا سعید
چوں ز دنیا سوے ملک معنوی طے کرد رہ
سال فوت او نہاں در گوش دل با آہ آہ
گفت ہاتف نور اللہ تعالی مرقدہ
۱۱۹۴ھ ۰

۱ - حد تحقیق صفحہ ۷۶۵ -

چوں آں شاہ سعید باکمالات به جنت شد رواں زیں دار ششدر
دلا شور عزا چوں بر فلک شد بتاریخش برآمــــدواز اختر
۱۱۹۴

مگر ہماری معلومات کی جہاں تک رسائی ہے ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ان دونوں باتوں میں کوئی صحیح نہیں نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان کا سال وفات سنہ ۱۱۹۴ھ ہے اور نہ یہ کہ وہ شاہجہاں کے استاد تھے۔

ہمارا خیال ہے کے ملا سعد استاد شاہجہاں ملا سعد صاحب تصانیف کثیرہ سے مختلف ہیں ورنہ ان ملا سعد پٹنوی کو استاد شاہجہاں مان لینے کی صورت میں ان کی عمر ڈھائی سو برس کے قریب ہوجاتی ہے۔ شاہجہاں کا سال ولادت سنہ ۱۰۰۰ھ ہے سنہ ۱۰۰۵ میں تعلیم کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ ملا سعد کے انتخاب کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ مشہور علما میں ہوں گے۔ قیاس مقتضی ہے کے اس وقت ان کی عمر ۴۰، ۵۰ سال کی ہوگی۔ تو گویا ان کا سال ولادت سنہ ۹۵۰ کے لگ بھگ ہوگا، سال وفات سنہ ۱۱۹۴ بتایا جاتا ہے اس حساب سے ان کی عمر ۲۴۴ سال ٹھیرتی ہے جو عقلاً محال ہے۔

ملا صاحب کی تصانیف بہت ہیں۔ نشتر عشق، صحف ابراہیم، مجمع النفائس، تذکرۂ خوش گو میں ہے کہ ان کی تصنیفات سے ۵۵ کتابیں ہیں۔ خود ملا صاحب فرماتے ہیں:

« اکنوں تالیف من پنجاہ و پنج است که حاصل گشتۂ بسیار رنج است »

لیکن زمانے کے ہاتھوں ان کی تصنیفات کا ایک معتد بہ حصہ ضائع ہوگیا ہے اور آج ان قیمتی کتابوں کا پتا بھی نہیں۔ ہمیں ان کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کا پتا چلا ہے جن میں آخری آٹھ ہماری نظر سے گزرچکی ہیں۔

(۱) « باغ گلبن » یہ مثنوی مولانا روم کا انتخاب ہے سال تالیف سنہ ۱۱۰۵ھ ہے۔
(۲) فارسی ترجمہ مثنوی مولانا روم، سال تالیف سنہ ۱۱۰۷ ہے۔
(۳) شرح مختصر و فرہنگ لغات۔
(۴) شکرستان، یہ گلستان کی فرہنگ ہے $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ کی تقطیع پر ۱۴۴ اوراق پر ختم ہوئی ہے۔ سال تالیف سنہ ۱۰۹۷ھ ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخے کا کاتب محمد یعقوب ہے اور سال کتابت سنہ ۱۲۱۰ھ۔

(٥) فرہنگ سکندر نامہ، یہ بھی محمد یعقوب کا لکھا ہوا ہے سال تالیف ١٠٩٦ھ ہے۔

(٦) عافیہ، یہ شافیہ مؤلفہ ابوعمر جلال‌الدین ابن حاجب کی شرح ہے جو ۳۳۳ اوراق پر ختم ہوئی ہے۔ یہ رسالہ صفر سنہ ١٠٩٧ھ میں لکھا گیا۔

(٧) انتخاب بےبدل، کافیہ پر مولانا جامی کی شرح کی شرح ہے۔ اوراق ۱۲۴، اوائل ذی‌الحجہ سنہ ١١٠٢ھ میں تصنیف کیا گیا۔ سال کتابت سنہ ۱۲۳۴ھ ہے۔

(٨) قندیل، شرح بر مصباح مؤلفہ ناصر بن عبداللہ مطرزی ۱٦۴ اوراق، یہ علم نحو کی ایک کتاب ہے اوائل ربیع‌الثانی سنہ ١١٠٦ھ میں تالیف کی گئی۔

(٩) میزان الاشعار، یہ رسالہ عروض و قوافی میں ہے۔

ان رسالوں کے علاوہ (١٠) حدیقۃ‌اللغت جو اخلاق ناصری کی شرح ہے اور (١١) شرح مقامات حریری کے متعلق بھی قیاس ہے کہ یہ بڑی ملا سعد ہی کی کتابیں ہیں۔

پیش نظر کتاب «نصاب طفلاں» کے مصنف بھی یہی ملا سعد ہیں۔ اس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ عبارت ہے:—

> فقیر محمد سعید گوید کہ درین اوقات و احیان در خاطر قاصر این احقر بندگاں چناں رسید کہ بیتے چند طرز نصاب صبیاں گفتہ شود لہذا دو صد و بیست بیت و کسری نظم آورد امید کہ عزیزان سخن رس و صاحب ہنران روشن نفس خوردہ نگیرند و این بضاعت مزجات دران پزیرند چوں بہ عنایت و ہدایت الٰہی و فیض و فضل نامتناہی این کتاب کہ مشتمل است بر لسان عربی و زبان فارسی و ترجمان ہندی اتمام یافت «نصاب طفلاں» نام کرد و در شہر رمضان‌المبارک تمام گشت۔

یہ کتاب اردو زبان میں تو نہیں ہے لیکن متعلق بہ اردو ضرور ہے۔ اس سے گیارھویں صدی ہجری کے بعض ہندی یا اردو الفاظ کا پتا چلتا ہے جو اس زمانے میں مروج تھے۔

نفس کتاب کے ابتدائی اشعار یہ ھیں :

سپہر است گردوں و چرخ آسماں آکاش و زمیں دھرتی و.........
شکم پیٹ ، روئے است منھ ، پشت پیٹھ بود دست سر ھاتھ و سر پانو پائے
پسر پوت ، باپ و پدر ھست باپ پدر زن سر مادر...............
برادر چہ بھائی خسر ھم سسر زن و مرد و موگی و مانس......

نمونے کے طور پر چند اور شعر درج کیے جاتے ھیں :

مار سانپ و گربہ بلی ، موش چوھا ، خانہ گھر
برگ پات و بار پھل ، شاخ است ، ڈالی بیخ جڑ
چشم آنکھ و گوش کان ، ابرو و بینی ، بھوں ناک
سینہ و ساق و چھاتی... ... ...
لالہ و نسترن و نرگس ۔ خام کلھا چوں سمن
باغبان مالی ، گلستان باڑی و گلشن دگر
لنگ و کرّ ، لنگڑا و بہرا ، موئے و ناخن ، بال نہ
کور اندھلا ، ناز دھندلا ، موز کیلا ، میوہ بر
سنگ پتھر ، خشت اینٹ ، خاک دھور و آتش آگ
تار تانی ، پود بھرنی ، جامہ کپڑا......................
آفتاب و مہر خورشید است سورج ماہ چاند
بام چھات و پست نیچا زیر بالا اوپر
تلخہ تیتا ، ریم پیپ ، و مغز گودا ، نغر جوش
پایہ پایا ، یافت پایا ، خویش اپنا ، بیچ در

آخر میں خود مصنف کا ایک قطعۂ تاریخ ھے جس سے سال تالیف سنہ ۱۰۶۸ ھ نکلتا ھے ۔

(۲) ، خوش‌حال صبیاں ، دوسرا قابل ذکر رسالہ « خوش‌حال صبیاں » ھے مصنف کے متعلق ابھی صرف اتنا ھی کہا جاسکتا ھے کہ مصنف کا نام جگجیون دلس تھا ۔ بیٹے یا باپ کا نام سلانشی رام تھا ، بہار کا رھنے والا تھا ، رسالے کا نام اگر تاریخی ھے

تو اس سے سنہ ۱۰۹۸ ھ مستخرج ہوتا ہے یعنی آج سے ڈھائی سو برس پہلے یہ رسالہ لکھا گیا اور اس لحاظ سے یہ بہت قابل قدر ہے۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں :

رحیماں رحیم، اللہ کرتارا — پروردگار ہے پالن ہارا
واحد ایک ثانی ہے دوجا — بت‌خانہ مہندپ پرست ہے پوجا

عسکر سپاہ لشکر جان — ظفرت، نصرت فتح کوں مان
شنبہ سنیچر، یکشنبہ اتوار — دوشنبہ کوں کہے سومار
سہ شنبہ منگل چہار شنبہ بودھ — پنجشنبہ برھسپت جو کہے سودھ
روز جمعہ سکر کو جان — ہفتہ سات روز کو مان

اولیچ بٹیر، سلفات کھچوا — حوت گیر جو کہے مچھوا
قند گوڑ، شکر شیریں ہے کھانڈ — نیشکر اوکھ، بورہ ہے کھانڈ
نعلین کھڑاؤں چوب دست ہے لاٹھی — چارپائی ہے کھاٹ خرابات ہے بھاٹی
زورق بجرا، کشتی ہے ناؤ — آماس سوجنا، زخم ہے گھاؤ

آخری دو شعر یہ ہیں :

صوبہ بہار است ساکن مدام — جگجول داس والد سلائی رام
عمر فریب جوکھی تمام — نسخہ خوش حال صبیاں نام

اس رسالے سے اردو زبان کے تغیرات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ہم ذیل میں اس رسالے سے بعض الفاظ درج کرتے ہیں جو اس زمانے مین مستعمل تھے لیکن اب ان کی صورت بدل گئی ہے۔

کوں بجائے کو۔ سرج بجائے سورج، سومار (سمبار) بودھ (بدھ) انگولی (انگلی) پاؤ (پانو) چالنی (چلنی) بھاٹی (بھٹی) بوڑھا (بڈھا) بوری (بری) مانکھی (مکھی) کوتا (کتا)۔

اس رسالے میں یہ ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس میں « ہندوی » کا لفظ متعدد جگہ استعمال ہوا ہے :

بسمع خدایا دریں راہ کرد	ہندوی و فارسی آگاہ کرد
عندلیپ بلبل شناخت پہچان	فاختہ ہندوی نیڈق کومان
رہن گیروی قرض ہے وام	مسمیٰ ہندوی اسم ہے نام

ع حرب جنگ ہندوی لڑائی ، ع درع زرہ ہندوی سلاح ۔ ع ماہتاب ماہ ہندوی مانو چاند۔ع سرخ لال ہندوی ہے جان ۔ ع حرام ہندوی فارسی ہے خوک ع فارسی ہندوی برادر بھائی ۔

شعر میں بعض حروف دبتے ہیں یا وزن سے گرتے ہیں لیکن یہ اس زمانے کا عام رواج تھا اور اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا ۔ کاتب کی طرف سے خاتمے پر یہ عبارت ہے :

« تمام شد کار من نظام شد از خط خام بندہ بہاری‌لال ساکن موضع سمراتنہ (تھانہ) سوکانو پرگنہ مجھوا صوبہ بہار در تحریر بتاریخ بست ہفتم ماہ اگھن سنہ ۱۲۵۴ف بوقت ماندن یک پاس روز انجام انصرام یافت » ۔

---

(۳) « نصاب ہندی » تیسرا قابل قدر رسالہ ' نصاب ہندی ' ہے یہ تیرہ صفحات کا ایک مختصر منظوم رسالہ ہے ہر صفحے میں ۱۰ سطریں ہیں بہ استثنائے صفحات اول و آخر مصنف کا پتا نہیں ۔ ایک نام شاہ غلام عالم کا آتا ہے غالباً یہ مصنف کے پیر ہیں ۔

رسالے کی ابتدا سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بلیا ضلع مونگیر صوبۂ بہار کا رہنے والا تھا ۔ یہ رسالہ جیسے وہ خود ایک قسم کا لغت بتاتے ہیں « ٹھاکر داس » نامی کسی شخص کے لیے لکھا گیا تھا ۔ نفس رسالے میں (۳۱۰) اشعار ہیں ۔ دیباچہ اس کے علاوہ ہے دیباچے میں ۱۱ شعر ہیں بعض لکھے جاتے ہیں :

حق اللہ ہے سانچ خدا ہے	اول آخر وہی سدا ہے
نائب محمد نبی رسول	چار یار ہیں بڈے مقبول
شاہ غلام عالم پیر (ہے) میرا	جن سے روشن دل کا ہیرا

« نصاب هندی » رکھا نام	روشن دل سے ہوا تمام
ساکن بلیا سرکار مونگیر	جو کوئی کھوجے لاوے ہیر
به تاریخ هفتم ربیع الآخر	هزار دو صد هجرت خیر

« خدایا بیامرز این هر سه را
مصنف نویسند (۵) خوانندہ را »

رسالے کا سال تصنیف ۷ ربیع الاخر سنہ ۱۲۰۰ھ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

خوش دامن ساس ، هدف نشانه	ختن داماد جد فاسد نانا
جدیه سمدھن خام ہے کانچا	جدہ مرادی صادق سانچا
راس سر ہے تازک چاندی	عبد غلام و جاریہ باندی
چشم آنکھ و گوش ہے کان	رغیف لیٹی روٹی نان
قدر هانڈی ، دیگدان چولھا	اعراج لنگڑا بے دست لولھا
گندم گوھوں دزد ہے چور	نقب سندھ اندھا کور

بعض بعض مقام پر هندوی کا لفظ بھی آیا ہے لیکن کم۔ وجہ ظاهر ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی کے اختتام پر لکھا گیا۔

حاجب ابرو هندوی بھوں سیما پیشانی حکمت کوں

رسالہ افسوس ہے کہ غیر مکمل ہے یہ نہیں کہ صفحات غائب هیں بلکہ کاتب نے یہیں تک لکھکر چھوڑ دیا ہے۔ کاتب بہاری لال ہے۔

همارا خیال ہے کہ یہ تینوں رسالے لسانی اعتبار سے اہم هیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ کسی وقت تفصیل سے ان رسالوں پر کچھ لکھ سکیں۔

اُردُو

جلد ۲۴ | اپریل سنہ ۱۹۴۳ع | نمبر ۹۰

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:— دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دهلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) دهلی سے شایع کیا۔

اُردو

جلد ۲۴ | اپریل سنہ ۱۹۴۳ع | نمبر ۹۰

فہرستِ مضامین

"روداد مقدمۂ مرزا غالب"

[غدر کے بعد دلّی میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا، مرزا نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کو دیکھنا شروع کیا، اس کے مؤلف محمد حسین کے اجداد تبریز سے آئے تھے اور اگرچہ وہ خود ہندستان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دکن میں رہے مگر "تبریزی" کہلاتے تھے۔

مرزا کو اس کتاب میں غلطیاں نظر آئیں؛ جنھیں انھوں نے ایک مختصر کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام "قاطع برہان" رکھا، چناں چہ ایک خط میں صاحبِ عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:—

"اس درماندگی کے دنوں میں........"برہان قاطع" میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پا در ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے"

یہ کتاب بہ قول مولانا حالی سنہ ۱۸۶۰ع ۱۲۷۶ھ میں پہلی بار؛ اور سنہ ۱۸۶۱ع (۱۲۷۷ھ) میں بہ اضافۂ دیگر مضامین و فوائد "درفش کاویانی" کے نام سے دوبارہ چھپی۔

"ساطع برہان"، "قاطع قاطع" اور "مؤید برہان" کتابیں لکھی گئیں۔

"ساطع برہان" کے جواب میں "نامۂ غالب" اور "مؤید برہان" کے جواب میں "تیغ تیز" خود مرزا نے دو رسالے لکھے، اور "محرق قاطع" کے جواب میں

« دافع هذیان »، « لطائف غیبی » اور « سوالات عبدالکریم » تین رسالے مرزا کے دوستوں نے شائع کیے، مگر « قاطع قاطع » کا جواب نہ خود مرزا نے لکھا اور نہ کسی اور نے۔

خواجہ حالی نے اس سے متعلق « یادگار غالب » میں ایک لطیفہ لکھا ہے؛ فرماتے ہیں :—

> « مولوی امین‌الدین کی کتاب « قاطع قاطع » کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیوں‌کہ اس میں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا « حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا »؟ مرزا نے کہا « اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے »؟

« تیغ تیز » میں بھی مرزا نے لکھا ہے کہ ایسے ادنیٰ درجے کے آدمی کے خلاف قانونی چارہ‌جوئی کرنا میری شان کے خلاف ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل‌کر وہ اس خیال پر قائم نہ رہے، بلکہ انھوں نے مولوی امین‌الدین پر « ازالۂ حیثیت عرفی » کی نالش کردی اور ۲۔ دسمبر سنه ۱۸۶۷ ع کو عرضی دعویٰ داخل عدالت کردیا۔ خواجہ حالی اس مقدمے کے متعلق « یادگار غالب » میں لکھتے ہیں :—

> « مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو « قاطع برهان » کے جواب میں لکھا گیا تھا اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کام‌یابی کی امید نہ رہی تو آخرکار انھوں نے راضی‌نامہ داخل کردیا۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی‌الواقع فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے، یا نہیں؟ انھوں

نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے
ایسے معنے بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔
ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا، کسی نے پوچھا
"حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی"؟
مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

به هرچه در نگری جز به جنس مائل نیست
عیار بے کسئی من شرافت نسبی است،

اس مقدمے کی پوری مسل کی نقل اب اتفاق سے ہمیں دستیاب ہوگئی ہے اور ذیل میں تمام و کمال شائع کی جارہی ہے۔ اس کے مطالعے سے اس مقدمے کے تمام حالات بہ خوبی واضح ہوجاتے ہیں۔ اس مقدمے کے دوران میں مولوی ضیاءالدین کی پیشی کے وقت کسی نے حاکم عدالت کے کان میں کہہ دیا کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیے" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے میں دھلی سے جو انگریزی اخبار "مفصلائٹ" نکلتا تھا، اس میں ۱۲۔ مارچ سنہ ۱۸۶۸ع کو ایک خط چھپا تھا، جس کا مکتوب نگار بڑے تعجب سے لکھتا ہے:-

"میں سخت حیران و پریشان ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاءالدین کو کس بنا پر کرسی دی اس رعایت سے غالب کے ساتھ بےانصافی ہوئی، وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں، لفٹننٹ گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاءالدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا تھا"۔

یہ پورا انگریزی خط رسالۂ 'اردو' اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ع کے پرچے میں ہم شائع کرچکے ہیں۔ اس علمی مناقشے کا بدترین مرحلہ یہی مقدّمہ تھا، اس کی مسل مل جانے سے مقدّمے کی پوری کیفیت صحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مسوّدے کی عبارت اکثر جگہ گنجلک ہے، دو چار مقام پر ایک آدھ لفظ پڑھا نہیں گیا، اس کے متعلق فٹ نوٹ میں حسب ضرورت صراحت کردی ہے، اور جہاں شبہہ رہا وہاں قوسین میں سوالیہ (؟) علامت بنادی گئی ہے۔ مدیر اردو]

پیش گاہ صاحب ایں سرہ

چوں کہ مقدمہ‌جات فوجداری نمبری مسٹر اسٹاکڈن صاحب پیش ہوتے ہیں یہ مقدمہ انھی صاحب بہادر کے اجلاس میں پیش ہوگا، اور صاحب عزت وغیرہ کو بحال[1] صاحب بہ خوبی جانتے ہیں۔ یہ خط بخدمت مسٹر اسٹاکڈن صاحب بہادر پیش ہووے۔

۲۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء

صاحب والا مناقب عالی‌شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی دام‌اقبالہ

بعد عرض مدارج تعظیم و تسلیم گزارش کرتا ہوں کہ مجھے ایک شخص پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کرنی منظور ہے، اس واسطے اگرچہ میرے مدارج عزت آپ کو خوب معلوم ہیں لیکن چوں‌کہ اس دعوے کے بیان میں کچھ بیان اپنی عزت کا ضرور ہے لہذا عرض کیا جاتا ہے کہ میں قوم کا ترک ہوں، دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ اور چچا بہ‌سبب ضعف سلطنت مرہٹیوں کی نوکری کرتے رہے، باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر سرکاری[2] عمل‌داری سے پہلے ایک لڑائی میں مارا گیا، حقیقی چچا میرا نصراللہ بیگ خان‌بہادر جرنیل لیک بہادر کا رفیق مع چارسو سوار کے سرکشان ہند کی لڑائیوں میں شریک رہا، چارسو سوار کا برگڈیر اور لاکھ روپے کے پرگنے کا جاگیردار تھا۔ جرنیل صاحب کے سامنے بہ مرگ ناگاہ مرگیا جاگیر موافق قرارداد سرکار میں بازیافت ہوئی اور میرے واسطے بہ عوض جاگیر کچھ نقدی سرکار سے مقرر ہوگئی۔ پس میں رئیس‌زادہ بہ عوض جاگیر نقدی پانے والا ہوں۔ جاگیرداروں کے بعد میرا نمبر ہے اور باقی آپ کے دفتر سے لےکر دلی کی کمشنری اور لاھـور کی لفٹننٹ‌گورنری، کلکتے کے گورنر جرنیل‌بہـادر کے دفتر تک میرے مدارج عزت بہ خوبی ثابت ہیں۔۔ ایک شخص امین‌الدین نام دلی کا رہنے والا کہ اب وہ پٹیالے میں راجا کے مدرسے کا مدرس ہے، اس نے ایک کتاب لکھی، اگرچہ بنا کتاب کی بحث علمی پر ہے لیکن اس نے اس بحث علمی میں میرے واسطے وہ الفاظ ناشایستہ اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص کسی کولی چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے، اور ایسی گالیاں نہ دے‌گا۔ ناچار میں نے منشی عزیزالدین صاحب کو اس مقدمے میں اپنا وکیل کیا ہے۔۔۔ امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سررشتۂ فوجداری میں

[1] یہ لفظ نہیں پڑھا گیا۔

[2] یعنی دہلی میں انگریزی عمل‌داری سے پہلے۔

یہ مقدمہ پیش ہو اور خاص آپ کی تجویز سے اول سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو، اور کسی محکمۂ ماتحت میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو فقط

راقم اسداللہ خاں غالب

مرقومہ دوم دسمبر سنہ ۱۸۶۷ع

اسداللہ خاں

ز پیشگاہ مسٹر اسٹاکڈن صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر

منشی وزیرعلی - دیبی پرشاد گواہان حاشیہ نے جانب مقر سے شہادت سامنے ہوکر بہ اقرار صالح مضمون مختارنامہ کو تصدیق کرایا، لہذا تصدیق مختارنامہ عمل میں آئی۔ مورخہ ۹ دسمبر

العبـــــــــد

جوالاناتھ شرف   جائے دستخط

جو مجھ کو بہ نام امین الدین ساکن دہلی، مدرس مدرسہ پٹیالہ بابت ازالۂ حیثیت حسب دفعہ ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیرات ہند بہ صیغۂ فوجداری نالش کرنی منظور ہے، لہذا میں نے اپنی طرف سے عزیزالدین وکیل سرشتہ کو واسطے گزراننے عرضی اور پیروی کرنے مقدمے کے وکیل کیا۔ وکیل مذکور جو کچھ سوال و جواب پیروئی مقدمۂ ہذا میں کرے جملہ ساختہ پرداختہ اس کا مثل ذات خاص اپنی کے قبول و منظور ہے، اس واسطے یہ مختارنامہ لکھ دیا گیا۔ فقط

گواہشـــــــد   العبـــــــد   گواہشـــــــد

دیبی پرشاد   محمد اسداللہ خان   منشی وزیرعلی

المرقوم چہاردھم[۱] دسمبر سنہ ۱۸۶۷ع

آج وکیل نے کتاب پیش کی، حکم ہے کہ یہ کاغذات بروز سونمواز کے پیش ہوں، اور وکیل مدعی انگریزی میں ترجمہ ان الفاظ کا مع اس عبارت کے جہاں یہ الفاظ واقع ہوے ہیں، کراکر پیش کرے اور مقدمہ درج رجسٹر کیا جائے۔ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ع

دستخط حاکم

---

۱ بہ ظاہر یہاں چہاردھم نہیں بلکہ چہارم ہونا چاہیے، اس لیے کہ ۲ کو چٹھی لکھی ۴ کو مختارنامے پر دستخط کیے، ۹ کو مختارنامہ تصدیق ہوا، ۱۲ کو تاریخ پیشی مقرر ہوئی، یہ امر بداہۃ ناقابل قبول ہے کہ ۹ کو مختارنامہ تصدیق ہوا اور ۱۴ کو غالب نے وکالت نامے پر دستخط ثبت کیے۔

حکم ہے کہ

مختارنامہ تصدیق کیا جاوے اور وکیل پہلے کتاب پیش کرے۔

۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع

جناب عالی

جو حال عزّت و اقتدار میرے موکل کا گورنمنٹ میں ہے اس کی تصریح دفاتر سرکاری اور آمد خطوط و چٹھیات حکام، خصوص سکریٹری گورنمنٹ پنجاب و نوّاب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے بہ‌خوبی ہوسکتی ہے۔ مسمی امین‌الدین ساکن دھلی حال مدرس پٹیالہ نے ایک کتاب «قاطع‌القاطع» [۱]........برہان مصنّفۂ موکلم تصنیف کی، اس میں ایسے الفاظ ناشایستہ بلکہ دشنام مغلظہ نسبت موکلم تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا ہے کہ جس سے نیک‌نامی کو نقصان پہنچنے کا باعث ہوا، اور ازالۂ حیثیت کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند میں درج ہے، وقوع میں آوے۔ پس مدعاعلیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جس کی سزا تعزیرات‌ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے، لہذا امیدوار ہوں کہ بعد تحقیقات معروضۂ فدوی کے مدعاعلیہ کو سزا مندرجۂ دفعات مذکورہ فرمائی جاوے کہ آیندہ عزّت داران سرکار کا کوئی مزیل حیثیت کا نہ ہووے۔ زیادہ حدّ ادب

تفصیل ان الفاظ مندرجہ و مشتہرۂ کتاب کہ جس سے ازالہ حیثیت کا ہوا، وہ مع نمبر صفحہ

نمبر صفحہ	الفاظ مزیلۂ حیثیّت
۱۳	بایں بےچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است
۱۳	پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانئ خویش وا نماید
۲۳	ابن خر عیسیٰ نمد زین را بر پشت خود نہادہ است
۲۳	بہ دشنام پردازم
۲۸	میان خون حیض غوطہ خورد
۱۷، ۴۲	کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخر بہ کار بردہ
۱۸، ۱۹، ۴۲	سیلی و گردنی‌ها را برا‌ے او بنیاد نہند
۵۱	فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد

۱ یہاں سے غالبًا مندرجہ ذیل الفاظ غائب ہیں:—
«بہ جواب قاطع»

۱۸، ۶۱	این خبطی
۲۰، ۶۶	از خرابۂ اکبرآباد بومے به دهلی رسیده است
۷۰	معترض ازیں عضو صدمتے دیده است
۱۱، ۱۲	

علاوه اس کے اور بهت جگه ایسے الفاظ هیں، ملاحظۂ کتاب سے واضح رائے عالی هوں گے۔

عرضی:
کمترین عزیزالدین وکیل اسدالله خان پنشن‌دار سرکاری
عرف مرزا نوشه معروضه ۱۵ دسمبر سنه ۱۸۶۷ ع

یه ممکن نهیں۔ ۲۳ جنوری سنه ۱۸۶۸ ع
دستخط

صاحب والا مناقب عالی‌شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب ڈپٹی‌کمشنر بهادر دهلی زاد شوکته

بعد تعظیم و تکریم و اظهار آرزوئی بمواصلت کثیرالافادت التماس یه هے که تخمیناً تیسرا مهینه هے که میں نے به وکالت منشی عزیزالدین صاحب کے عدالت فوج‌داری میں ازالۂ حیثیت پیش کیا، وکالت‌نامه تصدیق هوگیا، اور میرا خط مع وکیل کے حضور میں گزرا، اور آپ نے وه مقدّمه تجویز کے واسطے صاحب والا قدر اسٹاکڈن صاحب بهادر کے سپرد کیا۔ میری خوشی تو اس میں تھی که وه مقدّمه آپ تجویز کرتے۔ اب به صدگونه عجز و زاری استدعا کرتا هوں که کاغذات مقدّمه وهاں سے منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کیے جائیں تاکه امین‌الدین مدعی علیه کی طلبی کا حکم پٹیالے کو جائے اور بعد اس کے حاضر هونے کے به مواجه اس کے اور میرے وکیل کے مقدّمه تجویز هوکر میری دادرسی هو اور مدعا علیه کو سزائے سخت ملے، تاکه پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش و ناسزا نه لکھے، مجھے یقین هے که آپ اس اپنے تابع‌دار قدیم کی عرض قبول کرلیں گے اور به ذات خود میری دادرسی فرمائیں گے۔ فقط

راقم اسدالله خان غالب
۲۳ جنوری سنه ۱۸۶۸ ع

جو کہ ہماری تبدیلی اس ضلع سے ہوگئی
حکم ہوتا ہے کہ
میرے بعد بہ‌حضور صاحب ڈپٹی‌کمشنر بہادر پیش ہووے
تحریر ۳۰ جنوری سنه ۱۸۶۸ ع
دستخط

از پیش‌گاہ مسٹر اوبرین صاحب بہادر
حکم ہوا کہ
پرسوں کے واسطے مدعا علیہ بہ اجرائے سمن طلب ہووے۔ فقط
۵ فروری سنه ۱۸۵۸ ع

عرضی مولوی امین‌الدین مدعا علیہ کی بیچ مقدمۂ ازالۂ حیثیت عرفی مرزا اسداللہ خاں غالب مدعی کے معروضہ تاریخ ۸ ماہ فروری سنه ۱۸۶۸ ع (اس کی نقل کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس واسطے نہیں کی گئی)۔
اطلاع‌نامہ بنام مولوی امین‌الدین (نقل نہیں کی گئی)۔

اظہار وکیل مدعی

نام میرا عزیزالدین وکیل مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ
«قاطع‌القاطع» میں امین‌الدین نے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ «صاحب برہان بایں بیچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ‌است» بار دیگر صفحۂ مذکور میں ہے «پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانئ خویش وا نماید، تا فریادش کارگر آید»۔ صفحہ ۲۳ کی سطر ۱۴ میں ہے «ایں خر عیسیٰ نمد زین را بر پشت خود نہادہ‌است» صفحہ ۳۸ میں ہے «ہماں خون‌حیض غوطہ خورد» صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷ میں لکھا ہے «کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخرہا بہ‌کار بردہ» صفحۂ مذکور کی سطر ۱۸، ۱۹ میں لکھا ہے، «سیلی و گردنی‌ہا را برائے او بنیاد نہند» صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے «فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد» صفحہ ۶۱ کی سطر ۱۸ میں لکھا ہے، «ایں خبطی[1]......» صفحہ ۶۶ کی سطر ۲۱

---

۱ ایں خبطی در حقیقت ہر دو لغت از فرہنگ دیگر نشان میدہم

میں لکھا ہے « از خرابۂ اکبر آباد بوہے بہ دهلی رسیدہ‌است » صفحہ ۷۰ کی سطر ۱۱، ۱۲ میں لکھا ہے « معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ‌است » علاوہ اس کے جو جو کچھ اور لکھا ہے، ذیل میں گزارش ہے :—

صفحہ	سطر	خلاصہ
۱۲۷	۱۶، ۱۷	اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می‌دید، بینی چہ گویم گوشش می‌برید
۱۴۱	۱۵	بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می‌دهد
۱۴۲	۱۸	معترض خایہ را چرا گرفت ، مگر برائے ترکیب نان خورش گرفتہ باشد
۱۶۴	۱۰	جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ است
۱۷۲	۲۰	گوش و بینی چرا گویم دست خواهد برید و زبان بہ قفا خواهد کشید
۳۸	۲۱	گوش او از بنا گوش بر کنند یا بہ سوراخش میخے زنند .

ان الفاظ سے اور عبارت سے ازالۂ حیثیت عرفی میرے موکل کا ہے۔ میرے موکل کے بزرگ باشندے اکبرآباد کے تھے، فہرست گواہان کل داخل کروں گا۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا، صحیح ہے، مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔

حکم ہے کہ مدعی فہرست گواہان داخل کرے۔ سوائے « قاطع القاطع » کے باقی کتابیں واپس ہوں چناں‌چہ واپس ہوئیں۔ ۲۰ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع

جناب عالی

چوں‌کہ فدوی کو نقل الفاظہائے گزرانیدۂ مدعی واسطے گزارنے معنے کے مطلوب ہیں، لہذا بذریعہ گزارش درخواست ہذا امیدوار کہ نقل جملہ الفاظہائے گزرانیدۂ مدعی فدوی کو عطا ہوجاویں۔ فقط

مولوی امین الدین

مختارنامہ از جانب مولوی امین الدین اسمی انبہ سہاے وکیل نقل نہیں کیے گئے۔

فہرست گواہان مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ

۱
حکیم حشمت اللہ خاں صاحب

۲
مولوی سدیدالدین خاں صاحب استاد میور (؟) صاحب سکریٹری اعظم

۳
مولوی ضیاءالدین صاحب پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری

۴
مولوی محمد حسین صاحب

۵
مولوی ابراھیم صاحب

۶
محمد حمیدالدین خاں صاحب عرف عبدالحکیم صاحب

۷
مولانا قمرالدین صاحب

فہرست گواہان مرزا اسداللہ خاں غالب

۱
مولوی منشی سعادت علی خان صاحب مدرس کالج دھلی

۲
ماسٹر پیارے لال صاحب سکریٹری

۳
مولوی نصیرالدین صاحب مدرس مدرسہ دھلی

۴
مولوی لطیف حسین صاحب مدرس

۵
منشی حکم چند صاحب مدرس کالج دھلی

اطلاع نامہھا مسمیٰ (؟) گواھان فریقین کہ جن کی نقل نہیں کی گئی۔

نام میرا امین الدین ولد مولوی زین الدین قوم شیخ ساکن پٹیالہ عمر ۵۹ برس پیشہ مدرسی

بیان ہے کہ

میں نے ایسا نہیں لکھا کہ جس میں ازالہ حیثیت عرفی مدعی کا ہو، یہ کتاب « قاطع القاطع » تصنیف میری ضرور ہے۔

سوال -- فرد قرارداد جرم تم کو سنائی جاتی ہیں؛ تم مرتکب جرم قرارداده کے ہوئے یا نہیں؟ تمہارا کیا جواب ہے؟ کیوں کر صفائی کروگے؟

جواب - فرد جرم میں نے سنی۔ جواب یہ ہے اس کتاب میں تین قول ہیں: ایک تو محمدحسین « برہان قاطع » دوسرا مرزا اسد اللہ خاں مصنف « قاطع برہان » تیسرا قول میرا۔ « قاطع برہان » میں رد کیا ہے، « برہان قاطع » کو اور میں نے تردید کری ہے، « قاطع برہان » کی۔

صفحہ ۱۳ میں جو لکھا یہ برائے مثل ہے، سوائے معنے تحت لفظی کے اور کچھ معنے میں نے نہیں خیال کیے۔ « زخم نہانی » مراد رنج دلی سے ہے، اور دیگر شاعروں نے بھی یہی معنے لیے ہیں، بہت شعر ہیں جن میں الفاظ « زخم نہانی » کو ڈالا ہے اور معنے اس کے رنج دلی لیے ہیں، سو اب یاد سے شعر پیش کروں گا۔

صفحہ ۲۳ میں جو لکھا ہے « خر عیسیٰ...... » خر کے معنے نادان کے ہیں؛ لفظ عیسیٰ صرف بہ طور مرکب کے ڈالا گیا ہے۔ یہ عبارت جو درج ہے کہ « بدشنام پردازم » معنے یہ ہیں کہ ساتھ گالی کے مشغول ہوتے ہیں؛ مگر آگے اس کے جو عبارت ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے درج کیا ہے کہ زبان ایسی خراب کرلی ہے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ « میان خون حیض غوطہ خورد » اس کے معنے یہ ہیں کہ کیوں گناہگار ہوتے ہو، اور کو.........[۱] دیتے ہیں، یہ الفاظ کچھ تحت مثل ہے « خون حیض » کا لفظ عرفی اور.........[۱] لکھا ہے، اور یہ بھی معنے دیتا ہے کہ کیوں گناہگار ہوتے ہو۔

---

۱ یہاں اصل عبارت کے کچھ لفظ رہ گئے ہیں۔

صفحہ ۴۸ میں جو لکھا ہے لفظ « سوراخ » اور لکھا ہے « گوش او را از بنا گوش برکنند » اس کے معنے یہ ہیں ، کان کو اکھیڑو ، یا کان کے سوراخ میں میخ مارو ، یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں ، جب کوئی اعتراض کیا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ تمھارے کان اکھاڑے جاویں گے اور تمھارے کان بند کرائے جائیں گے۔

صفحہ ۴۲ میں جو درج ہے « کلال اکبرآبادی » کلال معنے مین مست کے لیے ہیں۔ دوسری جگہ لکھا ہے « سیلی و گردنیہا را برائے او بنیاد نہند » اوپر[۱] کی عبارت سے اسے شامل کیا جائے تو معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ شریک خوشی کے ہوئے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے « فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد » یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں کہ جب کوئی اعتراض بےجا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔

صفحہ ۶۱ میں جو لکھا ہے « خبطی » اس کے معنے بھی یہی ہیں یعنی برگشتگی مزاج۔

صفحہ ۶۶ میں ہے « از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دھلی رسیدہ‌است » بوم کے معنے مدعی نے بھی اپنے قول‌میں جو اوپر درج ہیں زمین کے لیے ہیں ، یعنی لکھا ہے « کاش از بوم دکھن دگرے برخیزد » چناں‌چہ میں نے بھی معنے زمین کے لیے ہیں معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ زمین اکبرآباد سے ایک شخص آئے ہیں۔

سوال مدعی — « خرابہ » کا مضاف‌الیہ کون ہے ؟ جواب — اکبرآباد بوم ہے اور « ی » بوم کے واسطے تحسین کلام کے ہے ، فقط۔

صفحہ ۷۰ میں جو لکھا ہے « عضو » میں نے اس کے معنے « خواندن » کے لیے ہیں ، انھوں نے اپنے کلام میں جو اوپر درج ہے ، « عضو » کے معنے آلۂ تناسل کے لیے ہیں میری مراد یہ ہے کہ مدعی نے لفظ « عضو » سے کچھ صدمہ اٹھایا ، رنج دیکھا ہے ، « ازیں » کی ضمیر قریب پر آتی ہے ، بعید پر نہیں جاتی۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے « بینی چہ گویم گوشش می‌برید » اوپر کی عبارت سے ملاکر اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا سزا دیتا۔

۱ اوپر کی عبارت یہ ہے :— « مضحکہا براے خود آوردہ ؛ رقص مجنونی می‌نماید وشتر غمزہ درکار می‌فرماید ا نزم سور و سرور را ساز دھند و مد خندہ و بازی سیلی و گردنی‌ھا را براے او بنیاد نہند »

صفحه ۱۴۱ مس لکھا ہے « بضاعت خواجه ہمیں ازار است هر کس را نشان می‌دهد » یه لفظ « ازار » مدعی کے قول میں، درج ہے مگر معنے اس کے چادر کے هیں اور یہی میں نے لیےهیں ۔

صفحه ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ « خایه » اس کے معنے بیضهٔ مرغ کے هیں ، مری مراد یه ہے (که) معترض نے اس هی لفظ « خایه » کو به معنے خصیه کیوں لیا ، مگر نام واسطے خورش کے به معنے بیضهٔ مرغ لیا ہو ۔

صفحه ۱۶۴ میں لکھا ہے که « جستن‌خرس را یاد کرده است و رقص بوزنه را به اظهار آورده » اس کے معنے تحت لفظی هیں ، مطلب یه ہے که معترض کی ایسی باتیں یا ذکر یہی هیں که « جستن خرس و رقص بوزنه » که‌بیکار هیں ، یاد کری جاویں ۔

صفحه ۱۷۲ میں « گوش و بینی چرا گویم دست خواهدبرید و زبان به قفا خواهد کشید » اس کے معنے تحت لفظی هیں ، مطلب یه ہے که معترض نے چوری الفاظ کری ہے ، اس کی سزا ملنی چاهیے ۔

میں نے یه کتاب صرف به بحث علمی چھپوائی ہے ، گواه میرے موجود هیں ۔

یه جواب میرے مواجه میں قلم‌بند کیا گیا ، اس میں تمام بیان مشخص با خود مشتهادی صحیح و درست مندرج ہے ۔

اظہار گواه مدعی با اقرار صالح به اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بهادر مرقوم ۲ ۔ مارچ سنه ۱۸۶۸ع

نام میرا پیارےلال ہے ولد رام‌نراین هیڈماسٹر اسکول قوم کھتری ساکن دریبه عمر ۳۰ برس کی پیشه ماسٹری ۔ بیان یه ہے که صفحه ۱۳ « قاطع القاطع » کی عبارت جس پر نشان سرخی کا ہے ، میں نے پڑھی معنے 'حرکت ناکردنی' کے هیں « اغلام ضربت‌ها کشیده » اس مقام پر وه معنے لیے جاتے هیں که جب به حالت مجامعت ضرب لگتی ہے ۔ « زخم نهانی » کے لغوی معنے هیں 'پوشیده زخم' ، مگر یہاں اس زخم سے مراد ہے که جو فعل بد سے عاید ہوے ، جو شخص پڑھ سکتے هیں وه اس سے یہی مراد رکھیں گے ۔

سوال از طرف مدعا علیه — آپ مرزا نوشه کے شاگرد هیں ؟

جواب — میں شاگرد نہیں هوں ۔

سوال دوسرا -- آپ فارسی کماحقہ جانتے ھیں ؟
جواب -- عربی میں نہیں جانتا ، اور تمام فارسی بڑی اچھی نہیں جانتا ، جس قدر جانتا هوں معنے بیان کردیے -
سوال تیسرا -- مدعی نے ترجمہ ان الفاظ کا انگریزی میں آپ سے کرایا تھا ؟
جواب -- هاں مجھی سے کرایا تھا -

صفحہ ۲۳ سطر ۱۵ میں لکھا ھے « خر عیسیٰ » اس کے معنے ' عیسیٰ کا گدھا ' مگر یہاں مراد ھے صرف گدھے سے - عیسیٰ کے لفظ سے کچھ حاصل نہیں - لکھا ھے « بدشنام پردازم » یعنی میں گالیاں دیتا ھوں -

صفحہ ۲۸ کی سطر ۹ میں لکھا ھے « میان خون حیض غوطہ خورد » اس کے معنے یہ ھیں کہ خون حیض میں غوطہ کھایا ، اور لفظ نسبت مخالف کے ھیں -
سوال مدعا علیہ -- آپ مضاف ، مضاف الیہ کو جانتے ھیں ؟
جواب -- جانتا ھوں -

صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷-۱۸-۱۹ میں لکھا ھے « کلال اکبرآبادی » یعنی اکبرآباد کا کلال ، سوائے اس کے اور کچھ معنے پیدا نہیں ھوتے ' « رقص میموں » بندر کا ناچ « شتر غمزہ » بہ معنے بدکاری -
سوال مدعا علیہ -- کلال بالفتح لفظ ھندی ھے اور یہ کتاب فارسی ھے ، لفظ ھندی فارسی میں آتا ھے ؟
جواب -- دو طرح لفظ پڑھنے میں آتا ھے ، « کلال و کلال » کلال کے معنے شراب کش اور کلال کے معنے کمھار -

صفحہ ۴۳ میں لکھا ھے « دست را بہ سیلی و لب را بدشنام باز کشاید » یعنی هاتھ کو تھپڑ کے ساتھ اور لب کو گالی سے کھولا -

صفحہ ۵۱ میں لکھا ھے « فصد باید کشاید تا جنونش فرو گردد » فصد کے معنے ھیں نشتر سے خون نکالنا ، « جنونش فرو گردد » یعنی جنون اس کا جاتا رھے -

صفحہ ۶۱ میں لکھا ھے « خبطی » معنے اس کے جنونی ھیں -
سوال مدعا علیہ -- دوسرے معنے آپ جانتے ھیں ؟
جواب -- میں نہیں جانتا -

صفحہ ٦٦ میں لکھا ہے « آری از خرابۂ اکبرآباد بومی بہ دھلی رسیدہ » معنے یہ ہیں کہ 'اوجاڑ اکبرآباد سے ایک الّو دھلی میں پہنچا' سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے نزدیک نہیں ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے « عضو » لغوی معنے اس کے ہیں 'جسم کا کوئی حصہ مگر یہاں مراد عضو تناسل ہے' بدیں مراد کہ معترض نے اس عضو سے صدمے اٹھائے ہیں، اور یہ بیان مصنف کا سمجھتا ہوں۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے « بینی چہ گویم گوشش می‌برید » معنے یہ ہیں کہ ناک کو کیا کہوں کان اس کے اکھاڑیے «گوشش» کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے « بضاعت خواجہ همیں ازار است هر کس را نشان می‌دهد » اس کے معنے میں نہیں سمجھتا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے « خایہ را چرا گرفت » اس مقام پر « خایہ » کے معنے عضو تناسل کے ہیں؟ اگرچہ معنے اس کے بیضۂ مرغ بھی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں جو لفظ « میخ[1] سوراخ » کا لکھا ہے اس سے مراد مقعد ہے۔

صفحہ ۱٦۴ میں لکھا ہے «جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ» معنے یہ ہیں کہ خرس کے کودنے کو یاد کیا ہے اور بندر کے ناچنے کو ظاہر کیا ہے۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ۲۔ مارچ سنہ ۱۸٦۸ع

نام میرا لطیف حسین ولد حکیم محمد حسین خاں، شیخ، مدرس عربی فارسی، ساکن کوچہ حکیم بقاءاللہ عمر ۳۵ برس کی

بیان یہ ہے

صفحہ ۱۳ میں لکھا « حرکت ناکردنی » ناشایستہ کے معنے ہیں 'خلاف وضع فطری' جو کوئی پڑھے یہ معنے لےگا۔

۱ « بہ سوراخش میخے زنند »

سوال مدعاعلیہ -- ان الفاظ کے معنے اور بھی ہوسکتے ہیں ؟

جواب - تحت لفظی معنے اور بھی ہوسکتے ہیں مگر اس مقام پر یہی معنے ہیں۔

صفحہ ۱۳ « زخم نہانی » کے معنے اس مقام پر 'اندام نہانی' کے ہیں؛ اور ضرب سے وہی مراد ہے کہ جو اس کام سے ضرب ہوتی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے « خرعیسیٰ » اس کے معنے گدھا ہے، بےوقوف، عیسیٰ کا لفظ کچھ معنے نہیں دیتا، اس صفحے میں لکھا ہے « بدشنام پردازم » معنے اس کے یہ ہیں کہ گالیاں دوں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے « میان خون حیض غوطہ خورد » خون حیض وہ ہے جو عورتوں کو ماہواری آتا ہے، ناپاک ہے، گالی نہیں ہے؛ کلمۂ سخت ہے، اور کچھ معنے نہیں ہوسکتے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے « بہ سوراخش میخے زنند » اس مقام پر سوراخ کے معنے مقعد کے ہیں لفظی معنے چھید کے ہیں، « سوراخش » کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہوسکتی ہے، مگر اس مقام پر میری دانست میں معنی مقعد کے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے « کلال اکبرآبادی » اگر ضم سے پڑھا جاوے تو « کمہار » اور اگر فتح سے پڑھا جاوے، تو معنے « مےفروش »۔ دوسری جگہ لکھا ہے « سیلی و گردنی‌ها را برائے او بنیاد نہند » معنے یہ ہیں، ہاتھوں سے گردن پر مارنا۔

صفحے ۴۳ میں لکھا ہے « دست را بہ سیلی و لب را بہ دشنام باز کشاید » معنے وہ ہیں کہ جو لفظی ہیں، اور کچھ معنے نہیں ہوتے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ « فصد باید کشاد تا جنونش فروگردد » یعنی فصد کھولنا چاہیے تو جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے « خبطی » اس کے معنے یہ ہیں کہ 'دیوانہ'

صفحہ ۷۰ میں لکھا « معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ » « عضو » سے مراد 'عضو تناسل' ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ « بینی چہ گویم گوشش می‌برید » « گوشش » کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ھے « بضاعت خواجہ همیں ازار است ہر کس را نشان می دھد » معنے یہ ھیں کہ یہی پاجامہ ھے جو ہر ایک کو دکھاتا ھے۔

سوال مدعاعلیہ — ازار کے معنے اور بھی ھیں ؟

جواب — مجھے معلوم نہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ھے « خایہ را چرا گرفت » معنے لفظی یہ ھیں کہ معترض نے لفظ « خایہ » کو کیوں لیا، اور لفظ کیوں نہیں لیا۔ دوسرے معنے یہ ھیں کہ خصیے کو کس واسطے لیا اور عربی میں « خایہ » بیضے کو بھی کہتے ھیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ھے، کہ « جستن خرس را یاد کردہ‌است و رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ » معنے یہ کہ کود نے ریچھ کو یاد کیا، اور بندر کا ناچ ظاہر کیا ھے یعنی ریچھ کی طرح وہ شخص کودا ھے اور بندر کا ناچ کیا ھے۔ ضعیف معنے یہ بھی ہوسکتے ھیں کہ کودنا ریچھ اور بندر کا یاد کیا ھے۔

صفحہ ۱۷۶ میں لکھا ھے « گوش و بینی چرا گویم دست خواھدبرید و زبان بہ قفا خواھدکشید » سوائے معنے لفظی اور کچھ معنے اس کے نہیں ہوسکتے۔ میں ایسی تحریر کو بہت درست سمجھتا ہوں اور ہر ایک شخص کی سمجھ میں ایسا ھی آوے گا، جیسا میں نے بیان کیا ھے اور کوئی کتاب میں نے نہیں دیکھی جس میں ایسی عبارت درج ہو۔

سوال مدعاعلیہ — « قاطع برھان » آپ نے دیکھی ؟

جواب — میں نے دیکھ

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں آیا۔ مظہر کو بہ زبان اردو، جس کو وہ سمجھتا ھے سنایا گیا۔ اقرار کیا، صحیح ھے، مدعاعلیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا، فقط۔

اظہار گواہ مدعی :

نام میرا نصیرالدین ولد محمدعلیم‌الدین قوم سید ساکن کونچہ پنڈت عمر ۳۳ سال پیشہ روزگار بیان یہ ھے کہ

میں فارسی اور عربی خوب جانتا ہوں اور انگریزی بہت کم جانتا ہوں صفحہ ۱۳ میں جو لکھا ھے کہ وہ میں نے اس سے سابق بھی اس عبارت کو دیکھا ھے

« حرکت ناکردنی » سے یہ مراد ہے کہ 'جو حرکت نہ کرنے کی ہو' « زخم نہانی » کے وہ معنے ہیں کہ 'زخم پوشیدہ' مگر اس جگہ مراد اس زخم سے ہے کہ جو دکھایا نہیں جاتا۔

سوال مدعا علیہ — آپ مدعی کے شاگرد ہیں ؟

جواب — میں شاگردنہیں ہوں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے « بدشنام پردازم » معنے اس کے یہ ہیں کہ 'گالیاں دوں'۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے « میان خون حیض غوطہ خورد » معنے خون‌حیض کے وہ ہیں ، کہ جو عورت کو ماہ بہ ماہ اندام نہانی سے پیدا ہوتا ہے ' یہ چیز نہایت نجس ہے اور ناپاک ہے ' اور ایسا لفظ آج تک استعمال میں نہیں آیا۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے « گوش او از بنا گوش برکنند تا بہ سوراخش میخے زنند » سوراخ سے مراد 'مقعد' ہے اور یہ معنئے عام جو اس عبارت کو پڑھیں گے سمجھیں گے۔

صفحہ ۴۲ — « کلال اکبرآبادی » ضم سے مراد کمہار سے ہے اور فتحہ سے مراد شراب‌کش سے ہوتی ہے۔ اس مقام پر دونوں معنے ہوسکتے ہیں ' بہ معنے رنج بھی آتا ہے مگر اس جگہ معنے رنج کے نہیں دیتا۔ عربی میں معنے اس کے سستی ہیں ' وہ بھی اس جگہ موزوں نہیں ہوتے۔ اس صفحے میں « شتر غمزہ » لکھا ہے اس کے معنے صرف بیہودگی کے ہیں۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے « فصد باید کشاید تا جنونش فرو گردد » اس کے معنے یہ ہیں کہ 'جنون ہوگیا ہے فصد کھولنی چاہیے

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ « از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دہلی رسیدہ‌است» یعنی جنگل اکبرآباد سے ایک الو دہلی میں پہنچا ہے'۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے « معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ‌است » معنے اس عضو کے 'عضو تناسل سے مراد ہے' ذکر کھانا۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے ' « اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می‌دید بینی چہ گوبم گوشش می‌برید » پس ضمیر شین کی بہ طرف معترض ہے ' ضمیر اس شین کی بہ طرف تہمت نہیں ہوسکتی۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے « بضاعت خواجہ همیں ازار است هر کس را نشان می‌دهد » معنے اس کے یہ ہیں کہ ' اس کے پاس یہی پاجامہ ہے ' اور گالی کا کہنا یہ ہے کہ ' ہر کسی کو دکھاتا ہے کہ خریداری کرے '

اس کے بعد صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے « معترض خایہ را چرا گرفت » معنے « خایہ » کے خصیہ اور انڈے کو بھی کہتے ہیں ' یہاں شاید مراد خصیہ لیے ہیں - جو کوئی پڑھے گا وہی اس کے معنے خصیے کے سمجھے گا -

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے « جستن خرس را یاد کردہ‌است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ » معنے یہ ہیں کہ ریچھ کے کودنے کو یاد کیا ہے ' اور بندر کے ناچنے کو یاد کیا ہے -

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے « گوش و بینی چرا گویم دست خواهدبرید و زبان بہ قفا خواهدکشید » معنے اس کے یہ ہیں کہ کان اور ناک کو میں کیا کہوں ہاتھ کاٹے گا اور زبان ساتھ گدی کے کھینچے گا -

سوال از طرف وکیل مدعی ــــ یہ الفاظ کس کی طرف بیان کیے گئے ہیں ؟

جواب ــــ دیباچہ دیکھکر بیان کرتا ہوں کہ نسبت مرزا اسداللہ کے ہیں -

بہ الفاظ نوشتہ اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ‌رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے پڑھکر سنایا - اقرار کیا ' صحیح ہے ' مدعاعلیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا -

اظہار گواہ مدعی

نام میرا حکم‌چند ولد رام‌دیال قوم اہیر ساکن کہاری کوئی عمر ۳۶ برس کی

بیان یہ ہے کہ

صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے « چہ حرکت ناکردنی کردہ‌است » اس کے معنے یہ ہیں کہ جو حرکت کرنے کے لائق نہیں ہے وہ کی ہے یعنی اغلام کیا ہے -

دوسری جگہ لکھا ہے « زخم نہانئی خویش وانماید » زخم نہانی جاے مخصوص سے مراد ہے - میری راے میں یہی معنے آتے ہیں ' عام لوگوں کو میں نہیں کہہ سکتا

ہوں مگر یقین ہے یہی معنے بیان کریں گے ، اور یہ عبارت سابق بھی میں نے دیکھی ہے۔
سوال مدعاعلیہ — تمھاری تصنیف پر مرزا صاحب نے تصدیق لکھی ؟
جواب — ہاں لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے « خر عیسیٰ » اس جگہ مراد خاص گدھے سے ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے « بدشنام پردازم » اس کے معنے یہ ہیں کہ گالیاں دوں میں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ « میان خون حیض غوطہ خورد » اس کے معنے وہی ہیں جو معنے لفظی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے « بہ سوراخش میخے زنند » سوراخ کے معنے اس جگہ مقعد کے ہیں۔ شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے ، بہ طرف گوش نہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے « کلال اکبرآبادی » اگر لفظ عربی ہو تو بہ معنے سستی اور اگر بہ ضم ہو تو بہ معنے کمھار ، اور اگر بہ فتح ہے تو بہ معنے مےکش۔ دوسری جگہ لکھا ہے « سیلی و گردنی‌ها را برائے او بنیاد نہند » اس کے معنے یہ ہیں کہ تھپڑ ماریں۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے « مگر فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد » سوائے لفظی معنے کے اور کچھ معنے نہیں۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے « خبطی » اس کے معنے « دیوانہ »۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے لفظ « عضو » کا اس عضو سے مراد آلۂ تناسل ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے « بینی چہ گویم گوشش می‌برید » سوائے معنے تحت لفظی کے دوسرا مطلب نہیں ہے « گوشش » کے شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے « بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می‌دھد تا خریداری نماید » حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کے پاس یہ پاجامہ ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے۔
سوال مدعاعلیہ — ہمیں کی ضمیر کس طرف جاتی ہے اور لفظ ازار کس کا لیا ہوا ہے ؟
اس سوال کا جواب ضرور نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ « خایہ » کا لکھا ہے اس کے معنے خصیہ ہیں۔

صفحه ۱۶۴ میں لکھا ہے «جستن خرس را یاد کرده‌است و رقص بوز نه را به اظهار آورده» سوا ے لفظی معنی کے اور کچھ بات پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔

صفحه ۱۷۲ میں لکھا ہے «گوش و بینی چرا گویم دست خواهدبرید و زبان به قفا خواهدکشید» معنے اس کے تحت لفظی کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ‌زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعاعلیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہارگواہ مدعاعلیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب‌بہادر۔ ۳ مارچ سنه ۱۸۶۸ع

نام میرا ضیاءالدین ولد محمد بخش ساکن دہلی، پروفیسر عربی، دہلی کالج۔

بیان یہ ہے کہ

میں نے سابق اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحه ۱۳ میں جو عبارت لکھی ہے وہ «حرکت ناکردنی» بہ ہمہ الفاظ کسو خاص حرکت پر خصوصیت نہیں دیکھی۔ اس کے معنے وہ ہیں 'جو حرکت لائق کرنے کے نہ ہو'، لفظ «ضربتہا» جو لکھا ہے اس کے معنے مارنے کے ہیں، خصوصیت کسی دوسرے معنی پر نہیں رکھتا۔

«زخم نہانی» کے معنے یہ ہیں 'زخم اندرونی' یا صدمۂ دل۔ استعمال معنے اس کے اوطیان میں چاہیے جو کچھ لے لے، طرز عبارت سے جو کوئی دیکھےگا وہ معنے اس لفظ کے اور معنے کرکے خیال نہیں کرسکتا ہے۔ یہ عبارت نہ فحش ہے نہ ناسزا گوئی ہے۔ «زخم» موصوف اور «نہاں» اس کی صفت ہے، نہاں کے معنے کسی نے مقعد کے نہیں لیے۔

صفحه ۲۳ میں لکھا ہے «خر عیسیٰ» «خر» کے معنے بےوقوف ہیں اور لفظ «عیسیٰ» سے عظمت اور بزرگی ہوتی ہے۔ جیسے کہ فریزر[۱] صاحب کمشنر دہلی یہاں مارے گئے ہیں ان کی تاریخ وفات میں ایک یہ قطعہ ہے:

چوں فریزر کمشنر دہلی — کشت مقتول از تفنگ بلا
از فلک چارمیں ندا آمد — خر عیسیٰ نمود وا ویلا[۲]

۱۔ لفظ صاف نہیں لکھا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ولیم فریزر کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ فریزر کمشنر دہلی سنه ۱۸۳۵ع مطابق سنه ۱۲۵۱ھ میں مارا گیا لیکن قطعہ مذکور کے آخری مصرع سے یہ تاریخ نہیں نکلتی۔ مدیر «اردو»

« خرعیسیٰ » ایسا ہے جیسا کلب حسین اور کلب علی » چناں چہ والئی رامپور کا نام
کلب علی خاں ہے، معنے 'کتّے علی کے'۔
سوال وکیل مدعی — اس عبارت سے کیا مراد ہے؟
جواب — میرے نزدیک کوئی امر تضحیک کا نہیں ہے۔
صفحہ ۲۸ میں جو لکھا ہے کہ « میان خون حیض غوطہ خورد » یہ
صنعت ایہام ہے، بہ لحاظ حقیقی معنے کے کسی طرح مذمت نہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں
'کام نہایت بےوقوفی سے کرنا، اور وہ کام جو نہیں کرنا ہے'۔ معنے خون حیض کا پینا
نہایت بےوقوفی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ خون حیض کو بہ لحاظ رنگ ناپاک مشابہت
شراب سے ہے گویا کثرت شراب۔
سوال وکیل مدعی — اگر آپ کتاب کو دیکھیں تو کیا کہیں گے؟
جواب — لطیف عبارت اس واسطے ہم ہنسیں گے مگر تضحیک کسی طرح کی اس میں
نہیں ہے۔ عرفی کا قول ہے ع
خون حیض دختر رز جوشد از لب‌ہاے من
خون حیض عورتوں کو آیا کرتا ہے۔ اگر مرد کی نسبت کہا جاوے تو معنی بےوقوفی
ہیں، جیسا کہ حیض الرجال مرد مخل نہیں ... کے واسطے، اس کے معنے عیب
اور بدگوئی کے ہیں۔
صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے « کہ گوش او از بنا گوش برکنند، یا بہ سوراخش
سیخے زنند » سوراخش کے شین کی ضمیر بہ موجب قاعدے کے قریب کی طرف ہوتی
بہ طرف کان۔ مطلب یہ ہے کہ کان کھولے جاویں، مگر صرف اواطت والے
اور سمجھ سکتے ہیں۔
صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے « کلال اکبرآبادی » بہ معنے مے‌فروس، مگر اس
شخص کے واسطے جو دائم الخمر ہو عیب نہیں ہے بلکہ مرزا نوشہ کا شاگرد تخلص[1]
مےکش ہے۔ جو شراب نہ پیوے اس کے نزدیک عیب ہے مگر مدعئی دائم الخمر ہے اس
واسطے اس کی نسبت کچھ تضحیک نہیں ہے۔ دوسری جگہ لکھتا ہے « سیلی و گردنی ہارا
براے او بنیاد نہند » یعنی ہنسیں ان کے اوپر اور اصل یہ ہی ہے۔

۱۔ میر احمد حسین مےکش بےچارہ غدر میں بےگناہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ "فصد باید کشاد" یہ محاورہ روزمرہ کا ہے کچھ سختی کلام نہیں ہے۔

صفحہ ٦١ میں ہے "خبطی[1]" لغوی معنے اس کے یہ ہیں اڑچلنا۔

صفحہ ٦٦ میں لکھا ہے "از خرابۂ اکبرآباد بومے به دهلی رسیدہ‌است" یہ صنعت ابہام ہے مگر اس جگہ معنے زمین کے ہی اچھی طرح ہوسکتے ہیں۔

صفحہ ٧٠ میں لکھا ہے لفظ "ازیں عضو" اس ازیں عضو کی ضمیر بہ طرف قریب پھرتی ہے عضوتناسل کی طرف مگر کوئی کافی نہیں ہے۔

صحفہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ خوب اس کو سزا دینا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے لفظ "ازار" اس کے معنی عربی میں چادر کے ہیں مگر ہندی میں پاجامے کو کہتےہیں۔ بہ کتاب فارسی اگر دیکھا جاوے تو بہ معنی چادر سمجھا جاوے گا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ "خایہ" کا لکھا ہے، یہ بھی صنعت ایہام ہے مگر اس مقام پر معنے بیضۂ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱٦۴ میں جو لکھا ہے اس کے معنے یہ ہیں اور ایسے مقام پر یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ جو حرکت بےجا ظہور میں آئی ہو جیسا کہ رقص......

صفحہ ۱۷۲ میں جو عبارت لکھی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم خوب سزا دے گا۔

عبارت متنازعہ کو ہم لطافت اور خوبی بیان کرتے ہیں اور ایسی تحریر میں دشنام یا ہتک نہیں سمجھتے۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ سنایا گیا؛ اقرار کیا۔ صحیح ہے۔ مدعاعلیہ نے سوال نہیں کیا فقط

۱۔ خبط بہ معنے دست و پا زدن۔

اظہار گواہ مدعاعلیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، واقع ۱۳۔ مارچ سنہ ۱۸٦۸ء

نام سدیدالدین والد کا نام رشیدالدین قوم شیخ ساکن کلی امام عمر تخمیناً ٦۰ برس کی

بیان ہے کہ

میں نے ان دنوں میں اس کتاب کو دیکھا ہے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ "حرکت ناکردنی کردہ است" اس کے معنے یہ ہیں کہ "حرکت" بہ معنی ھلنا، اور "ناکردنی" بہ معنے بےجا سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے خیال میں نہیں آتے لفظ "زخم نہانی" کے معنے زخم پوشیدہ ہیں یعنی زخم اندرونی، اگر بہ سبیل لطیفہ کوئی اور معنے ہوں تو مجھ کو معلوم نہیں۔ "ضربت ھا کشیدہ" کے معنے ہیں کہ کچھ مارا گیا ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ "خر عیسی" اس کے معنے بےوقوف کے ہیں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "ممان خون حیض غوطہ خوردہ" اس کے معنے یہ ہیں کہ جیسے کہ دوسرا فریق لکھتا ہے کہ 'میں پھنس گیا'، مصنّف اس کا لکھتا ہے کہ ناپاک چیز میں پھنس گیا۔

سوال از طرف مدعا علیہ — حیض الرجال کے معنے کیا ہیں؟

جواب — بدگوئی کے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "کہ گوش او از بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے، معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔

سوال وکیل مدعی — اگر سوراخش کے شن کی ضمیر بہ طرف گوش ہو تو بھی ایسے الفاظ سخت ہوتے ہیں یا نہیں؟

جواب — کچھ سخت الفاظ نہیں ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبرآبادی" اردو میں کلال مےفروش کو کہتے ہیں، مگر یہ کتاب فارسی میں ہے، اس واسطے بہ معنی مےنوش "رقص میمونی و شتر غمزہ" کے معنے بیہودہ کلام ہے۔

سوال وکیل مدعی — تحت لفظی معنے کیا ہیں؟

جواب — صاف ہیں۔

صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ "دستش بستہ بہ لائے شراب اندازند" اوپر[1] کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے شراب کے نہیں ہیں، اگر پیدا کرے جاویں تو معترض کے ھاتھ باندھ کر "بہ لائے شراب" ڈالیں۔

صفحہ ۷۰ میں "معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است" معنے یہ ہیں کہ مصنف "قاطع برھان" یعنی اس جگہ معنے عضو کے عضو تناسل لکھا ہے، اور جگہ اس عضو کو دیکھا ہے مصنف اس کتاب کا یہ قول ہے، کہ معترض نے اس عضو سے کیا صدمہ دیکھا ہے۔

صفحہ ۱۳۷ میں جو عبارت لکھی ہے "ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می‌دید بینی چہ گویم کوشش می‌برید" اس کے معنے صاف ہیں اور معنے اس کے تحت لفظی ہیں دوسرے معنے یہ کہ حاکم سزا دیتا، اور معنے نہیں۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می‌دھد" "ازار" معنے تہمد کے ہیں، امور نجسیہ کے نہیں، صرف علمی بحث ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ "خایہ" کا، اس کے دو معنے ہیں، ایک بیضۂ مرغ دوسرے خصیہ مگر چونکہ اس مقام پر لفظ "نان‌خورش" اس واسطے معنے اس کے اس مقام پر بیضۂ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ" اس کے معنے حرکت لغو، اور کام بیہودہ کے ہیں۔

صفحہ ۱۷۲ میں جو لکھا ہے اس کے معنے تحت لفظی صاف ہیں۔

سوال عدالت -- جو فقرے آپ نے پڑھے ہیں آپ ان کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب -- میں فقروں کو لطائف سمجھتا ہوں، بحث میں ایسے بھی فقرے ہوتے ہیں، فحش یا بدنامی کسو کی نہیں ہے؛ نہ کسی کو برا معلوم ہوگا۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے، وکیل مدعاعلیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط۔

---

۱ اوپر کی عبارت یہ ہے:--
"می‌فرماید آویزہ بہ زاے ہوز ہرگز نیست، و نہ اسم شراب است، من می گویم: کہ اگر در فرہنگ‌ھاے دیگر آویزہ بہ زاے ہوز بہ معنے شراب باشد سزاے منکر چیست؟ می باید کہ دستش بستہ بہ لائے شراب اندازند"

اظہار گواہ مدعاعلیه به قرار صالح، به اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر ۱۳۔ مارچ سنه ۱۸۶۸ ع
نام میرا حشمت الله خاں ولد غلام نقش بند خاں قوم مغل ساکن مٹیا محل عمر ۴۲ سال پیشه حکمت
بیان یه هے که

اس چار پانچ روز کے عرصے میں مظہر نے اس کتاب کو دیکھا هے۔ صفحه ۱۳ میں لکھا هے « حرکت نا کردنی، زخم نہانی و ضربت‌ها » حرکت نا کردنی خصوص کسی حرکت کے واسطے نہیں هے۔ « ضربت‌ها » کے تین معنے هیں، اول (۱............) دوم پیدا کرنا سوم اپنا هاتھ سر میں مارنا چہارم سستے نقصان کے بھی هیں، اور زخم نہانی معنے درد دل کے هیں، اور اکثر کتابوں میں لکھا هے که « زخم نہانی » معنے رنج دوری حاصل کرنے کے هیں۔

صفحه ۲۳ میں لکھا هے « خرعیسیٰ » اس کے معنے بےوقوف کے هیں، اور « خر » کے معنے نادان هیں، اور لفظ عیسیٰ بہت بزرگ هے۔ اگر هم کو خر عیسیٰ کہا جاوے، تو هم اپنی عزت سمجھیں۔

صفحه ۲۸ میں لکھا هے « میان خون حیض غوطه خورد » اس کی مراد بےوقوف اور گندی بات سے هے۔ اصل مراد اس کی مصنف سے پوچھی جاوے۔

صفحه ۳۸ میں لکھا هے « به سوراخش میخے زنند » سوراخش کے شین کی ضمیر به طرف گوش کے هے۔

سوال وکیل مدعی - اس مضمون سے کوئی شخص برا مانتا هے؟
جواب -- شعرا کے نزدیک قابل برا ماننے کے نہیں هے، اگر کوئی جھوٹ هم سے کہے تو برا مانیں، مگر برا ماننے کی کوئی بات نہیں هے۔

صفحه ۴۲ میں لکھا هے « کلال » کے معنے هندی میں مےفروش کے هیں، اور عربی میں سست کو کہتے هیں۔ یه کتاب فارسی هے، هندی کے معنے نہیں هوسکتے۔

سوال وکیل مدعی — فارسی میں کیا معنے هیں؟
جواب — اس کا حال نہیں معلوم۔

صفحه ۶۶ میں لکھا هے۔ « از اکبرآباد بومے به دهلی رسیده » اس کے معنے یه هیں اور ترکیب مقلوب هے، یعنی از بوم اکبرآباد، معنے هیں، اس جگه معنے الو،

۱۔ عبارت مسل میں درج نہیں۔ غالباً اعداد شمار غلط درج کیے گئے هیں۔

کے نہیں ہیں وانکہ اوپر معترض نے لکھا ہے کہ بوم مصنف نے لکھا ہے کہ اکبر آباد بوم۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے «معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است» اس کی ضمیر بہ طرف آلۂ تناسل ہوتی ہے اور «ازیں» کی ضمیر بہ طرف قریب ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنے تحت لفظی ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا تو کان کاٹتا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ «بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می‌دہد تا خریداری نماید» معنے ازار کے چادر کے ہیں، «خریداری» کے معنے قبول کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ «خایہ» اس کے معنے بیضۂ مرغ کے ہیں، اور مرزا نے بھی اسی قول میں معنے اس کے بیضۂ مرغ اوپر لکھے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں «جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ یاد آوردہ» معنے اس کے یہ ہیں، کہ بےجا باتوں کو یاد کیا جیسا کہ «جستن خرس و رقص بوزنہ» حرکت بےجا ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے «گوش و بینی چرا گویم دستش خواہدبرید» معنے اس کے اوپر کی عبارت سے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیتا۔ میرے نزدیک سخت کلامی اس میں نہیں ہے، شعرا ایسی عبارت لطافت طوالت کے ساتھ خیال کرتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے؛ پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا، صحیح ہے، مدعاعلیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعاعلیہ

نام میرا حمیداللہ عرف عبدالحکیم ولد محمد عبداللہ قوم سیّد عمر ۲۹ برس ساکن کلاں محل پیشہ روزگار

بیان یہ ہے کہ

میں نے اب یہ کتاب دیکھی صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے «ناکردنی، ضربت ہا و زخم نہانی» «حرکت ناکردنی» کے معنے لفظی ہیں خصوصیت کسی حرکت پر نہیں،

« ضربتہا » معنے رنج و صدمے کے ہیں اور « زخم نہانی » کے معنے رنج کے ہیں اور اکثر شعرا نے بھی یہی معنے باندھے ہیں ۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے « خرعیسیٰ » اس کے معنے یہ ہیں کہ « خر » بمعنی نادان ، اور « عیسیٰ » نام پیغمبر کا لفظ جس سے فخر ہوگیا ۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے « میان خون حیض غوطہ خورد » اس کے معنے یہ ہیں کہ گناہگار ہوے ، مگر در ۱ لفظ ہیں اگر دوسری دفعہ کوئی غلطی کرے گا تو اس عبارت کو باندھ جاوے گا ۔ دیوان حافظ میں کئی جگہ خون حیض درج کیا گیا ہے ، اس وقت کوئی شعر یاد نہیں ۔ یقین ہے ؛ کہ مولانا شاہ عبدالعزیز نے تحفۂ اثناعشریہ میں ان الفاظ کو لکھا ہے ۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے کہ « سزاوار بنا گوش بر کنند یا میخے بہ سوراخش زنند » معنے اس کے لفظی ہیں ۔ « سوراخش » کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے ۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے ؛ کہ « کلال اکبرآبادی » یہ کتاب فارسی ہے ، فارسی میں کلال بہ معنے مست کے ہیں اور اردو میں بہ معنے مےفروش ۔

صفحہ ٦٦ میں لکھا ہے کہ « آرے از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دھلی رسیدہ » معنے یہ ہیں کہ بوم اکبرآباد سے یعنی زمین اکبرآباد سے کوئی دھلی میں پہنچا ۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے کہ « ازیں عضو صدمتے دیدہ‌است » معترض کے دل میں ہے کہ « از ہمیں عضو » اوس ہمیں کی اضافت بہ طرف عضو تناسل ہے اور ازیں عضو کی اضافت بہ طرف اوس عضو کے ہے ۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے ، اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیوے ۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ « بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ، ہرکس را نشان می‌دھد » اوپر قول ہے معترض کا جس میں لکھا ہے کہ « کلاہ را ازار نام نہادہ » مصنف نے لکھا ہے کہ یہ وہی ازار ہے معنے چادر کے ہیں ۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ « خایہ » لکھا ہے ، اس کے معنے بیضۂ مرغ کے ہیں ۔

صفحہ ۱٦۴ میں لکھا ہے کہ جستن خرس را یاد کردہ‌است » اور « رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ » اس کے معنے نظر کرنے کے جہاں نے فاسد[1] باندھ لیے ہیں ۔

۱ ۔ عبارت مشکوک ہے ۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے، اس کے معنے تحت لفظی ہیں، اگر اس چوری کو میں کہوں تو کان ناک کیا کہوں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔

ایسی عبارت کو برا نہیں سمجھتا ہوں، جہاں مناظرۂ علمیٰ ہوتا ہے وہاں ایسی عبارت ہمیشہ ہوتی ہے بلکہ اوروں نے زیادہ اس سے لکھا ہے۔

اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ عبارت معمولی۔

جناب عالی!

جو کہ مجھ مدعی کا مقدّمہ بہ نام مولوی امین الدین بابت ازالۂ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند عدالت ہے، چناں چہ بہ فہمائی چند گرامی روسائے شہر باہم رضامندی ہوئی اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدّمہ باقی نہیں، مقدّمہ داخل دفتر ہوجاوے۔

عرض

عزیزالدین وکیل مدعی ۲۳۔مارچ سنہ ۱۸۶۸ع

از پیش گاہ اوبرین صاحب بہادر

مقدّمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر۔ فقط۔

اردو کا پہلا اصلاحی رسالہ

جاں نثار اختر ایم۔اے (علیگ)

اردو اخبارات اور رسائل کی تاریخ میں تہذیب الاخلاق اپنی نوعیت کا پہلا پرچہ ہے اس لحاظ سے بےمحل نہ ہوگا اگر اخبارات اور رسائل کی تاریخ پر اولاً ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

آزاد کے بیان کے مطابق اردو کا پہلا اخبار سنہ ۱۸۳۶ع میں مولوی محمد باقر نے دھلی سے جاری کیا جو سنہ ۱۸۵۵ کے اواخر تک نکلتا رہا۔ احسن مارھروی نے اپنی کتاب 'تاریخ نثر اردو' میں اردو اخبارات کا پہلا دور سنہ ۱۸۳۵ع سے بتایا ہے لکھتے ھیں: "پہلا دور ــــ سنہ ۱۸۴۷ع سے شروع ہوکر سنہ ۱۸۵۶ع تک ختم ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا سنہ ۱۸۳۵ع سے سمجھنی چاھیے"۔

اس پہلے دور کے متعلق ہم کو مشہور مستشرق گارسن دتاسی (Garcin De Tassy) کا بھی ایک بیان ملتا ہے۔ رسالہ اردو جولائی سنہ ۱۹۲۳ع میں گارسن دتاسی کا جو لکچر شائع ہوا ہے اس میں اس دور کے اخبارات کی تعداد اٹھائیس لکھی ہے۔

احسن مارھروی نے اس دور میں ۳۵ اخبارات گنائے ھیں۔ سیدالاخبار، اخبار دھلی وغیرہ جن کا تذکرہ دتاسی نے اپنے لکچر میں نہیں کیا۔ احسن صاحب نے ان کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائی ہے۔

دوسرا دور احسن صاحب نے سنہ ۱۸۵۷ع سے سنہ ۱۸۸۲ع تک رکھا ہے اور تیسرا دور سنہ ۱۸۸۴ع سے سنہ ۱۹۰۰ع تک۔

تہذیب الاخلاق کو مولانا احسن مارھروی نے اور بہت سے لوگوں کی طرح اخبار تسلیم کیا ہے اور دوسرے دور میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ تیسرے دور تک کے اخبارات کے متعلق اپنی رائے لکھتے ھیں:

" تیسرے دور تک زیادہ‌تر تعلیمی، تاریخی، مذہبی وغیرہ مضامین کا عنصر اخباروں میں نظر آتا ہے اور بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ساری قوت تمام توجہ سیاسی، ملکی اور قومی ریفارم کی طرف مبذول کردی گئی"۔

اور اسی بنا پر وہ تہذیب‌الاخلاق کا شمار بڑی اخبار میں کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تہذیب‌الاخلاق ان اخباروں سے بہ لحاظ اپنی نوعیت بہت مختلف تھا۔ اس کے مقاصد بالکل علیحدہ تھے، وہ خبریں شائع کرنا اپنا اولین مقصد تو کیا آخری مقصد بھی نہ سمجھتا تھا۔ حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں:

" تہذیب‌الاخلاق میں عام خبریں کبھی درج نہیں ہوتی تھیں"۔

تہذیب‌الاخلاق ایک خاص مقصد لےکر اٹھا تھا اور اسی مقصد کے تحت اس میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے اس کا شمار ہم اخباروں میں نہیں کرسکتے بلکہ رسائل میں اس کو گنتے ہیں۔

رسائل کے متعلق قطعی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی ابتدا کب سے ہوئی۔ ہندستانی اکیڈمی کے رسالے 'ہندستانی' کی سنہ ۳۳ع کی جلد میں ایک مضمون "اردو کا ایک قدیم رسالہ" محمد اظہارالحسن بی۔اے علیگ کا شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ایک رسالہ 'خیرخواہ ہند' کا تذکرہ کیا ہے۔ رسالے کا اجرا سنہ ۱۸۴۷ع میں ہوا۔ یہ رسالہ ماسٹر رامچندر کا نکالا ہوا تھا، حجم پچاس صفحات اور تقطیع کتابی ہوتی تھی یہ علمی و ادبی مصوّر مجلّہ تھا۔

'ادبی دنیا' لاہور نوروز نمبر سنہ ۱۹۳۲ع میں پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی نے دهلی کے ایک پرانے رسالے 'محب ہند' کا حال شائع کیا ہے جو جون سنہ ۱۸۴۷ع سے نکلنا شروع ہوا اور کئی برس تک نکلتا رہا۔ ماسٹر رامچندر اس کے مہتمم تھے۔

مشہور فرانسیسی محقق گارسن دتاسی نے اپنے تیسرے خطبے دسمبر سنہ ۱۸۵۲ع میں ان دونوں پرچوں کا ذکر کیا ہے۔

" پروفیسر رامچند (چندر) دو رسالوں کا ایڈیٹر بھی ہے۔ ان میں ایک خاص طور پر ذکر کے قابل ہے جس کا نام محب ہند ہے۔ یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے"۔

دوسرے رسالے کا دتاسی نے نام نہیں لکھا لیکن صاف ظاہر ہے کہ وہ رسالہ 'خیرخواہ ہند' ہے ۔ اس کی تصدیق مخزن مئی سنہ ۱۹۰۹ع سے ہوتی ہے ۔ اس رسالے میں انعام الحق حقی دہلوی نے 'خیرخواہ ہند' کا ایک مضمون "تربیت اہل ہند کے بیان میں" اپنی تمہید کے ساتھ "پرانی چاشنی" کے عنوان سے شائع کیا تھا ۔ اس تمہید میں ہم کو 'خیرخواہ ہند' کے پہلا رسالہ ہونے کے متعلق مولوی ذکاءاللہ کی سند ملتی ہے :

"شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاءاللہ صاحب کی زبانی یہ ہے اور ان کی رائے جو وہ ذاتی علم و یقین کی طرح بیان کرتے ہیں وثوق کے لائق ہے کہ 'خیرخواہ ہند' پہلا رسالہ ہے جو اردو زبان میں پروفیسر رامچندر نے نکالا اور وہی اس مضمون کے مصنف ہیں"۔

انعام الحق حقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس رسالے کا پہلا نام خیرخواہ ہند تھا ، پھر اس کا نام تبدیل کرکے محب ہند رکھا گیا ۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے ۔ اشپرنگر پرنسپل دہلی کالج کی وفات پر ایک انگریزی اخبار Home-Ward Mail نے اس کی زندگی کے حالات چھاپے ہیں اور ایک پرچے کا تذکرہ کیا ہے جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۸۹۴ع میں اس اخبار کا بیان درج ہے :

"ہندستان کو ڈاکٹر الوئس اشپرنگر (Alois Sprenger) کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے سب سے پہلا پرچہ ایسی زبان میں چھاپا جو ایک ہفتہوار پرچہ (Peseodical) تھا"۔

قرین قیاس ہے کہ 'خیرخواہ ہند' ہی وہ رسالہ تھا جو سب سے پہلے ڈاکٹر اشپرنگر کی تحریک سے جاری ہوا اور جو شاید پہلے کچھ دن ہفتہوار نکلتا رہا ہو اور بعد کو ماہانہ کردیا گیا ہو ۔

غرض اردو رسائل کی تاریخ میں 'خیرخواہ ہند' اردو کا پہلا رسالہ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ رسالہ علمی و ادبی مضامین شائع کرتا تھا ۔ بعض بعض مضامین معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر بھی ہوتے تھے مگر اصلاح معاشرت اس کا اصل مقصد نہ تھا ۔

پھر 'خیرخواہ ھند'، سنہ ۱۸۴۷ ع سے لےکر تہذیب‌الاخلاق سنہ ۱۸۷۰ ع کے اجرا تک اگرچہ کچھ علمی و ادبی رسالوں کے نام ملتے ھیں جو تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے نکل کر بند ھوگئے اور کچھ مذھبی رسائل بھی دست‌یاب ھوتے ھیں جو زیادہ‌تر مشنریوں کے نکالے ھوے تھے، لیکن جو مقاصد سرسیّد کے پرچے تہذیب‌الاخلاق کے تھے وہ اس کے قبل کسی دوسرے رسالے کے نہیں پائے جاتے۔

تہذیب‌الاخلاق قطعی طور پر مسلمانوں کی معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی تہذیب کے لیے نکلا تھا یہ نہ علمی و ادبی رسالہ تھا، نہ مذھبی مسائل کا علم‌بردار۔

سرسیّد کو تہذیب‌الاخلاق کے نکالنے کا خیال ولایت کے دوران سفر میں پیدا ھوا۔ حالی نے لکھا ھے کہ جو نام اور بیل تہذیب‌الاخلاق کی پیشانی پر چھپا کرتی تھی اس کا ٹائپ سرسیّد لندن ھی سے بنوا کر ساتھ لائے تھے۔

ھندستان میں آ کر انھوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور تہذیب‌الاخلاق کی اشاعت کی۔

تہذیب‌الاخلاق کی اولین اشاعت کے موقع پر سرسیّد نے جو اس کا مقصد لکھا ھے وہ قوم کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح ھے:

«اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ھے کہ ھندستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سولیزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ھیں وہ رفع ھو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں»

سنہ ۱۲۸۹ ھجری کی ابتدا میں سرسیّد نے ایک اور مضمون مقاصد تہذیب‌الاخلاق کے نام سے شائع کیا جس میں اس پرچے کے مقاصد پر وضاحت سے روشنی ڈالی ھے۔ انھوں نے بتایا ھے کہ ھم اس پرچے کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرت اور تمدن کی برائیوں کی بیخ‌کنی کریں‌گے، اخلاق اور خصائل کی پستیوں کو دور کریں‌گے، مغربی تمدن اور معاشرت کی خوبیوں سے لوگوں کو آگاہ کریں‌گے، علم اور بےتعصبی کی روشنی دل و دماغ تک پہنچائیں‌گے اور ادب و انشا کے لیے ایک جدید اور فطری شاہراہ کھولیں‌گے۔

اس اعتبار سے تہذیب الاخلاق کی اردو ادب میں وہی حیثیت ہے جو انگریزی ادب میں Tatler اور Spectator کی ہے۔

اٹھارویں صدی میں انگلستان کی حالت کئی اعتبار سے عجیب تھی۔ سترھویں صدی کے آخر میں چارلس دوم اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا۔ عام طور پر یہ زمانہ عیش و عشرت کا زمانہ تھا مگر فنون لطیفہ کی سرپرستی بھی اس زمانے میں کی جاتی تھی۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی سے بہت سے امرا بعض ادیبوں کی اعانت کرتے تھے۔ ڈرائڈن اور کانگریو اس زمانے کے ممتاز ادیب ہیں۔ اس ہیجان کے بعد اٹھارویں صدی کی ابتدا میں کچھ سکون آیا، چارلس اور جیمس کے بعد ولیم اور مری اور اس کے بعد ان کی بہن این ملکہ ہوئی۔ بادہ و ساغر کی جگہ زہد و تقشّف نے لی، عریانی اور رنگینی کے بجائے سنجیدگی اور متانت آئی، جوانی کی بےاعتدالیوں نے بڑھاپے کے وعظ و پند کا لباس پہنا۔

اٹھارویں صدی کی ابتدا میں لوگوں نے محسوس کیا کہ عہد چارلس دوم کے اثرات کو بالکل مٹا دینا چاہیے۔ ادب میں اس کا اظہار رسالوں کے عروج سے ہوا اور Tatler اور Spectator ان رسالوں میں ممتاز ہیں۔

اسٹیل اور ایڈیسن کے زمانے سے قبل کوئی رسالہ یا اخبار لندن میں ایسا نہیں ملتا جس کا مقصد اپنی قوم کی روزمرہ زندگی پر نکتہ‌چینی کرنا اور اس کی برائیوں اور بھلائیوں کو جتانا ہو۔ فرانس میں اولا اس طرف کچھ توجہ ہوئی تھی اور سولھویں صدی میں فرنچ عالم مانٹین کے کچھ اصلاحی مضامین شائع ہوئے تھے مگر کوئی پرچہ یا اخبار صحیح معنوں میں ابھی تک اس مقصد کو لےکر نہیں اٹھا تھا۔

سر رچرڈ اسٹیل نے Tatler کے نام سے قومی اصلاح کے لیے رسالہ نکالا۔ اس کا پہلا پرچہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۷۰۹ع کو شائع ہوا۔ اسٹیل اس پرچے کے مقاصد کو لکھتا ہے:

«غرض اس پرچے کے نکالنے کی یہ ہے کہ انسان کی زندگی جو تصنع اور بناوٹ کے سانچے میں ڈھل گئی ہے اس کو دوبارہ سادگی اور فطرت سے ہم‌دوش

کیا جائے اور مکر و فریب اور زعم و نخوت کا جامہ چاک کیا جائے۔ لباس، وضع اور برتاؤ میں سادہ پن پیدا کیا جائے"۔

یہ پرچہ ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے کل ۲۷۱ نمبر نکلے۔ جنوری سنہ ۱۷۱۱ء کو یہ پرچہ بند ہوگیا۔

اس پرچے کے بعد اسٹیل اور ایڈیسن نے مل کر ایک دوسرا پرچہ Spectator کے نام سے جاری کیا۔ یہ پرچہ روزانہ تھا۔ اس کا پہلا نمبر یکم مارچ سنہ ۱۷۱۱ء کو شائع ہوا اور صرف ۳۳۵ نمبر نکلے۔ اسپکٹیٹر اپنے مقصد کو لکھتا ہے:

"میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا۔ تاکہ جہاں تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور تاوقتیکہ لوگ ان خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے لوگ پڑے ہیں سنبھل نہ جاویں ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا کیونکہ جو دل ایک دن بھی بےکار پڑا رہتا ہے اس میں بےشمار عیب جڑ پکڑ جاتے ہیں جس کے ریشے بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں"۔

ان پرچوں کے اجرا نے انگریزوں کے خیالات، رسم و رواج، اخلاق و عادات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ بدعنوانیوں کا سدّباب کرنے میں اٹھارویں صدی کی عقلیت اور سنجیدگی پیدا کرنے میں اسٹیل اور ایڈیسن کا بڑا حصہ ہے۔

انگلستان کے علم و ادب پر بھی اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کی تحریروں کا اثر ہوا۔ جھوٹی عبارت آرائی اور لغو انشاپردازی کا خاتمہ ہوگیا اور ایک نئے طرز تحریر اور طرز ادا کی داغ بیل پڑی۔ خصوصاً ایڈیسن کی تحریریں انگریزی زبان کے علم انشا میں ایک انقلاب عظیم ثابت ہوئیں۔ انھی لوگوں سے دوسرے ادیبوں نے طرز تحریر بنانا سیکھا، پوپ اور سولیفٹ اور جانسن بھی ایڈیسن کے طرز تحریر کے مرہون منت ہیں۔ رچرڈسن (Richardeon) اور فیلڈنگ (Fielding) کے ناولوں کے نقش اول (Roger de Coverly) کے کرداروں میں ملتے ہیں۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ادب کو بادشاہوں کی سرپرستی سے نکال کر عوام تک پہنچایا گیا۔ اب تک ڈرائنگ روم تک ادبی گفتگو محدود رہتی تھی

انھوں نے اسے قہوہ‌خانوں اور دوکانوں تک پہنچایا اور عوام میں علم و ادب کی روح داخل کردی۔

اسپکٹیٹر ایک جگہ لکھتا ہے :-

«سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت کہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں میں سے نکالا اور جلسوں اور قہوہ‌خانوں میں پھیلایا اور دل میں بسایا»۔

ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نے لوگوں میں ادبی نکتہ سنجی پیدا کردی، اچھی اور بری تحریروں میں لوگ تمیز کرنے لگے، عہد ماضی کے لائق مصنفوں کے کارنامے پھر اجاگر ہوگئے، ملٹن کی «گم‌شدہ فردوس» کو انھی پرچوں کی بدولت فروغ ہوا۔

ڈاکٹر ڈریک اس قول کی تصدیق کرتے ہیں :-

«عام لوگوں کو علم و ادب کا شوق اسی وقت سے ہوا جب ٹیٹلر چھپنا شروع ہوا اور اسپکٹیٹر نے اس شوق کو اور بھی بھڑکایا»۔

اسپکٹیٹر کے بعد اسٹیل اور ایڈیسن نے ایک پرچہ Guardian بھی نکالا اور اس کے بعد اٹھارویں صدی میں بہت سے اصلاحی پرچے نکلے جن میں Adventure, Mirror, Adler, World, وغیرہ نے کافی شہرت پائی مگر وہ بات حاصل نہ کرسکے جو اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کو نصیب ہوئی۔

ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کی تاریخ اور ان کے اثرات سرسیّد کے ذہن‌نشین تھے۔

ہندستان کی حالت اس وقت اٹھارویں صدی کے انگلستان سے بڑی بدتر تھی اور خصوصاً مسلمان قوم کی۔

سنه ۵۷ع کے غدر کے بعد مسلمانوں کی برائے نام سلطنت کا چراغ بھی گل ہوگیا، حکومت جاتی رہی لیکن اس کا خمار ایسا تھا کہ قوم ابھی تک ہوشیار نہ ہوئی تھی۔ وہ تمام برائیاں جو کسی قوم میں زوال کے وقت سرایت کرجاتی ہیں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان کے عشرت و نشاط میں روح کی پستیوں کے سوا کچھ نہ تھا، ان کے خصائل و اشغال سے گرا ہوا اخلاق واضح ہوتا تھا، ان کا علم و ادب ایک طرف مبالغے کی تصویر اور دوسری جانب رکیک نفسانی جذبات کا آئینہ ہوگیا تھا۔

سرسیّد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :—

« اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ غلط اور بے اصول باتوں کی پیروی کرنا اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کیے ہوئے خیالات کو امور واقعی اور حقیقی سمجھنا ان کا شعار ہے۔ علم مجلس، اخلاق اور برتاؤ کا ایسا طریقہ پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے »۔

سرسیّد نے اس وقت ہندستان کے لیے ایک ٹیٹلر یا اسپکٹیٹر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس قومی اصلاح کے جذبے کے تحت 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا ہوا۔ خود سرسیّد تہذیب الاخلاق کو مسلمانوں کے لیے ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر بتاتے ہیں :

« خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ انھی اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کا قائم مقام مسلمانوں کے لیے جاری ہوا »۔

تہذیب الاخلاق کا ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر سے موازنہ اور مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کا مبحث مذہبی اصلاح کبھی نہیں ہوا لیکن تہذیب الاخلاق میں گو وہ خود بھی مسائل مذہبی کا علم بردار نہ تھا اکثر جگہ مذہبی مباحث پائے جاتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ انگلستان میں ریفارمیشن (Reformation) کے اثر سے مذہبی خیالات بہت کچھ اصلاح پاچکے تھے، برخلاف اس کے ہندستان میں مسلمان تعصب اور اوہام پرستی میں مبتلا تھے، ان کی تمام معاشرتی اور تمدنی روایات اور خصائل مذہب سے شیروشکر ہوگئے تھے۔ سرسیّد اس کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :—

« ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کیے ایک قدم بھی تہذیب و شایستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے »۔

مسلمان رفارمر ۱۳۱۰ نبوی میں بھی اسی بات کا ماتم کرتے ہیں :—

« مسلمانوں کا رواں رواں مذہب سے ایسا جکڑ دیا گیا ہے کہ کوئی بات بھی مسلمانوں کے حق میں بغیر مذہبی مباحثے کے نہیں کہی جاسکتی »۔

مضمون اختتام سال سنہ ۱۲۹۰ ہجری و شروع سال سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں لکھتے ہیں :—

« اصل مقصد تو ہمارے پرچے کا تہذیب قومی ہے۔ مسائل مذہبی کی بحث بہ مجبوری آجاتی ہے»۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ عقائد اور مسائل جو غلط طور پر اسلامی سمجھ لیے گئے تھے اور جو محض اس بنا پر کہ وہ آبائی ہیں جزو معاشرت ہوگئے تھے قومی اصلاح کے لیے زبردست سنگ راہ تھے

سلطان عبدالعزیز خاں سلطان روم نے جو کونسل فوادپاشا کے تحت اس امر کی تحقیق کے لیے بٹھائی تھی کہ اسلام مانع تہذیب ہے یا نہیں اس کی رپورٹ سے سرسیّد متفق ہیں :--

« ہماری سمجھ میں فوادپاشا کی رائے......بالکل درست ہے۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے پرانے قصے یہودیوں کے اور بہت سی باتیں اور خیالات اور اعتقادات رومن کیتھولک کے جو ایک قدیم عیسائی فرقہ ہے اور جو مدت سے عرب میں بڑی موجود تھا، اور بے انتہا رسمیں اور عادتیں ہندوؤں کی مل گئی ہیں۔ مزید براں بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو در حقیقت مذہب اسلام میں نہیں ہیں »۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :--

« اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بہ ذریعے اس پرچے کے جہاں تک ہوسکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بہ‌خوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ترقی کرنے کی ان کی رغبت دلاویں »۔

<u>تہذیب‌الاخلاق کے مقاصد پر مولانا حالی نے اپنی تصنیف 'حیات جاوید'</u> میں اس طرح روشنی ڈالی ہے :--

« اس پرچے کی تمام‌تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی کے اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ان کو جہاں تک ہوسکے رفع کیا جائے، اسلام پر عیسائیوں کا جو اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے۔ اس کے سوا یورپ کی تہذیب کے اصول و فروع اور ان کے اسباب جو اس کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے، علوم جدیدہ سے رغبت دلائی

جائے، اخلاق و عادات کی خرابیاں بیان کی جائیں، بیہودہ اور مضر رسموں سے انھیں نفرت دلائی جائے اور مسلمانوں کے مردہ دلوں کو ازسرنو زندہ کیا جائے»۔

سرسیّد نے علمائے سلف سے اختلافات کیے، انھوں نے وہ باریکیاں اور دلائل منطقیہ جو علما نے اسلام کے سیدھے سادھے مسائل میں پیدا کی ھیں مسترد قرار دیں۔ لکھتے ھیں :-

«جس کو میں اسلام کہتا ھوں-بدعات محدثات سے اور غلط خیال اجماع سے اور خطأ اجتہادات سے اور ڈھکوسلہ قیاسات سے اور شکنجہ اصول فقہ مخترعہ سے مبّرا و پاک ھے»۔

انھوں نے خود کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی جو طریقہ دین کی حمایت کا قدیم متکلمیں نے یونانی فلسفے کے مقابلے میں اختیار کیا تھا وہ سرسیّد کے نزدیک اس زمانے میں بکارآمد نہیں رہا تھا۔ اس سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ھوتی اور شبہات مذھب کے متعلق بدستور ان کے دلوں میں کھٹکتے رھتے ھیں۔ سرسیّد نے زمانے کے نئے اکتشافات کے بموجب قرآنی آیات کی تفسیر اور معانی بیان کیے ھیں۔ عرش و کرسی، لوح و قلم اور جنت و جہنم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبدا اور معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ھوئے ھیں، سرسیّد کے خیال کے مطابق بطور مجاز و استعارہ ھیں نہ بطور حقیقت۔ انھوں نے لکھا ھے کہ قرآن میں بہت سی باتیں بلالحاظ اس امر کے کہ وہ فی‌الواقع صحیح ھیں یا نہیں محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور ان کے اعتقاد کے موافق بیان کردی گئی ھیں۔

سرسیّد نے مذھب کے سیکڑوں مسائل کو سائنس اور جدید اکتشافات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ھے۔ حالی نے اپنی کتاب حیات جاوید میں سرسیّد کے اس اصول تفسیر کو جہاں تک ھوسکا ھے صحیح اور مناسب ثابت کرنے میں دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

سرسیّد ایک جگہ لکھتے ھیں :-

«میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کرکے تمام مذاھب معلومہ سے اعلیٰ اور سچّا یقین کیا ھے»۔

سرسیّد نے نیچر کو خدا کا فعل اور مذھب کو اس کا قول مانا ھے۔ تہذیب‌الاخلاق کے ایک پرچے میں لکھتے ھیں :-

« سچّے خدا کا قول و فعل کبھی مخالف نہیں ہوسکتا اس لیے ضرور ہے کہ مذہب اور نیچر متّحد ہو اور بلا شبہہ یہ بھی ہمارا اعتقاد ہے کہ انسان بہ‌سبب ذی‌عقل ہونے کے احکام مذہبی کا مکلف ہوا ہے۔ پس اگر وہ احکام عقل انسانی سے خارج ہوں تو معلول خود اپنی علت کا معلول نہ ہوگا، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ وہ احکام ہماری تمھاری عقل سے خارج ہوں الاّ عقل انسانی سے خارج نہیں ہوسکتے »۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد کی رائے مذہب کے متعلق نتیجہ تھی یورپ اور سائنس سے مرعوبیت کا۔ مسلمانوں کو الحاد سے روکنے کے لیے انھوں نے مذہب کی سائنس سے تطبیق کی کوشش کی چوں‌کہ سائنس پر حاوی نہ تھے اس کو مذہب تک نہ لاسکے۔ مذہب کو سائنس کی سطح پر لانے کی کوشش کی اور یہیں غلطی کی۔

(نواب صدر یار جنگ) مولانا حبیب‌الرحمن شیروانی ایک موقع پر لکھتے ہیں:

« سرسیّد مذہب اور سائنس کو ملانا چاہتے تھے، سائنس کو مذہب سے نہیں، مذہب کو سائنس سے »۔

سرسیّد کے یہی مذہبی خیالات تہذیب‌الاخلاق کی مخالفت کا باعث ہوے۔ ابھی دو چار ہی پرچے نکلے تھے کہ ہر طرف سے اس کی مخالفت ہونے لگی۔ خود سرسیّد کے قلمی معاونین ان کے مذہبی نقطۂ نظر سے بالکل متفق نظر نہیں آتے۔ محسن‌الملک کے مکاتبات میں سرسیّد سے ان کے مذہبی خیالات پر مباحثے موجود ہیں۔ اس قسم کے مباحثوں کا مقصد تہذیب‌الاخلاق کی مخالفت ہرگز نہ تھا بلکہ صحیح نتائج اور حقائق کا مرتب کرنا تھا۔ محسن‌الملک اپنے مکاتبات میں لکھتے ہیں:—

« اگر میں نے ان کی کسی رائے کو صحیح پایا اسے تسلیم کیا اور اگر کوئی عقیدہ ان کا میری سمجھ میں نہ آیا اس کے غلط کہنے اور رد کرنے میں ان کی عظمت اور ادب کا کچھ خیال نہ کیا »۔

حالی جنھوں نے سرسیّد کے اصول تفسیر کو صحیح ثابت کرنے کی بلیغ کوشش کی ہے، خود انھوں نے بعض مقام پر سرسیّد کی « رکیک لغزشوں » کا تذکرہ کیا ہے۔

البتہ کان‌پور، گورکھپور اور مرادآباد سے بہ‌کثرت ایسے رسالے اور اخبار نکلے جو سرسیّد کے مذہبی خیالات کو سننا بھی پسند نہ کرتے تھے، معقولیت سے بحث کرنا تو درکنار۔ ان رسالوں میں کان‌پور کے 'نورالافاق' اور 'نورالانوار' زیادہ مشہور ہیں۔

مولوی سید امدادالعلی نے امدادالافاق اور حاجی علی بخش نے تائیدالاسلام اور شہاب ثاقب سرسیّد کی مخالفت میں لکھے ۔ بعض لوگوں نے تہذیب‌الاخلاق کا نام تخریب‌الاخلاق اور تخریب‌الافاق بھی رکھا اور مشہور کیا۔ اردو کے مشہور ظریف اخبار 'اودھ پنچ' نے سرسیّد کے متعدد کارٹون شائع کیے اور ان پر مزاحیہ مضمون اور نظمیں لکھیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تہذیب‌الاخلاق کی مخالفت صرف پہلی ھی اشاعت کے موقع پر نہیں ھوئی بلکہ تیسری مرتبہ جب تہذیب‌الاخلاق نکلا تو بھی اسی زور سے اس کی مخالفت کرنے والے پیدا ھوگئے ۔ ایڈیٹر نجم‌الاخبار اٹاوہ نے ایک آرٹیکل تہذیب‌الاخلاق اور اس کے معاونوں کی نسبت لکھا اور تہذیب‌الاخلاق کو نکالنے سے روکنا چاھا ۔ اخبار 'جریدۂ روزگار' مدراس میں بھی ایک صاحب مولوی وکیل احمد مقیم حیدر آباد نے ایک طولانی مضمون لکھا اور بتایا کہ پہلے سے بھی زیادہ لوگ تہذیب‌الاخلاق کے مقابل میں ھاوھو کرنے کو تیار ھیں ۔ یہ صاحب نورالافاق میں بھی تہذیب‌الاخلاق کے خلاف مضامین لکھ چکے تھے ۔ سرسیّد تہذیب‌الاخلاق اور اس کے حامیوں کو مبارکباد میں ان صاحب کو جواباً لکھتے ھیں :--

« امید ھوتی ھے کہ نورالآفاق بجائے کانپور کے حیدرآباد یا مدراس سے جاری ھو اور تہذیب‌الاخلاق کے لیے وھی دھوم‌دھام رھے جو پہلے تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ »

سرسیّد تہذیب‌الاخلاق کی ان مخالفتوں سے کبھی خائف نہ ھوے بلکہ مسرور نظر آتے ھیں :--

« خوشی یہ ھے کہ لوگ اس کے مضامین پر بحث کرتے ھیں اور رد و قدح پر متوجہ ھیں۔ بعض اخباروں نے ھمارے مضامین کے رد کرنے کا پیشہ اختیار کیا ھے اور بعض جگہ ھمارے مضامین پر بہ‌نظر تردید بحث کرنے کے لیے مجلسیں مقرر ھوی ھیں......یہ سب باتیں معرض بحث میں نہ آتیں تو ھم کو اپنی تحریروں کے موثر ھونے کا کچھ بھی یقین نہ ھوتا ـــــ وھی مسائل انجام کو ھردلعزیز ھوتے ھیں جو بعد مباحثہ قائم رھتے ھیں » ۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

" سچ میں بھی کوئی ایسی کرامات نہیں ہے کہ وہ از خود لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اس میں جو کچھ کرامات ہے وہ یہی ہے کہ مباحثے کا اسے خوف نہیں ہے "۔

سرسیّد نے مخالفین کا جواب دیا لیکن کبھی سنجیدگی اور متانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ ان کے جوابات میں رجائیت کا عنصر غالب ہے جو ایک ریفارمر کی تحریروں کی روح ہوتا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" ہم یقین کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر صرف حمیت اسلامی کے سبب اور بعض اپنی جبلت اور خلقی سخت مزاجی اور کج رائی کے سبب ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ پس ہمارا اور ہمارے اکثر مخالفوں کا مطلب واحد ہے۔ ہم دونوں اسلام کے خیرخواہ اور اور اپنی قوم کی ترقی کے چاہنے والے ہیں۔ صرف ہم میں اور ہمارے مخالفین میں اتنا فرق ہے کہ جو کچھ ہم نے سمجھا اور سونچا اور دیکھا ہے وہ انھوں نے سونچا، سمجھا، دیکھا نہیں۔ جب ان کے دل کو بھی خدا وہ باتیں سوجھا دے گا جو ہم کو سوجھائی ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ متفق ہوجاویں گے "۔

کبھی کبھی سرسیّد کے قلم سے اپنے مخالفوں کے جواب میں ایک خندہ آمیز طنز ٹپک پڑتا تھا جو اپنی تیزی میں نوک نشتر سے سوا ہوتا ہے۔

مولوی علی بخش بدایونی مکۂ معظمہ سے سرسیّد کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ سرسیّد ان کی واپسی پر لکھتے ہیں :-

" جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکۂ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا ان کے لائے ہوئے فتووں کو دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں :

ببیں کرامت بت‌خانۂ مرا اے شیخ	کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

سبحان‌اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے جو کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے "۔

ایڈیٹر ' نجم الاخبار ' اٹاوہ نے 'تہذیب الاخلاق' کی تیسری اشاعت پر مخالفت کی۔ سرسیّد اپنے مضمون ان ھذا لشئی عجاب میں جواباً تحریر کرتے ھیں۔ کس قدر میٹھا طنز ھے :-

" ھم کو یہی رونا تھا کہ جب ھمارے مخدوم مولوی سیّد امدادالعلی صاحب — اور مکرمی مولوی علی بخش — دنیا سے چل بسے تو 'تہذیب الاخلاق' کے جاری ہونے میں کیا مزہ رھا مگر نہیں خدا کی خدائی خالی نہیں ھے۔ خدا شکر خورے کو شکر پہنچا ھی دیتا ھے۔ ھمارے دوست ناصح اب بھی موجود ھیں "

تہذیب الاخلاق نے باوجود ان رکاوٹوں کے مسلمانوں کی مذھبی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی اور علمی اصلاح میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔

بہت سی رسوم جو غلطی سے اسلامی تہذیب کا جامہ پہن کر ھماری معاشرت اور تمدن میں داخل ھوگئی تھیں مٹنے لگیں۔ اسلام پر جو یوروپین محققین کے اعتراضات تھے ان کا جواب اول اول تہذیب الاخلاق ھی نے دیا اور نہایت وقیع دلائل سے ان کے استدلال کی کاٹ کی۔ سرسیّد اور محسن الملک اس کے لیے خاص طور پر لائق ستایش ھیں۔ بعد میں یہ کام شبلی نعمانی نے اپنے ھاتھ میں لیا اور کوئی شک نہیں کہ انتہائی خوش اسلوبی اور قابلیت سے انجام دیا۔ تعصب کی سخت گیریاں بھی کم ھونے لگیں۔ مسلمان، علوم جدیدہ اور زبان انگریزی سے نفرت کے ساتھ وحشت بھی کرتے تھے، تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کو ان کی طرف رغبت دلائی۔
مولوی ذکاءاللہ ایک مضمون میں لکھتے ھیں :

" انگریزی زبان اور علم کی تحصیل سے وحشت ایسی بیٹھ گئی تھی کہ وہ کوسوں ان سے بھاگتے تھے۔ اس وحشت اور تعصب کا بالکل استیصال کردیا "

" تہذیب الاخلاق نے قوم کے دلوں میں جو مردہ ھوگئے تھے بیداری کی لہر سی دوڑا دی۔ لوگوں میں یہ خیال موج زن ھوگیا کہ قوم کی حالت واقعی قابل توجہ و پرسش ھے اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا احساس سوتے ھوئے دل و دماغ میں نشتر سے چبھونے لگا " کتاب تہذیب الاخلاق کے دیباچے میں اس پرچے کی خدمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ھے :

"قوم کو دیکھا کہ قومی سلطنت کا سایہ اٹھ جانے سے علوم و فنون کی تحصیل چھوڑ بیٹھنے سے اس پر ادبار چھا گیا ہے۔ خواب غفلت میں پڑی اینڈ رہی ہے، نہ سرسری پکار سے آنکھ کھلتی ہے اور نہ معمولی جھنجھوڑے سے کروٹ بدلتی ہے۔ تب ایک شیریں کلام، بلند آواز، ان تھک طبیعت کو اس پر متعیّن کیا، اس کی سریلی آواز میں وہ غضب کی طاقت تھی کہ جس دل میں گئی جادو کی طرح اثر کر گئی، جس گھر میں پہنچی مقناطیس کا کام کر دکھایا، سوتوں کو جگایا مستوں کو ہشیار کیا، مردہ تنوں میں روح پھونک دی، زندہ دلوں کو روح القدس عطا کیا ـــ وہ شیریں کلام کون تھا؟ مقدس تہذیب الاخلاق۔"

"تہذیب الاخلاق نے جو بیداری پیدا کی اور علمی فضا قائم کی، اس کی زبردست تحریک "مدرسۃ العلوم مسلمانان" ہے جو علی گڑھ تحریک کے نام سے مقبول ہوی۔ اس تحریک کی پیدایش، اشاعت اور مقبولیت میں تہذیب الاخلاق کا زبردست ہاتھ ہے"

دیوبند، سہارن پور، گنگوہ وغیرہ کے کل مدارس مدرسۃ العلوم مسلمانان کی تحریک سے متاثر ہوے۔ جابجا مدرسے قائم ہونے لگے۔ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ بھی تہذیب الاخلاق ہی کی تحریروں کے اثر سے قائم ہوا جس میں علوم معینہ کے علاوہ مذہب اثناعشریہ کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ تہذیب الاخلاق کی کوشش نے شیعہ اور سنّی دونوں کے دلوں کو جگادیا تھا۔ اگرچہ ان مدرسوں کی راہ سرسیّد کے خیال کے مطابق نہ تھی پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ لوگ کچھ کرنے لگے تھے۔

سرسیّد لکھتے ہیں:

"عجب کیا ہے کہ رفتہ رفتہ اس راہ پر بھی جاپڑیں جو فی الحقیقت سیدھی اور ٹھیک ہے جس راہ سے منزل مقصود پر پہنچنا ممکن ہے۔ ا سے ہاں تو شروع ہوی۔"

تہذیب الاخلاق نے اپنے ملک کے علم و ادب کو بھی متاثر کیا بلکہ ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر سے زیادہ اس بارے میں اپنی قوم کی خدمت کی۔ ایک طرف علی گڑھ تحریک اس پرچے کی مرہون منت ہے دوسری طرف اس کی چنگاری سے اردو ادب کا نشاۃ الثانیہ طلوع ہوا۔

ابھی تک علم و ادب اور انشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے، دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتیں لکھنے پر منحصر تھی۔ تہذیب الاخلاق نے جو باتیں اردو میں پیدا کیں ان کو سرسیّد ایک مقام پر لکھتے ہیں:

«مضمون کے ادا کا سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔»

انشا کے اس طرز جدید نے اردو میں نئی روح پھونک دی۔ ہندستانی اخباروں، خانگی خط و کتابت اور نو تصنیف کتابوں کی طرز تحریر میں بڑا فرق پیدا ہوگیا۔

مولوی ذکاءاللہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

«ہم کوئی اخبار یا خط یا کوئی کتاب ایسی نہ دیکھتے ہوں کہ اس پرچے کی تحریر کا پرتو نظر نہ آتا ہو بعض برملا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سیّداحمد خانی تحریروں سے مستفیض اور مستفید ہوے جو ایسے مضمون لکھتے ہیں۔ بعض ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اگر کوی میری تحریر میں کوی خوبی بتلائے تو اسے بھی کہ دوں کہ میں نے وہ انھی سے حاصل کی ہے»

اردو کے اسالیب بیان میں ڈاکٹر محی الدین زور لکھتے ہیں:

«اردو زبان کی خدمت و اصلاح اس کی ہر تحریر سے ہوئی۔ اس کی مخالفت یا موافقت کی وجہ سے غیر ارادی طور پر اس کی سادہ تحریر کا اتباع کیا گیا اور چند ہی سال میں اردو نثر میں سادہ طرز تحریر کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا»

شبلی نعمانی نے بھی سرسیّد کو اردو کی موجودہ انشاپردازی کا «مجدد اور امام» تسلیم کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق نے نہ صرف انشا کے لیے طرز جدید ایجاد کیا بلکہ قوت قلم کے لیے نئی فضا، نئے تخیلات، اور نئے رجحانات پیدا کیے۔ قوم، قومیت اور قومی ذمہ داری جن پر اس زمانے میں اس قدر شد و مد سے بحث کی جاتی ہے۔

تہذیب‌الاخلاق ہی کے ذریعے ملک کے ادب میں داخل ہوئے - سب سے اول تہذیب‌الاخلاق ہی نے قومیت کا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کیا۔ چناں‌چہ مولوی ذکاءاللہ تہذیب‌الاخلاق سنہ ۱۳۲۴ ہجری میں لکھتے ہیں :

« یہ اسی کے تصرفات تھے کہ الفاظ، قوم، قومی ہمدردی اور قومی خیرخواہی ہمارے روزمرہ میں داخل ہوگئے »

اردو زبان نے اسی کے ذریعے قومی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات پر مضمون‌نگاری کی جدید بنیادیں اٹھائیں، اپنے پرانے حدود سے گزر کر ایک عالم‌گیر علمی و ادبی زبان کی حیثیت اختیار کی۔

شبلی اپنے مضمون « سرسیّد مرحوم اور اردو لٹریچر » میں لکھتے ہیں :

« جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے - سرسیّد ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کرسکتی ہے »

ایک انگریز نقاد لکھتا ہے

« تہذیب‌الاخلاق نے جہاں یہ ثابت کردیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک راستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا تھا وہاں یہ بھی ثابت کردیا کہ اردو زبان میں بھی ہرقسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہوسکتے ہیں »

ان علمی و اصلاحی مضمون اور مباحث کے ذریعے اردو میں الفاظ کا بڑا سرمایہ پیدا ہوگیا تہذیب‌الاخلاق کی یہ ادبی کارگزاری کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔

تہذیب‌الاخلاق نے علاوہ اس کے اردو نثرنگاری کو فطرت سے آشنا کیا - فطرت نگاری کی ابتدا اسی کے ہاتھوں ہوئی - مولوی ذکاالله لکھتے ہیں

« نیچر کے مضامین جو اس میں درج ہوے ہیں ان سے لوگوں نے جانا کہ ہاں مضمون‌نگاری اس کا نام ہے جو بیان کہ دل کے اندر تاثیر کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ بھی ہے - »

تہذیب الاخلاق میں بہت سے انگریزی مضمونوں، خاص کر اس ٹیل اور ایڈیسن کے مضامین کو اردو کے جامے میں پیش کیا ہے، ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ ان انگریزی خیالات کو اردو زبان کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ سرسید کا مضمون «گزرا ہوا زمانہ» اسی نوع کا مضمون ہے۔

بعض مضامین تہذیب الاخلاق میں ایسے بھی ملتے ہیں جو دوسرے رسالوں یا اخباروں سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً محمد احسان اللہ کا مضمون «انسان کا عجیب کشمکش میں ہونا» اولاً انسٹیٹوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا تھا یا ایک مضمون «خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا» اخبار اودھ پنچ سے تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا ہے۔

پھر اس وقت کے اخباروں اور رسالوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی تہذیب الاخلاق کے بہت سے مضامین شائع کیے ہیں بلکہ بعض بعض مضامین کا دوسری زبان میں ترجمہ بھی نکلا ہے۔ اس وقت کے ایک ہندستانی مشہور عربی اخبار النفع العظیمہ لاہل ہذا الاقلیمہ، مطبوعہ ۱۴ ذیقعدہ میں تہذیب الاخلاق کا ایک مضمون عربی زبان میں ترجمہ ہوکر شائع ہوا ہے۔

تہذیب الاخلاق سے اس زمانے کے نہ صرف ادبی رسائل متأثر ہوئے بلکہ اخباروں پر بھی اثر پڑا۔ کوئی نہ کوئی معاشرتی، اخلاقی یا ادبی مضمون ہر اخبار میں شائع ہونے لگا۔ مسٹر ایڈیسن کا ایک مضمون «امید» جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوچکا تھا وہ دوسری جگہ بہ طور ترجمہ پٹیالہ اخبار مطبوعہ ۲ جنوری سنہ ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔

اردو مضمون نگاروں کی تعداد بھی روز بہ روز بڑھنے لگی۔ سرسید تہذیب الاخلاق سنہ ۱۳۱۰ نبوی کے ایک رسالے میں اپنے پرچے کی زود اثری پر تعجب کرتے ہیں:

«سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آرٹیکل لکھنے والے کہاں سے پیدا ہوگئے۔ ایک نوجوان ہونہار سید ممتاز علی لاہوری کو دیکھو کہ کس دماغ اور سمجھ بوجھ کا شخص

پیدا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ احسان اللہ الہ آبادی کون بزرگ ہیں ان کے آرٹیکلوں پر غور کرو......... کیا چند سال پہلے کسی کو توقع تھی کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے "۔

اردو شاعری پر بھی تہذیب الاخلاق کا اثر پڑا۔ اردو شاعری ابھی تک شخصی اور صنعتی تھی۔ "بادشاہت کی تال تلیوں میں پڑے پڑے اس میں مردنی اور کثافت پیدا ہوگئی تھی"۔ تہذیب الاخلاق نے اس شاعری کو قوم کے لیے مفید بتایا اور نیچر کی طرف شاعری کا رخ موڑا۔ تہذیب الاخلاق کی کوششوں نے بالواسطہ اسے بھی زمانے کے صاف اور تیز دھارے پر بہنا سکھایا۔

مولوی ذکاء اللہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"قافیہ سنجوں نے اپنی عادت کے موافق اول اول تو نیچر کا قافیہ کیچر باندھ دیا تھا مگر......... پھر وہ بھی نظم میں نیچر کے میدان میں قدم رکھنے لگے اور مضامین عشقیہ اور خیالیہ سے ہاتھ اٹھانے لگے"۔

مولوی محمد حسین آزاد کی مثنوی 'خواب امن' اور مولانا الطاف حسین حالی کی مثنویاں 'حب الوطن' اور 'مناظرۂ رحم و انصاف' اس ابتدائی زمانے کی یادگار ہیں۔

اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں سنہ ۱۸۷۴ ع کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل نظمیات کا پہلا مُشاعرہ منعقد ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔

سرسیّد تہذیب الاخلاق کے اس ادبی اجتہاد اور جدید اردو کے متعلق اپنے مضمون اختتام سال سنہ ۱۲۹۱ ھ و شروع سال سنہ ۱۲۹۲ ھ میں لکھتے ہیں:

"نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر، درد، ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو۔ میر امن دھلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو جو اس سے زیادہ فصیح، دلچسپ اور بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اس زمانے کی پیداوار ہے اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ

رهےگی........تو چند روز میں همارى ملکی تحریریں بھی میکالے اور ایڈیسن کی سی هوجاویں گی »

الغرض اردو ادب کے لیے تہذیب‌الاخلاق نے جدید اور لافانی فضا پیدا کی ۔ اردو میں بھاشا کی سادگی، عربی کی وسعت اور انگریزی کی صاف گوئی آ گئی ۔ اس طرز جدید کی لَے آیندہ چل‌کر حالی کی تنقید اور سیرت نگاری میں، نذیر احمد کے افسانوں اور ناولوں میں اور شبلی کی تاریخ نگاری میں پائی جاتی ہے ۔

مولوی ذکاءاللہ تہذیب‌الاخلاق پر ریویو میں لکھتے هیں :

« کیا مبارک دن عید کا یکم شوال سنہ ۱۳۰۱ نبوی اور سنہ ۱۲۸۷ هجری تھا کہ ایک دانش‌مند باغبان نے اپنے دست مبارک سے همارى قوم کے لیے اس سرزمین هند میں تہذیب‌الاخلاق کا وہ بیج بویا کہ پہلے کبھی نہ بویا گیا تھا »

خود سرسیّد تہذیب‌الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے هیں :

« وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال سنہ ۱۳۰۱ نبوی اور سنہ ۱۲۸۷ هجری جب کہ همارا پہلا پرچہ نکلا امید هے کہ همارى قوم کی تاریخ میں کبھی نہ بھولا جاوےگا » ۔

سرسیّد کا یہ پرچہ تین مرتبہ جاری هوا اور بند هوا ۔

پہلی مرتبہ یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ع کو شائع هوا اور رمضان سنہ ۱۲۹۳ھ تک برابر نکلتا رها اور قوم کی خدمت انجام دیتا رها ۔ سرسیّد آخری تہذیب‌الاخلاق کے پرچے میں لکھتے هیں :

« سات برس تک هم نے بہ‌ذریعے اپنے اس پرچے کے اپنی قوم کی خدمت کی ۔ مذهبی بےجا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا، دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس میں ان کو روشنی دکھائی........اردو زبان کا علم و ادب جو بد خیالات اور موٹے بھدے الفاظ کا مجمع هو رها هے اس میں بھی جہاں تک هم سے هوسکا هم نے اصلاح چاهی........اب بہت لوگ هیں جو ان باتوں کو پکارتے هیں، گو اس وقت ٹیڑھی میڑھی لہریں کھاتے هیں مگر پانی میں حرکت هی کا آجانا کافی هے پھر وہ خود چورس هورهےگا » ۔

آگے چل کر اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

«سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں تا کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوے تو مطلب پورا ہوگیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑاے اور کچھ جھنجلاے، ادھر سے ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر پھٹک دیا اور جھنجلاہٹ میں اینڈے پڑے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجے تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہیے اور تہذیب‌الاخلاق کو بند کرکر دور سے نیند کے ان خمارآلودوں کا جو اب صرف جھنجلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں اٹھنا اور ہوشیار ہونا دیکھنا چاہیے»۔

در اصل تہذیب‌الاخلاق کے بند کرنے کی وجہ مدرسۃالعلوم مسلمانان کے قیام اور انتظام کی مصروفیت تھی۔ سنہ ۱۸۷۶ع میں سرسیّد پنشن لےکر علی‌گڑھ چلے آئے اور کالج اور اس کے انتظام نے ان کو بالکل عدیم‌الفرصت کردیا۔

سرسیّد مدرسۃالعلوم کی اسکیم کو قوم کے لیے تہذیب‌الاخلاق سے زیادہ مفید اور بہ‌کارآمد سمجھتے تھے۔ اپنے ایک مضمون نورالافاق میں مدرسۃالعلوم کا تذکرہ کرتے ہوے امدادالعلی صاحب کو لکھتے ہیں:

«اگر آپ مدرسۃالعلوم کی تائید میں دل سے شریک ہوں میں آج ہی تہذیب‌الاخلاق کو بند کردوں‌گا کیوں‌کہ میری راے میں جناب امدادالعلی خان بہادر سی۔ ایس۔ آئی کا دل سے مدرسۃالعلوم کی تائید کرنا بہ‌نسبت جاری رہنے تہذیب‌الاخلاق کے قوم کے لیے بہت زیادہ مفید ہے»۔

سنہ ۱۲۹۶ھ میں تہذیب‌الاخلاق دوبارہ جاری ہوا۔ سرسیّد نے اس بات کو محسوس کیا کہ مدرسۃالعلوم کے ساتھ ساتھ تہذیب‌الاخلاق کا جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ پرچہ زیادہ دن نہ نکلا، دو برس اور پانچ ماہ رہ کر پھر بند ہوگیا۔ تہذیب‌الاخلاق کو دوبارہ بند کرنے کی اصل وجہ تفسیر کے مشغلے کا وقتی انہماک تھا لیکن سرسیّد اس بات کو بھولے نہ تھے کہ وہ مقاصد جو تہذیب‌الاخلاق کے پیش‌نظر ہیں ابھی اور اشاعت چاہتے ہیں۔ سرسیّد نے تمہید میں جو تیسری اشاعت کے موقع

پر لکھی ہے اس کا اعتراف کیا ہے اور قوم کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوے تہذیب الاخلاق کی اہمیت کو تفسیر سے زیادہ بتایا ہے

» تفسیر قوم اور مذہب کے لیے مفید ہو یا نہ ہو اس سے بحث نہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق کا نفع قوم اور مذہب کو بہ نسبت تفسیر کے بہت زیادہ تھا۔ «

آگے چل کر لکھتے ہیں

« تفسیر صرف امور مذہبی میں نصیحت کرنے والی ہے ۔ تہذیب الاخلاق امور مذہبی میں، نیچرل سائنس میں، رسوم بد کے چھوڑانے میں اور تمام مذہبی اور دینوی امور میں نصیحت کرنے والا تھا،

« تفسیر کو ضرور پورا کرنا چاہیے مگر تہذیب الاخلاق کا بھی بہ دستور جاری رکھنا لازم ہے »

مولوی نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون تہذیب الاخلاق سنہ ۱۳۲۴ نبوی میں بھی اس پرچے کی ضرورت کو ابھار کر لکھا ہے

« اگرچہ تہذیب الاخلاق نے تھوڑے دنوں میں مسلمانوں کی حالت کچھ سے کچھ کردی ہے مگر یہ نیا رنگ ابھی ہے کچّا۔ مسلمانوں کو اس ماٹ میں سیکڑوں ڈوب دینے ہیں تب کہیں صبغۃ اللہ کا رنگ آئے گا »

ایک طرف سرسیّد کا اپنا احساس دوسری طرف مولوی نذیر احمد کی تحریک!!

نذیر احمد خود اپنے مضمون تہذیب الاخلاق سنہ ۱۳۲۴ نبوی میں لکھتے ہیں

« دسمبر سنہ ۱۸۹۳ع کی ایجوکیشنل کانفرنس میں ادب اور حفظ مراتب کو بالاے طاق رکھ کر سرسیّد احمد خاں کو تہذیب الاخلاق کے بند کرنے پر خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا ۔ واہ رے میں کہ میں نے ایسی جرات کی اور ولہ رے سرسیّد کہ دسمبر میں تہذیب الاخلاق پھر جاری کر دکھایا »

محسن الملک مولوی مہدی علی نے بھی اپنے مضمون 'مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا' میں اس کی تصدیق کی ہے ۔ نذیر احمد کا تذکرہ کرتے ہوے لکھتے ہیں

« تہذیب‌الاخلاق کا دوبارہ جاری کرانا بھی انھی کا حصه تھا ۔ انھوں نے اب کے کانفرنس کے جلسے میں اپنی جادوبیانی سے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانه کردیا کہ ہر شخص تہذیب‌الاخلاق تہذیب‌الاخلاق ' پکارنے لگا اور چاروں طرف سے اس کو دوبارہ جاری کرنے کا شور مچ گیا ۔ انھوں نے پرانے جنون کو تازہ کردیا اور سیه مستان بادۂ محبت کو میکدے کی یاد دلائی ۔ اس نشے کے متوالے « ادر کاساً و ناولہا » پکارنے لگے »

تہذیب‌الاخلاق کی اس تیسری اشاعت کا پہلا پرچه یکم شوال سنه ۱۳۲۴ نبوی کو نکلا ۔ سرسیّد کی حیثیت اب اس پرچے کی نگراں کی تھی ۔ رسالے کے ایڈیٹر عنایت‌اللہ بی ۔ اے تھے تہذیب‌الاخلاق کے پرچوں کی تاریخیں دیکھنے سے پتا چلتا ھے که پہلی دو اشاعتوں میں سرسیّد نے اس کو ہر پندرھویں روز نکالنے کی کوشش کی تھی گو اس کی پابندی اصولی طور پر مطلقاً نه ھوسکی ۔ تیسری اشاعت میں یه پرچه ماهانه نکلتا رھا اور اس کے صفحات کی تعداد بھی بجائے آٹھ کے سوله ھوگئی ۔

سیّد نے تیسری اشاعت کی تمہید میں ان اہل‌قلم حضرات کا تذکرہ کیا ھے ۔ جنھوں نے اس مرتبه پرچے کی قلمی اعانت کا مستقل وعدہ کیا تھا

« نواب محسن‌الملک مولوی سیّد مہدی علی خان بہادر نے تو اس کا بیڑا اٹھایا ھے ۔ سیّد محمد محمود ـــــ مولوی سیّد کرامت‌حسین ـــــ مولانا الطاف حسین حالی ـــــ شمس‌العلما خان بہادر ذکااللہ ـــــ شمس‌العلما مولوی محمد شبلی نعمانی نے تو پکا وعدہ مضامین کی تحریر کا کرلیا ھے اور یه ممکن نہیں که مولانا مولوی حافظ نذیر احمد اور نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور شمس‌العلما مولوی سیّد علی بلگرامی اور نواب وقارالملک مولوی محمد مشتاق‌حسین سے مضامین لکھنے کی درخواست کی جاوے اور وہ منظور نه کریں ۔ »

تہذیب‌الاخلاق کی یه تیسری اشاعت تین سال سے زیادہ نه چل سکی تہذیب‌الاخلاق میں سب سے زیادہ مضامین خود سرسیّد کے قلم کی پیداوار ھیں ۔ ان کے بعد محسن‌الملک اور پھر چراغ علی کے مضمونوں کی تعداد ھے ۔ ان اصحاب قلم کے علاوہ اور بھی بہت سے مضمون‌نگار اس پرچے کے مستقل لکھنے والوں میں شمار کیے جاسکتے ھیں

تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کی فہرست مع تعداد مضامین یہ ہے :-

نام مضمون نگار	پہلی اشاعت یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ھ مطابق سنہ ۱۸۷۰ع تا رمضان سنہ ۱۲۹۳ھ	دوسری اشاعت سنہ ۱۲۹۶ھ دو سال پانچ ماہ	تیسری اشاعت یکم شوال سنہ ۱۳۲۴ھ تین سال سے زائد نہیں نکلا	مجموعی تعداد
سرسید	۱۱۲	۲۲	۵۰	۱۸۴
مہدی علی	۳۱	...	۱۱	۴۲
مشتاق حسین	۱۲	۲	...	۱۴
چراغ علی	۹	...	۱	۱۰
سید محمد محمود	۵	...	۱	۶
مرزا عابد علی (ہاتھرس)	۲	...	...	۲
عابد علی بیگ (داتا گنج)	۲	...	...	۲
محمد عنایت الرحمان (بنارس)	۲	...	...	۲
الطاف حسین حالی	۲	۹ = ۵ + ۴	۳	۱۴
		(نظم)		۱
محمد عبدالغفور	۱	...	...	۱
خدا داد	۱	...	...	۱
محمد یار خاں	۱	...	...	۱
محمد حکمت اللہ	۱	...	...	۱
نجف علی سہرامی	۱	...	...	۱
کریم بخش	۱	...	...	۱
عبیداللہ عبیدی	۱	...	...	۱
سید غلام حیدر	۱	...	...	۱
محمد یوسف	۱	...	...	۱
عبداللہ	۱	...	...	۱
منشی غلام محمود	۱	...	...	۱
فارقلیط اللہ	۱	...	...	۱
سید اقبال علی	۱	...	...	۱
سید محمد نصرت علی	۱	...	...	۱
عبدالرحمان خاں کلیانی	۱	...	...	۱
حافظ محمد حسین	۱	...	...	۱
محمد ہاشم	۱	...	...	۱

نام مضمون نگار	پہلی اشاعت	دوسری اشاعت	تیسری اشاعت	مجموعی تعداد
عنایت رسول	۱	...	۲	۳
محمد اکبر	۱ (عربی)	...	...	۱
منشی صفدر حسین	۱ (نظم)	...	...	۱
ذکاء اللہ	...	۱۳	۳	۱٦
محمد احسان اللہ	...	۷	...	۷
مہدی حسن منصف رائے بریلی	...	۷	...	۷
محمد ابوالحسن	...	۲	...	۲
محمد سمیع اللہ خاں	...	۱	...	۱
(ایک نیچری مسلمان)	...	۱	...	۱
نذیر احمد	...	...	۳	۳
عنایت اللہ	...	...	۴	۴
وحیدالدین پانی پتی	...	...	۴	۴
کرامت حسین	...	...	۲	۲
امام الدین (گجرات)	...	...	۱	۱
شیخ احمد علی حمیدالدین	...	...	۱ (عربی قصیدہ)	۱
حبیب اللہ خاں	...	...	۱	۱
عبدالحق	...	...	۱	۱
الاسدی الاعظمی	...	...	۱	۱
مولوی محمد سلیمان شاہ	...	...	۱	۱
سراج الدین احمد	...	...	۱	۱
سید احمد علی	...	...	۱	۱

فارسی کی ایک قلمی مثنوی

بقلم ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ۔ استاد دکن کالج، پونا۔

راقم کو پونا کی انجمن[1] تاریخ مرہٹہ کی ایک نمایشی الماری میں تصاویر متعلقہ جنگ تالیکوٹہ کے ساتھ ایک فارسی مثنوی دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو نایاب معلوم ہوتی ہے[2] کہ اس کا موضوع سلطان حسین شاہ (۹۶۱ تا ۹۷۲) والئی احمد نگر دکن) سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ مطبوعہ متن کے بیان سے خود بخود واضح ہوجائے گا مسودے کا نام کہیں نہیں ملتا البتہ اسی کے ابتدائی ورق کے باہر کسی نے کافی عرصے کے بعد بہ‌زمانہ محمدشاہ بہ‌طور یاد داشت اس کا نام کتاب تعریف حسن شاہ بادشاہ دکن » لکھ دیا ہے جو بہ‌ذات خود محتاج صحت ہے اور اسی کے نیچے "چہاردہ تصاویر و چہل و نہ‌ورق نوشتہ و چہار ورق خالی» بہ‌طور تفصیل کتاب جو عام طور پر محافظ کتاب خانہ لکھ دیا کرتے ہیں درج ہے اور ایک مدور مہر "محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۳۲ع اور ایک اور مربع مہر پورن چند ۱۲۵۰ع" پڑھی جاتی ہے۔ کتاب کی تقطیع ۸ و ۱۲ انچ ہے اور کاغذ نہایت عمدہ دبیز دولت آبادی معلوم ہوتا ہے چمڑے کی جلد فن جلد سازی کا نمونہ تھی مگر اب خراب ہوچکی ہے پھر بھی مطلاّ و مذہب کام کے جو نشانات باقی ہیں وہ اس امر کا کافی ثبوت ہیں، جلد کے خراب ہوجانے سے اوراق کتاب بھی پریشان حالت میں ہیں معلوم ہوتا ہے آخر کے دو ایک ورق گم ہوگئے تھے اور درمیان سے ایک جگہ "ترک" ٹوٹ گیا ہے غالباً ایک یا دو ورق بیچ سے بھی ضائع ہوئے تاہم نفس مضمون میں کوئی خاص خلل واقع نہیں ہوتا۔ ابتدائی صفحے کا سر لوح نہایت عمدہ مطلاّ و مذہب نقش و نگار سے مزین ہے جیسا کہ عام طور پر ایرانی مخطوطات ہوتے ہیں اور ہر صفحے پر عمدہ نستعلیق جلی قلم میں محض چار اشعار کو پھیلا کر مصرع بہ‌مصرع لکھا ہے۔ بعض اشعار اسی کاتب کے خفی قلم سے حواشی پر بھی درج ہیں جن کو یہاں ان کے اصل

---

۱. Bharat Itihas Sanshodhaka Mandal, Poona.

۲. راقم اس انجمن کے اہل‌کاروں کا ممنون ہے کہ انھوں نے اس کی نقل کرنے کی اجازت دی۔

مقام پر امتیاز کے لیے "بر حواشی" لکھ کر شامل کرلیا ھے اس مخطوطے کے اخیر میں بہ‌مطابق عنوان حسین نظام شاہ کی رحلت کے متعلق جو اشعار تھے وہ درج نہیں ھیں اور یہی وجہ ھے کہ اسی کے آخر میں روایتہ کاتب کا نام و تاریخ وغیرہ نہیں ملتے یعنے یہ مسودہ ناقص یہاں نقل ھوا ھے موجودہ کل اشعار کی تعداد ۳۴۰ ھے۔

فن کتابت کے اعتبار سے یہ نستعلیق دکنی مخطوطہ ذرا اھمیت رکھتا ھے تاریخی حیثیت سے سلطان حسین نظام شاہ کے زمانے تک دکن میں نستعلیق طرز خط کو بالخصوص احمد نگر میں دوسری سلطنتوں کی نسبت زیادہ فروغ حاصل ھوچکا تھا جو ایرانی نژاد اساتذہ کا مرھون‌منت ھوا بلکہ یہ قلم یہاں تک مقبول ھوا کہ دکنی شہزادے بھی اس کی مشق کر کے کمال پیدا کرتے تھے جیسا کہ بہ‌قول فرشتہ ابراھیم قطب شاہ (۹۵۷ع تا ۹۸۹ع) کا بڑا لڑکا عبدالقادر علاوہ کارھائے شجاعت کے خط نستعلیق خوب لکھتا تھا[۱]

پیش‌نظر مخطوطہ پیشتر ازیں ایک دو محققین کی نظر سے گزر چکا ھے جن میں سے پادری ھنری ھیرس ھیں جنھوں نے اپنی تالیف انگریزی بیجانگر کا اڑوی خاندان[۲] میں اسی مخطوطے کی تفصیل دی ھے اور اسی میں سے چار تصاویر جو جنگ تالیکوٹہ سے تعلق رکھتی ھیں، چھاپ دی ھیں جن کو ھم بھی مثنوی کے ساتھ یہاں شائع کر رھے ھیں مگر یہ مسودہ منظوم اپنے مصنف کے تخلص یا نام سے واضح نہ ھونے کی وجہ سے ابھی تک معما بنا رھا ھے یا اس نظر سے کسی نے اس کا مطالعہ ھی نہیں کیا اور یا وہ اشعار جن میں شاعر اپنا تخلص پیش کرتا ھے ان پر کسی کی نظر نہ پڑی چناں‌چہ اشعار شمارہ ۴۳، ۶۴، ۱۰۰ ملاحظہ ھوں جن میں شاعر کا تخلص "آفتابی" موجود ھے

فقیر آفتابی بہ درگاہ تو　　چو خاک سیہ گشتہ در راہ تو

دکن میں ایسے تذکرے کم ملتے ھیں جن میں ایسے فضلا یا شعرا کے حالات الگ پائے جائیں جنھوں نے یہاں کی علمی مجلس کو چارچاند لگائے۔ اگر

۱۔ فرشتہ مطبوعہ قدیم بمبئی صفحہ ۲۶۰

۲۔ The Aravidu Dynssty by the Rev. Henry Heras, Madras 1924—pp. xvii-xix.

بعض کا حال ملتا ہے تو زیادہ تر کتب تواریخ میں ضمناً ملتا ہے مثال کے طور پر فرشتہ نے بعض کو برسبیل تذکرہ بیان کردیا ہے ورنہ ان کے کلام سے خود استفادہ کرکے بھی ان کے صحیح حالات لکھنے پر توجہ نہیں کی یہی سلوک اس "آفتابی" شاعر کے ساتھ ہوا کہ اب اس کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا حالانکہ اسی کے کلام سے بعض نے ضرور استفادہ کیا ہے جیسا کہ ذیل میں واضح ہو جائے گا تاہم تذکرہ[1] 'صحف ابراہیم' میں دو شعرا کا ذکر ملتا ہے جن کا تخلص آفتابی تھا ایک تو "آفتابی ساوجی" اور دوسرا "آفتابی تونی" اول کا محض ایک شعر دیا گیا ہے اور دوسرے کے متعلق الفاظ ذیل تحریر کیے ہیں:

"آفتابی تونی (؟) در عہد اکبر بودہ، صاحب دیوان، اما بہ نظر راقم نہ رسیدہ از اوست

دیوار ستم[2] بر سر عاشق اگر افتد   بر دامن او گرد شکایت نہ نشیند

ہر کس کہ بہ دریوزۂ دیدار تو برخاست[3]   از پای طلب تا بہ عنایت نہ نشیند"

صاحب[4] 'کشف الظنون' نے ایک مسودے کا نام 'دیوان آفتابی' لکھا ہے جس کے ساتھ الفاظ "المرز یغونی الواعظ" آئے ہیں سلطان حسین شاہ احمد نگر اور اکبر معاصر ہیں ممکن ہے تذکرہ نگار نے اپنے تدوین تذکرہ کے وقت اکبر کو ہی شہنشاہ ہند سمجھ کر آفتابی کو اسی کے عہد میں شمار کرلیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ آفتابی شاعر سلطان حسین شاہ کے انتقال (۹۷۲) کے بعد دکن کو چھوڑ کر مغل شہنشاہ کے ملک میں آ گیا ہو لیکن اس وقت آفتابی کا جو کلام ہمیں ملا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلطان حسین شاہ کے ساتھ ہی وابستہ تھا اور وہ زمانہ مشہور جنگ تالیکوٹہ کا تھا جس کے فوراً بعد سلطان کا انتقال ہوگیا۔

جب ہم اسی مخطوطے پر ادبی حیثیت سے ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ شاعر آفتابی متقدمین شعرائے ایران و توران کے کلام سے

۱۔ راقم جناب خان صاحب پروفیسر مولوی محفوظ الحق ایم۔اے، پروفیسر پریزیڈنسی کالج کلکتہ کا ممنون ہے جنھوں نے از راہ نوازش یہ اطلاع "صحف ابراہیم" کے مخطوطہ کتب خانہ خدابخش، پٹنہ سے مہیا کرائی

۲۔ اصل نسخہ میں "ستیم" ہے۔

۳۔ اصل نسخہ میں "برخواست" ہے۔

۴۔ کشف الظنون صفحہ ۵۰۴

خوب واقف ہے اور جہاں اس کا ذہن رسا کام نہیں کرتا دوسروں کے اشعار کو بلا تامل اپنے متن میں درج کر لیتا ہے جن کو یہاں مطبوعہ متن میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے طرہ یہ کہ اس کے بعد کے مصنفین نے بھی اس کے اشعار کو اپنے یہاں اسی طرح بغیر نام لیے درج کر لیا ہے اس نے زیادہ تر مولانا جامی کی یوسف زلیخا اور بعض جگہ نظامی گنجوی سے اشعار لیے ہیں اگر مزید احتیاط سے دیکھا جائے تو شاہ نامہ اور دیگر متقدمین شعرا کے اشعار بھی ملیں گے۔ آفتابی کے اشعار کو صاحب 'برہان مآثر' اور 'فرشتہ' نے بھی نقل کیا ہے۔ بعض اشعار کو محض تھوڑے سے ردو بدل سے مطلب کے مطابق بنا کر درج کرلیا گیا ہے[۱]

فارسی ادب میں ابتدا سے ایسا ہوتا رہا ہے ہمارے محترم دوست علامہ حافظ محمود خاں شیرانی، سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے جو شکریے کے مستحق ہیں سب سے پہلے ہندستان میں اس خم کی تنقید کی طرف توجہ کرکے اپنے نتائج تحقیقات سے علمی طبقے پر احسان کیے جن سے یہ ہمیں باور آگیا ہے کہ فردوسی نے کوئی "یوسف زلیخا" تصنیف نہیں کی۔ فردوسی نے محمود غزنہ کی کوئی ہجو نہیں لکھی اور امیر خسرو نے کوئی "خالق باری" نہیں لکھی[۲] وغیرہ وغیرہ ممکن ہے کہ اس آفتابی شاعر کے کلام میں دیگر دکنی شعرا کا کلام بھی ہو جو ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہیں یا دیگر دکنی شعرا کے کلام میں آفتابی کا کلام موجود ہو۔

اس مسودے کا نام شروع میں "تعریف حسین شاہ" لکھا ہے لیکن اصل مسودے میں یہ نام کہیں مذکور نہیں البتہ یہ اس موضوع پر حاوی ضرور ہے اور اسی وجہ سے غالباً کسی نے بعد میں لکھ دیا ہے علاوہ ابتدائی حمد و مدح وغیرہ کے مثنوی میں محض دو اہم واقعات ملتے ہیں۔ ایک تو سلطان حسین شاہ کا نکاح جو اس نے سریرآرائے سلطنت ہونے کے بعد کیا مورخیں نے بالاتفاق دریا عماد شاہ کی لڑکی سے گوداوری کے کنارے ۹٦٦ھ میں اس کی سیاسی شادی کا ذکر کیا ہے اور اس لڑکی کا نام بی بی دولت شاہ بتایا ہے مگر اس نظم میں جو شادی کا ذکر ہے اس لڑکی کا نام ہمایوں شاہ بتایا ہے اور اس کے حسن کی تعریف آفتابی نے اس قدر کی ہے کہ اس شادی کو عشقیہ شادی کے مترادف

۱ - ایسے تمام اشعار کا بعض ضروری تصریحات و تصحیحات کے ساتھ ہم نے متن میں حوالہ دے دیا ہے۔
۲ - اس کے لیے « رسالہ سہ ماہی اردو » اور اورینٹل کالج میگزین لاہور کی ابتدائی جلدیں ملاحظہ ہوں۔

بنادیا ہے سلطان حسین شاہ کی وہ بیوی جن کے بطن سے اس کا جا نشین ابوالمظفر مرتضی نظام شاہ تھا اس عورت کا نام بھی خونزہ ہمایوں شاہ تھا اور وہ بہ قول فرشتہ[۱] میانجیو بن خواجگی کی لڑکی تھی جس نے نظام شاہ کے بعد عنان سلطنت کو قریب چھے سال بڑی لیاقت سے سنبھالے رکھا۔

دوسرا واقعہ جنگ تالیکوٹہ ہے۔ اسے شاعر نے محض شاعرانہ مدح کے پیرایے میں پیش کردیا ہے اس کے اور اشعار سے اس‌قدر پتا چلتا ہے کہ سلطان حسین‌شاہ نے بیجانگر کے رام‌راج پر چڑھائی کی اور فتح‌یاب ہوا حالاں‌کہ اس جنگ میں جو تاریخی اعتبار سے مشہور و معروف فیصلہ‌کن جنگ کہلاتی ہے تمام دکن کی اسلامی سلطنتیں شامل تھیں اور ان کی متفقہ کوشش سے یہ فتح نصیب ہوئی مگر آفتابی محض اپنے ممدوح شاہ‌حسین ہی کے سر تمام فتح کا سہرا باندھتا ہے اس واقعہ کو جنگ تالیکوٹہ اس لیے کہتے ہیں کہ جب تمام اسلامی سلطنتیں پیکار جنگ ہوکر روانہ ہوئیں جن میں عادل‌شاہی، نظام‌شاہی، قطب‌شاہی بریدشاہی تمام شامل تھے انھوں نے بیجاپور کے حوالی میں دریاے کشنا کے شمال میں قریب پچیس میل پر پڑاؤ کیا اور اس پڑاؤ کا نام تالیکوٹہ تھا جہاں سے یہ لوگ نقل و حرکت کرتے تھے ورنہ جہاں جنگ صحیح طور پرہوئی۔ اس مقام کا نام « انیگنڈی » لکھا ہے جو بیجانگر سے قریب بیس میل (دہ کوس) تھا جہاں سے مسلمان بعد فتح بیجانگر پر بڑھے اور پھر اپنے مرجع تالیکوٹہ پر واپس آگئے۔ آج بھی ان مقامات میں کنڑی لوگ پرانے گیت اس جنگ کے متعلق گاتے ہیں اور ان میں تالیکوٹہ کا ذکر آتا ہے۔ اس جنگ کی صحیح تاریخ میں کچھ اختلاف ہے حالاں کہ یہ متفق‌علیہ امر ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ بہ‌روز جمعہ دوم جمادی‌الاخر سنہ ۹۷۲ھ مسلمانوں کے حق میں ہوا اور اسی سال بہ‌روز شنبہ ہفتم ذی قعدہ سنہ ۹۷۲ھ کو سلطان حسین نظام‌شاہ کا اس دارفانی سے انتقال ہوا جس کی تاریخ « آفتاب دکن بشد پنہاں » بیان کی جاتی ہے جو اسی آفتابی شاعر کی طبیعت رسا کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

اس مخطوطے کی اصل اہمیت اس کی خالص دکنی تصاویر میں ہے جو اسلامی مصوری کے دبستان دکن کی بہترین مثال کہی جاسکتی ہیں اور جب ہم ان کو دوسرے

۱۔ فرشتہ بمبئی طباعت صفحہ ۲۵۶۔

دبستان مصوری کے موازنے میں لاتے ہیں تو یہ بالکل جدا حیثیت رکھتی ہیں بلکہ اپنی حیثیت سے یہ مزید قابل قدر نظر آتی ہیں کیوں کہ ابھی تک عوام و خواص مغل مصوری کا سکہ مانتے چلے آتے ہیں حالاں کہ ذرا غور سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ مصور مخطوطہ جو سنہ ۹۷۲ء میں یا اس کے بالکل بعد تیار ہوا جیسا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے مغل مصوری کے ایسے مخطوطوں پر اگر اولیت کا درجہ نہیں رکھتا تو اولیں نمونہ مغل مصوری کے معاصر ضرور ہے کیوں کہ مغل دربار میں سب سے اول دو مصور سید میرعلی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیرین قلم ہیں جن کو ہمایوں ایران سے ہمراہ لایا تھا اور وہ ابھی داستان امیر حمزہ کو مصور کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے جیسا کہ عطاءاللہ قزوینی صاحب نفائس المآثر سنہ ۹۷۸ء میں لکھتا[1] ہے کہ سات یا آٹھ سال سے مصور اسی کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے جس کی تکمیل کئی سال بعد جاکر ہوئی غرض کہ دکن میں اس سے پہلے مصور مخطوطے نمودار ہوچکے تھے افسوس اس امر کا ہے کہ جنگ تالیکوٹہ کی بعد دکن کو ازسرنو مغلی حملوں سے دو چار ہونا پڑا جس کی وجہ سے اس عہد کی تمام یادداشتیں مفقود ہیں تاہم خوش قسمتی سے ذیل کی تین مصور کتب ہمارے علم میں ہیں جو دکن کی نظام‌شاہیہ، عادل‌شاہیہ اور قطب‌شاہیہ درباروں کی ابتدا کی یادگاریں ہیں:

۱ - تعریف حسین‌شاہ سنہ ۹۷۲ء جسے یہاں شائع کیا جاتا ہے از سلطنت نظام‌شاہیہ۔

۲ - نجم العلوم[2] مکتوبہ سنہ ۹۷۸ھ جس کا ایک مصور مخطوطہ لندن میں مسٹر چیسٹر بیٹی کے مجموعے میں ہے یہ بیجاپور میں علی عادل‌شاہ کے عہد میں تیار ہوا اور راقم نے اس کو دیکھ کر اس سے خوب استفادہ بھی کیا ہے۔

۳ - «لیلی مجنون» جسے شاعر احمد نے بہ‌عہد محمد قلی قطب‌شاہ سنہ ۹۸۹ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ) تیار کیا اور اسی عہد کے مصور نے تصویریں بنائیں۔ پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی نے سنہ ۱۹۲۵ء میں اس پر ایک

۱ - اورینٹل کالج میگزین میں سنہ ۱۹۲۵ تا سنہ ۱۹۲۶ کانپور۔ملاحظہ ہو مضمون «قصہ امیر حمزہ مرقع تصاویر کی شکل میں» از خان‌بہادر مولوی محمد شفیع صاحب۔

۲ - روپم سنہ ۱۹۲۷ء - مضمون مسٹر لارنس بنین -

محققانہ مضمون لکھا[1] تھا غرض ان تین شواهد سے هم یہ نتیجہ استنباط کرسکتے هیں کہ دکنی «کتابی مصوری» مغل کے ساتھ ساتھ اپنے خاص دکنی انداز میں ایرانی روایات پر نمودار هوچکی تھی - اگرچہ دکن کو قدیم زمانے سے هی مصوری میں طرۂ امتیاز رہا جس سے هماری مراد اجنٹا - ایلورہ کی دیواری مصوری سے هے مگر یہ اسلامی کتابی مصوری اس سے بالکل الگ رویات رکھتی هے -

نجم العلوم اور تعریف حسین شاہ کی تصاویر کو جب هم پہلو بہ پہلو رکھتے هیں تو بالخصوص نسوانی یک رخی تصاویر پر ایک هی نظر ڈالنے سے معلوم هوجاتا هے کہ یا تو یہ ایک هی مخطوطے سے لےکر شائع کردی گئی هیں یا دونوں مخطوطوں کا ایک هی مصور[2] هے افسوس تیسری کتاب «لیلیٰ مجنون» جو اسی وقت پروفیسر سید عبدالقادر اسلامیہ کالج لاهور کے قبضے میں تھی جن سے عاریۃً لےکر پروفیسر شیرانی صاحب نے مضمون لکھا تھا اب کہیں مفقود هوچکی هے اور افسوس اس امر کا زیادہ هے کہ اس کی کسی تصویر کو بھی ضبط نہیں کیا جاسکا جس سے کچھ آج اندازہ هوسکتا -

اگر هم ان کی تصاویر کی جزوی تفصیل کی طرف توجہ کریں تو اول میں بیجانگر کی فوج دکھائی هے ان کا لباس سر اپنے مدّ مقابل مسلمانوں سے بالکل مختلف هے لمبے لمبے تربوش پہنے نظر آتے هیں ان کے مختلف رنگ هیں اور اوپر کونے میں راجا رامراج کو بھی چتر لگاکر متمیز کردیا هے اور نیچے کی صف میں مسلمان اور هندو سوار نیزہ زنی کرتے نظر آتے هیں پھر اس کے علاوہ مطلا و مذهب لٹکتی هوئی زینیں اور نہایت شاندار هاتھیوں کی جھولیں بھی فن مصوری کا کمال دیکھاتی هیں -

اس تصویر میں گھمسان کی جنگ دکھائی هے اور بعض مقتولین کو بھی زمین پر گرا هوا دکھایا هے ان کے گھوڑے خالی هیں اور هاتھیوں پر جھنڈے لہراتے نظر آتے هیں مختلف سرداروں اور سلاطین کے جھنڈے مختلف رنگوں کے هیں افسوس کہ همیں زیادہ علم نہیں ورنہ ان سے الگ الگ تمام دکنی سلاطین اور هندو راجا بہ آسانی متمیز هوسکتے تھے غرض کہ یہ تمام مناظر خوب رنگوں میں دکھائے هیں

---

۱ - اورینٹل کالج میگزین، لاهور - نومبر سنہ ۱۹۳۵ع -

۲ - A Survey of Painting in the Deccan by St. Krawrish. پلیٹ ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ملاحظہ هوں جو ان دونوں کتب سے هیں -

اور یہ دونوں تصاویر در اصل دو تصاویر کے نصف نصف حصے ھیں کیوں‌کہ یہ دو اشعار نمبر ۲۰۳ و نمبر ۳۰۲ کے دو مصرعوں کی تصاویر ھیں جو یہاں دی گئی ھیں اور دوسرے باقی مصرعوں کی تصاویر کو نہیں دیا گیا۔

تیسری اور چوتھی تصاویر جو مستقل طور پر ایک شعر کو مصور کرتی ھیں جنگ کا اخیر منظر اور فیصلہ واضح کرتی ھی انہیں مصور نے اپنے تخیل سے خود ادا کیا ھے اس خوں‌ریز جنگ میں ہزاروں جانیں ھر دو طرف سے تلف ھوگئیں تاریخ اس جنگ کو فیصلہ‌کن جنگ بڑے شدومد سے بیان کرتی ھے مگر اس امر کا کم علم ھے کہ اس جنگ کا فیصلہ‌کن لمحہ محض ایک ھاتھی بہ‌نام غلام‌علی کے عمل سے نصیب ھوا جس پر اس وقت رومی‌خاں سوار تھا۔ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ھوئیں اور گھمسان کا رن پڑا تو کوئی تمیز نہ رھی کہ فلاں ھاتھی یا گھوڑے پر کون سوار ھے۔ اس غلام‌علی ھاتھی نے جو بھی سامنے آیا اس کو دھکیل‌دیا چناں‌چہ جب رام‌راج کی سواری سامنے آئی تو ھاتھی نے اپنی سونڈ سے رام‌راج کو اٹھاکر[۱] رومی‌خاں کے حوالے کردیا جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ھے۔

رومی‌خاں رام‌راج کو سیدھا سلطان حسین‌شاہ کے سامنے لے گیا اور وہ قتل کردیا گیا۔ چناں‌چہ تیسری تصویر سے یہ واضح ھے کہ رومی‌خاں سلطان حسین‌شاہ کے سامنے اپنی بہادرانہ سرگزشت پیش کررھا ھے اور ادھر سلطان کے اشارے سے راجا کا خاتمہ کیا جا رھا ھے۔ چوتھی تصویر سے ھندو فوج کی پریشانی کی حالت عیاں ھے بلکہ ان کو لڑتے لڑتے بھاگتے بھی دکھایا ھے۔ غرض‌کہ اس فیصلہ‌کن جنگ کا تمام سہرا غلام‌علی ھاتھی اور اس کے سوار رومی‌خاں کے سر ھے جو ایک ترک نژاد بہادر تھا چوں‌کہ رام‌راج خود اس جنگ میں ختم ھوگیا تھا جو اکثر کم ھوتا ھے اور وھی بیجانگر کی طرف سے اس جنگ کا روح‌رواں تھا اس لیے اب اس کے بعد کوئی ایسا نہیں رھا کہ اس شدومد سے جنگ کو جاری رکھتا اس لیے جنگ اس کے قتل کے ساتھ ھی مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ھوگئی۔

اخیر میں اس اھم امر کی وضاحت بھی مناسب ھےکہ تمام تصاویر پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ھے کہ یہ اگرچہ اس‌قدر اعلیٰ فن مصوری کا نمونہ

۱۔ فرشتہ مطبوعہ بمبئی، صفحہ ۲۵۱-۲۵۲

ہیں کہ ان کو اُن تصاویر کے دوش بدوش رکھا جائے جن کو مغلی دربار میں میر سیدعلی تبریزی اور عبدالصمد جیسے ایرانی مصوروں نے تیار کیا تاہم اس امر سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ تصاویر ایرانی مصوری سے بھی از روے فن و روایات فن مستفید ہیں اور ان میں مقامی روایات کو بھی ضرور دخل ہے ۔ افسوس اس امر کا ہے کہ دکنی مصورین کے نام نہیں ملتے کسی قدر زمانۂ ما بعد کے دو مصور ملاّ فرّخ حسین۱ اور میرہاشم کا تذکرہ ملتا ہے ۔ اول الذکر کا بیان تو ظہوری نے اپنی نثر میں کیا ہے اور دوسرے کے دستخط بعض تصاویر پر ملتے ہیں بہر حال یہ دو اولیں مصور ہیں جو سنہ ۱۰۰۰ھ کے نواح میں تھے ۔ کچھ عرصہ ہوا مسٹر غلام یزدانی نے اسلامک کلچر۲ میں دو دکنی تصاویر پر ایک محققانہ مضمون لکھا تھا ان میں سے اول ابراہیم عادل‌شاہ ثانی سے تعلق رکھتی ہے جو ملاّ فرّخ‌حسین مصور کا زمانہ ہے ۔ ابراہیم عادل‌شاہ ثانی جگت‌گرو کے عہد میں بھی فنون و علوم کو خوب فروغ ہوا تھا جب کہ « نورس‌نامہ » « نعمت‌نامہ » وغیرہ وغیرہ جیسے مصور شہکار تیار ہوئے مگر افسوس یہ دور بھی زیادہ دیر نہ رہا بہرحال اس تھوڑے عرصے میں جو ہوا وہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہاں ایک الگ ماحول علوم و فنون کا پیدا ہوگیا تھا ۔

---

۱ . Deccan's Contribution to Indian Culture by M. Abdulla Chughtai, Islamic Culture, 1936.

۲ . اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۳۵ع ۔ صفحات ۲۱۱–۲۱۷ ۔

متن مثنوی آفتابی موسوم به تعریف حسین نظام شاه

بسم الله الرحمن الرحیم

خدای تراست
بر اقلیم جان بادشاهی تراست

تعالی الله ای از تو بود همه
و جود تو اصل وجود همه

بعصر ... نبرد
خرد ره بکنه کمالت نبرد

بهر سو ... بینم توئی جلوه گر
بهر جاکه شینم تومی در نظر

نبود ست قبل از و جود توکس
زبعد تو هم خود بباشیی و بس

بجز تو نیاید کسی در نظر
کسی جز تو خود کو که بیند بصر

نه خورشید و نی ذره گویم ترا
و لیکن ز هر ذره جویم ترا

۳ بهر چیز دارد خرد دست رس
دلیل خداوندئی تست و بس

نشانی ز پستی دارین نیست (؟)
تو پئی هست و هستی ده وغیر نیست

توئی کردگار زمین و زمان
۱ به پیشت عیان آشکار و نهان

توئی آفرینندۀ جان پاک
تو کردی پدید آدمی راز خاک

۴ جز این نیست آگه ز صنع تو کس
که هر هست از هستی تست و بس

اگر شد جهان روشن از آفتاب
چنو ... آفتاب از که شد نوریاب

گر از جاں برد حسن جانان شکیب
اورا دهد صورت دلفریب

بود حجتی بر کمالش سپهر
۱۵ ... مسجّل بتوقیع مهر

۵ بخود کار ساز غنی و فقیر
نه همیرش بود کارگر نه وزیر

بدو نیک پنهان و پیدا ازوست
غم ما ازو سشادئی مـ

نماینده هر صورت از پیش و پس
بود پرتو ذات بیچون و بس

درین پرده کس محرم راز نیست
در راز او بر کسی باز

۶ بیاسا قیاجام شکر و سپاس
۲۰ که سوی حقیقت بود ره شناس

بمن ده که از ناسپاسی رهم
قدم در ره حق شناسی نهم

بیامطرب افسون و افسانه چند
چنان نغمۀ معتدل کن بلند

افتند مستان حق در سجود
بسان صراحی ز آواز عود

در مناجات کو.

خدایا چو کردی جهان منزلم   بباران رحمت سرشتی گلم
چشاندی ز شهد شهادت مرا   ۲۵ نمودی طریق عبادت مرا
بکوی بتان رفتنم۱ جد مده   مرا خانه جز کنج مسجد مده
۸ مرا مائل قد خوبان مساز   که قد قامتم بس زبانک نماز
دلم را مده میل ابروی کس   ابروی من طاق محراب بس
بزلف بتان مبتلایم مکن   گرفتار دام بلائم مکن
مده آرزوی مے و ساغرم   ۳۰ به بر مستئے ابر و آن از سرم
۹ مدارم بپایپش کس بهر کام   بهر تو بس در نمازم قیام
سرم را بخدمت منه پش کس   که سجده ترا میتوان کرد و بس
چنان کن بیاد خودم همنفس   باید۲ بغیر توام یاد کس
چومن کس گنه گار و بیچاره نیست   پشیمانم اکنون ولی چاره نیست
۱۰ نه در سجده ام از پئے بندگی   ۳۵ که روبر زمینم ز شرمندگی
گیاهی که او را به تست اعتمید   زبارار مکن نا امید
گنه کارم و از تو امیدوار   هم جرم : هم آمرزگار
چو پرسی ز من کردهٔ ناصواب   در آموز پیش از سوالم جواب
۱۱ بشغلی کنے در جهان مایلم   ازوی رضایت شود حاصلم
نمائے ره شرع پیغمبرم   ۴۰ کنی پیرو ساقئے کوثرم
الٰهی بحق رسول امین   چراغ شبستان راه یقین
بحق شهے کاولیا را سرست   سراج او دوش پیغمبر ست
۱۲ دهی آفتابئی سرمنده را   زبار گناهار سر افگنده را
همتے کز همه چیز و کس   بزد کند با دو پیوندو بس
بیا ساقیا شرح حالم مپرس   ۴۵ ر ر ریائی ملالم مپرس
بمن ساغری ده که خرم شوم   بیک جرعه رسوائی عالم شوم

۱ « رفتنم »
۲ « ناید »

۱۳. در نعت نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم

کہـــر ریزای کلک سحر آزمـایے ز نعت محمد رســـول خـدای
سپہر وفا بحر احسان و علم جہان کرم کان انصاف و حلم
محمد کہ رشح بقا جام اوست جہان روشن از پرتو نام اوست
۱۴ رســـول عرب شاہ امی لقب ۵۰ دلیـــل عجـــم رہنمـای عرب
باکرام خـاص و بفضل عمیـــم شفاعت کنـد روز امیـد و بیـم
در انگشت او خاتم سروری قـوی پشتش از مہـر پیغمــبری
جمالش ز نور جہان آفرین ہزار آفرین بر جمالے چنیں
۱۵ مسیحا گر از آسمـان در گزشت محمد ز کون و مکا برگزشـ
اگر یافت مـوسیٰ تجلی و طور ۵۵ شد از خلقش آسمـ کوہ نور
ز معراج او تا بمعراج ا تفاوت بود ز آسمان تا
وزانش نشد لوح مکتب پسند از لوح محفوظ شد بہرہ مند
۱۶ نبـــود احتیـاجش بتعلیم کس آموزکارش خدا بود و بس
نبودش ازان سایہ کرنور بود از و ظلمت آب و گل دور بود
نبودش پئی سایہ برسر سحاب ۶۰ کہ خورشید بود از رخش در حجاب
بفضل از ـہ انبیـا پش بود اگرچہ پس آمــــد ولی پش بود
۱۷ بیـا ساقیا زا شـــراب طہور کہ خجلت برد زو لب لعل حور
بمرـ دہ ہ کردد ز فرخندگی فراموشم از چشمۂ زنـــدگی

در منقبت امیر گوید

بیـا آفتـابی قلــم ساز کن در کنج اندیشہ را باز کن
۱۸ قلم را چنان در سخن کن علم ۶۵ کہ احسنت خیزد ز لوح و قلم
جہان پرکن از کوہر شاہوار بمـــدح علـی شاہ دلدل ســـوار
خلیلی کہ نار ازل نور اوست کلیمی کہ کتف نبی طور اوست
امـــیر عرب شہـــریا وصئی نبی شاہ مولـد حـــرم
۱۹ ازان کعبہ شد قبلہ گاہ جود کہ آنجا علی آمد اندر وجود
زناف زمین نافۂ شـــ یدید ۷۰ کہ عطرش باطراف عالم رسید

باو داده بیچون ز روز الست　　　بغیر از نبوت دگر هرچه هست
دلش[1] پر راز الهام رب‌الجلیل　　　چه غم گر نیاید باو جبرئیل
ملک[2] را شد آدم ازان قبله گاه
که تابنده بود از رخش نور شاه

۲۰ چه باک اربشد[3] پای او عرش سای　　　همین بس که دوش نبی کرد جای
مسیح ار برامد بچرخ بلند　　　۷۵ علی شد ز کتف نبی بهره مند
علی شهر علم نبی را درست　　　ز خاک درش عرش را افسرست
اگر مشکلے گرددت منجلے　　　زیاد علے دان و نـاد علی
سر اولیا شاه مردان علیست
وصئ نبی شیر یزدان علیست

۲۱ بود نامهٔ فتح در مشت او　　　کلید در خیبر انگشت او
سر ذوالفقارش که خون باربود　　　۸۰ چو لا از پئے نفی کفّار بود
نجف چون حرم کعبهٔ عالم است　　　درش قبله گاه بنی آدم است
فروغے که خورشید انور گرفت　　　ز رخسار آل پیمبر گرفت
۲۲ چمن را کمال از جمال علیست　　　جمال گل از رنگ آل علیست
بدهر آنچه هست از خفی و جلی　　　طفیل علے دان و آل علی
الٰهی بشاهے که دین پرورست　　　۸۵ که سردار دینست و دین را سرست
بحق حسن رهنمای زمن　　　دلیل خلائق بوجه حسن
۲۳ به خون حسین آن اسیر بلا　　　گل گلشن روضهٔ کربلا
بزین العباد گرامی صفات　　　که شد نوح کشتئ بحرنجات
به پاکئ باقر امام انام　　　بحق محمد علیه‌السّلام
بصدق و صفای که باصادقست　　　۹۰ که بر نور صبح صفا سابقست
۲۴ بموسئ کاظم امام سلیم　　　که بود از تجلئ حق چون کلیم
بحق رضا کعبهٔ مشتمین　　　درش قبلهٔ آسمان و زمین

---

۱ « دلش پرز الهام رب‌جلیل »
۲ شعر نمبر ۷۳ حاشیے پر ہے۔
۳ « نشد »

بحق نقی سرور اتقیا | طفیل رهش طارم کبریا
بمهدی هادی که بر راه اوست | اگر چشم دشمن وگر چشم دوست

بحق[1] نقی قدوة المتقین
امام بحق قطب دنیا و دین ۹۵

بحق حسن رهنمای بشر
امام زمان عقد حادی عشر

۲۵ کزین هشت و چار اختر برج دین | منازل شناسان راه یقین
بساز آنچنان کار دینا مرا | که حاصل شود قرب عقبیٰ مرا
و از اعدای ایشان مرا دور دار | مرا از محبان ایشان شمار
فقیر آفتابی بدرگاه تو | ۱۰۰ چو خاک سیه گشته در راه تو
۲۶ زبارگنه پشت او خم شده | رخش زرد و تن لاغر از غم شده
گنه کرده چون بی حد و بی شمار | نه بیند کسی را چو خود شرمسار
دلش پر ز خون شد جگر پر ز و بیم | چه از شرم عصیان چه از ترس و بیم
بلطف[2] تو چون هست امیدوار | چنین خوار بدحال و ابتر مدار
ترحم نما بر گدای کمین | ۱۰۵ چو بی شک توئی ارحم الراحمین
گیاهی[3] که آنرا به تست اعتمید | زباران رحمت مکن نا امید

۲۷ در سلطنت کردن حسین شاه المخاطب به نظام شاه گوید

بدین نامه من دست بردم فراز | بنام شهنشاه گردن فراز
چه شاهی که شاهان روی زمین | بدارائی او کنند آفرین
بده پادشاه تمام دکن | دلیر و جوان بود و شمشیرزن
۲۸ حسین شاه بد نام آن بادشاه | ۱۱۰ نظام جهان بود و عالم پناه
زمین زنده دار آسمان زنده کن | جهانگیر دشمن پراگنده کن
خداوند تاج و خداوند تخت | جهاندار و فیروز بیدار بخت

---

۱ اشعار نمبر ۹۵ و ۹۶ حاشیے پر ہیں۔
۲ اشعار نمبر ۱۰۴ و ۱۰۵ حاشیے پر ہیں۔
۳ یہ شعر دوبارہ آیا ہے،

جهان آفرین تا جهان آفرید | چــو او پادشاهی نیامــد پدید
نظام‌شاه[1] بـوده خطاب از قدیم | نشد مثــل او پادشـاه حلیم
۲۹ خداونـــد شمشیر و تخت و کلاه | ۱۱۵ چو تابنده خورشید با عزجاه
سکندر شکوهی که در جله ساز | شکوه سکندر بـــد و گشت باز
ز ســر حدّ چین و خطا و ختن | بـود زیــر حکمش تمام دکن
جهانــدار بافــر جمشید بـــود | بکردار تـابنـده خـورشید بـود

۳۰ (تصویر) مجلس

۳۱ خرامنده سروی رطب بار او | شکــر چاشنی کـــبر گفتار او
قدش معتدل زلف و گردن دراز | ۱۲۰ لبی چون شکر خال بروی تراز
فریبنده چشمش جفاجـــو و تیز | دوا بخش بیمار و بیمار خیـز
بهـــر شور کزلب بر انگیختی | نمک بـر دل شه همی ریختی
۳۲ جهان بانو اش خواند پیوسته شاه | بدو داشت آئین حشمت نگاه
کلیـد در گنجهائی که داشت | بدو داد و تاجش ز گردون گزاشت
یکی ساعت از دیدن روی او | ۱۲۵ شکیبانشد تانشـــد ســوی او
جهان‌را بـــه پـــیرایهای نـوی | بر آراست از خلعت خسروی
۳۳ بشـادی دران کشـــور[2] بهشت | بیاسود با آن بهشتی ســرشت

تصویر

۳۴ حسین شاه[3] آن آفتاب بلند | همه عالم از نور او بهره مند

---

۱ یہ شعر نمبر ۱۱۴ حاشیے پر ہے۔
۲ « کشوری چون بهشت »
۳ سیدعلی طبا طبا مولف تاریخ « برهان مآثر » عراق سے دکن میں محمدقلی قطب‌شاہ کے زمانے میں آیا اور اس کے ہمراہ قلعہ تلارگ کے محاصرے میں موجود تھا (برہان صفحہ ۵۳۴-۵) یعنی یہ واقعہ سنہ ۹۹۱ء کا ہے اور اس سے قریب بیس سال قبل سلطان حسن نظام‌شاہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ مگر وہ جہاں صفحہ ۳۶۶-۷ پر سلطان حسین نظام‌شاہ کا ذکر کرتا ہے وہاں بہت سے اشعار کو مع شعر نمبر ۲۸ کو زرا بدل کر درج کرتا ہے ان ہی سے ذیل کے اشعار ضرور قابل ملاحظہ ہیں:

شهنشه سخا را سرآغاز کرد | در گنج و دینار را باز کرد
جهان را بہ پیرایہای نوی | بیارا است از خلعت خسروی

(باقی اگلے صفحے پر)

بیا ساقی امشب چراغ مغان بیاور بمن ده میاور فغان
چراغی کزو چشمها روشنست ۱۳۰ چراغ تنم را ازو روغنست

در حسن و شمایل و جمال باکمال همایون شاه گوید

۳۵ همایون[1] پیکری از عالم نور بباغ خلد کرده غارت حور
قدش نخلی ز رحمت آفریده ز بستان لطافت آب خورده
کشیده قامتی چون سرو آزاد بآزادی غلامش سرو آزاد
ز جوی خوبروئی آب خورده ز سرو جویبار[1] آب برده
۳۶ رخش ماهی ز اوج برج فردوس ۱۳۵ ز ابرو کرده آن مهخانه در قوس
مکحل[2] نرگسش از سرمهٔ ناز ز مژگان برجگرها ناوک انداز
دو لعلش در تبسّم در شکر ریز دهانش در تکلم شکّرامیز
بر اوج نیکوئی تابنده ماهی بملک دلبری فرخنده شاهی
۳۷ ندیده باهزاران دیده افلاک چو او نقشی بصورتخانهٔ خاک
ز اوج ماه برتر پایه او ۱۴۰ ندیده دیدهٔ خور سایهٔ او
نگنجد در بیان وصف جمالش کنم طبع از مایی با خیالش
چه گویم وصف حسن و دلبری را که نبود لطف او حور و پری را
۳۸ بآزردن کس نیاورد رای برون از خط عدل ننهاد پای
کسی را که دولت کند یاوری که یارد که با او کند داوری

(بقیہ گزشتہ صفحہ)

همانا که بود آفتاب بلند همه عالم از نوروی بهره مند
بلند آفتابی که شد فیض بخش بدادن نگردد تهی چون درخش

آخیر شعر میں ضرور «آفتابی» تخلص وارد ہوتا ہے جسے علی طبا طبائی نے درج کردیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام عام تھا مگر انھی متاخر فضلا کے ہاتھوں ضائع ہوگیا۔

اشعار نمبر ۱۳۱ و نمبر ۱۳۳ «یوسف زلیخا» مولانا جامی سے ہیں جہاں «جمال یوسفی» کا ذکر آیا ہے۔ ان اوراق میں «یوسف اور زلیخا» کی وہ اشاعت بہ‌طور حوالہ استعمال کی گئی ہے جو لاہور میں سنہ ۱۹۳۶ میں ملک دین محمد اینڈ سنز نے کی چنانچہ صفحہ ۳۸ ملاحظہ ہو۔

۱ «جوئیباری»
۲ اشعار نمبر ۱۳۶ و ۱۳۷ «یوسف زلیخا» سے صفحہ ۳۸ ہیں۔
۳ شعر نمبر ۱۳۷ حاشیے پر ہے۔

بچشمش بسے خوار بد سیم و زر   ۱۴۵   بزرگی بدو یافته زیب و فر
گر انعام او بر شمارد کسے   بدان تا کند شکر نعمت بسے
سراسر جهان پیش او خوار بود   جوانمرد بود و وفادار بود
۳۹ ز شکروی آن نعمت افزون بود   ولی نعمتی پش ازین چون بود
زهے بارگاهے که چون آفتاب   ز مشرق بمغرب رساند طناب
رسد شرق تا غرب از احسان او   ۱۵۰   بهر خانهٔ نعمت خوان او

داماد شدن حسین‌شاه همایون‌شاه را بنکاح خود در آوردن

۴۰ چه فرخ کسی کو بهنگام دے   بهدپیش خود ساغر و جام مے
بت نار پستان بدست آورد   که در ناربستان شکست آورد
بگیرد سر زلف آن دلستان   ز خانه خرامد سوی گلستان
دران عصر بوده یکی کد خدا   ورا بوده یک دختر دلربا
۴۱ بنده نام آن دختر ماه روی   ۱۵۵   همایونشه و بوده بس نیکخوی
دلشاه حسین از پئی آن عروس   شورش در افتاد چون رنگ روش (؟)
بدستور شیرین زبان گفت خیز   زبان و قدم هر دو بکشای تیز
یکی مهد زرین پر از لعل و در   سرا پاش از لعل و فیروزه پر
چه دختر که بوده به از اختری   بعالم نبوده چو او دختری
چه دختر که تابنده خورشید و ماه   ۱۶۰   همه نازنینان ورا خاک راه
بخوبی[1] چگویم پری پیکری   پری را نباشد چنین دختری
قدش همچو شاخ گل تازه بود   در و نازکیے پش ز اندازه بود
رخش همچو ماه ابروش چون هلال   که جا کرده بر قامت چو نهال
دو زلف سیه بهتر از مشک ناب   ز رشک رخش زرد شد آفتاب
لبش همچو حب نبات و زبان   ۱۶۵   چو برگ گل اندر دهان بدنهان
برون[1] مانده بوده پستان او   ازان بود بی نار بستان او
ازان خوبتر بوده کاندازه گیر   صفتهای اوراکند دلپذیر

---

۱ شعر نمبر ۱۶۶ حاشیہ پر ہے۔

چکسو[1] ز گفتار و رفتار او — که حیران بوده[2] عقل درکار او
۴۲ بسبر تانشیند درد نازنین — خرامان شود مه بروی زمین
دگر باد پایان بازین زر — ۱۷۰ ز بهر پرسشد کالنس بسبر (؟)
چو دستور دانا چنین دیداری[3] — کمر بست و آورد فرمان بجای
ز بعد روان کردن آن وزیر — بفرمود آرایش دلپذیر
۴۳ یکی مجلس اراست همچون بهشت — بغیر از خوشے هرچه بود آن بهشت

تصویر

۴۴ در هفت گنجینه را باز کرد — برسم شهان خلعتی ساز کرد
لباس گران مایهٔ خسروی — ۱۷۵ که دل را نوا داد و تن رانوی
ز بهر همایون شهٔ نیکبخت — مرتب نمود افسر و تاج و تخت
بفرمود تا کار داران دهر — در آرایش آرند باز ارد شهر
۴۵ علمها بگردون برافراشتند — جهان را نوآرا یشے ساختند
همه بوم و کشور ز شادی بجوش — مغنّی بر آورده هر سو خروش
ببخشید چندان دران روز گنج — ۱۸۰ که آمد زمین از کشیدن برنج
ببستند آئین بازار شهر — بدان سان که هرگز ندیدست دهر
۴۶ پری چهرهٔ . دیده کز دلبری — پرستنده شد پیکرش را پری
رخ شه برافروخت از خرمی — که جفت وی آمد چنان آدمی
که خوش شکل و باشرم وابسته بود — زنا گفتنیها زبان بسته بود
دران بیعت از بهر تمکین او — ۱۸۵ بملک دگر بست کابین او
۴۷ زبهر شهٔ آن ماه مشکین کمند — زچشم و دهان ساخت بادام و قند
بشد تازه از دیدنش جان او — زفردوس روشنتر ایوان او
بچشم وفا غمگسار آمدش — دلش برد چون در کنار آمدش
بکام دلش تنگ در بر گرفت — وزان کام دل کام دل برگرفت

---
۱ « چگویم » ۲ « بود » ۳ « دیدرای »

تصویر ۔ (صورت)

۴۹ جز آئینه کسے کم دیده رویش
نباشد غیر زلفش را میّسر
بفرقش[1] موی دام هوشمنداں
فرو آویخته گیسو سمن سا
۵۰ زطرف لوح سیمینش نموده
بزیر آں[1] دونون طرفه دو صادش
زحد نون اوتا حلقهٔ میم
فزوده بر الف صفر دهانرا
۵۱ شده سینش عیاں از لعل خنداں
برو هر جانب از خالی نشانی
زنخدانش که سیم بی زکاتست
بیاض گردنش صافی تر از عاج
۵۲ دو پستان هر یکی چوں قبّهٔ نور
دو نار تازه رسته ازیکی شاخ
زبازو گنج[2] سیمش در بغل بود
شکم چوں تختهٔ قاقم کشیده
۵۳ میانش موی بل کز موے نیمے
نیارستے که راز موی بستن
سرینش کوهی اما سیم ساده
بدان نرمے که گر افشردیش مشت
۵۴ سخن رانم زساق او که چونست
درو لعلش که بود آویزه گوش
اگر بگسستش گوهر ز گردن
مرصع موی بندش کز قفا بود
۵۵ نیارم پیش ازین از زر خبرداد

۱۹۰ بجز دایه کسے نکشوده مویش
که گاهی افگنند درپای اوسر
ازو تا مشک فرق اماچنداں
فگنده شاخ گل را سایه درپا
دونون سرنگون از مشک سوده
۱۹۵ نوشته کلک صنع اوستادش
الف واری کشیده بینی از سیم
یکی ده کرده آشوب جهانرا
کشاده میم را عقده بدنداں
چوزنگی بچکاں در گلستانی
۲۰۰ درو چاهی پر از آب حیاتست
بگردن اورندش اهوان باج
حبابی خاسته از عین کافور
کف امید شاں نفشرده گستاخ
عیار سیم در پششش دغل بود
۲۰۵ بنرمے دایه ناف او بریده
زباریکے برواز موی بیمے
گزاں مو بودیش بیم گسستن
چو کوهے کز کمر زیر اوفتاده
بروں رفتی خمیر آئیں زانگشت
۲۱۰ بنای حسن را سیمیں ستونست
همی برداز دل و جان لطف آن هوش
شدی گنج جوهر جیب و دامن
هزاران عقد گوهر را بها بود
که شد خلخال واندر پایش افتاد

در مجلس آراستن حسین شاہ و از سر نو عاشق شدن بہ حسن ہمایون شاہ

حسین شاہ مجلس بزمے بیا راست ۲۱۵ دران مجلس شراب ناب را خواست
چہ بزمے بزمگاہ خسروانہ ہزارش ناز و نعمت درمیانہ
۵۶ زشربتہای رنگا رنگ صافی چو نور از عکس در ظلمت شکافی
ستادہ صف بصف خوبان دلجو بترتیب خوش و دستور نیکو
حسین شاہ چون دران مجمع نظر کرد ز ہر جمعے تماشای دگر کرد
بچشم[1] آمد ہمایون چو یکے ماہ ۲۲۰ چہ مہ خورشید اوج عزت و جاہ
۵۷ اگر[2] عاشق رویش ہمی بود دو صد چندان بدل مہرش بیفزود
جمالے[3] دیدار از حد بشر دور ندیدہ از پری نشنیدہ از حور
چو شمع انجمن زاں جمع ممتاز میان شان ہمچو شمع آمد سر افراز
ملاحت داشت پش از حد ادراک چو جان زالودگئی آب و گل پاک
۵۸ بہ گیتی مثل او نا دیدہ ہرگز ۲۲۵ نہ کس مانند او نشنیدہ ہرگز
جمال[4] نیکوان درپیش او کم چنان کز پرتو خورشید انجم
کمال حسنش از اندازہ بیرون زحد فکرت و اندیشہ بیرون
ہمایونشاہ را نزدیک خود خواند گرفتہ دست او بر تخت بنشاند

۵۹

تصویر

زحسن صورت و لطف شمایل اسیرش شد بیکدل نے بصد دل
۶ زرویش آتشے در سینہ افروخت ۲۳۰ وزان آتش متاع صبروی سوخت
وزان عنبر فشان گیسو دلبند بہر مورشتۂ جان کرد پیوند
کھے بانرگسش ہمراز گشتی گہے باغیچہ اش دمساز گشتی
بہ روزان و شبان این بود کارش نبود از دیدنش یکدم قرارش

۱ شعر ۲۲۰ «یوسف زلیخا» سے ہے مگر اس مین لفظ «ہمایون» بجائے «یوسف» کے ہے ۳۸
۲ «اگرچہ»
۳ «دید از حد»
۴ اشعار ۲۲۶ و ۲۲۷ «یوسف زلیخا» سے ہیں مگر دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں کچھ فرق ہے ۲۸
۵ شعر ۲۳۹ «یوسف زلیخا» سے ہے ۳۲

۶۱ غمش خوردی و غمخواریش کردی 		بجا تونی پرستاریش کردی
بهر شب خفته چون جان در برش بود 		۲۳۵ بهر روز آفتاب منظرش بود
بان وقت آن پری کاندر نظر بود 		اگر صد حور در پیش نظر بود
بسوی دیگران هرگز نمی دید 		گل از باغ جمال کس نمی چید
۶۲ چنان میخواست کان ماه دلفروز 		به پیش چشم اوباشد شب و روز

تصویر

۶۳ بلی هر جا کزان سان مه بتابد 		اگر خورشید باشد ره نیابد
بلی عاشق همیشه جان فروشد 		۲۴۰ بجان در خدمت معشوق کوشد
بمثر کان ازره اوخار چیند 		بچشم از پای او آزار چیند
بجان و دل نشیند حاضر او 		بود کافتد قبول خاطر او

۶۴ در تعریف سخن و عشق و عاشقی گوید

سخن[1] دیباچهٔ دیوان عشق است 		سخن نوباوهٔ بستان عشق است
خرد را کاروباری چون سخن نیست 		جهان را یادگاری چون سخن نست
سخن از عاشقی و عشق باید 		۲۴۵ که تا در گوش اهل دل خوش آید
۶۵ دل[2] فارغ ز درد عشق دل نیست 		تن بی درد دل جز آب و گل نیست
• خوش آن دل کاندر[3] منزل کند عشق 		ز کار عالمش غافل کند عشق
درو رخشنده برقی برفروزد 		که صبر و هوش را خرمن نسوزد[4]
نماند دروی امید سلامت 		شود کاهی برو کوه ملامت
۶۶ ز عالم روی آور در غم عشق 		۲۵۰ که باشد عالم خوش عالم عشق
غم عشق از دل ما کم مبادا 		دل بی عشق در عالم مبادا
فلک سرگشته از سودای عشقست 		زمین پرفتنه از غوغای عشقست
اسیر عشق شو کازاد باشی 		غمش برسینه نه تا شاد باشی
۶۷ جمال اوست هرجا جلوه کرده 		ز معشوقان عالم بسته پرده

۱ یہ شعر نمبر ۲۴۳ یوسف زلیخا، سے جہاں مولانا جامی نے " سبب نظم کتاب " سے آغاز کیا ہے صفحہ ۲۵۔

۲ " دلی " 		۳ " کاندران " 		۴ " بسوزد "

بهر پرده که بینی پردگی اوست ۲۵۵ قضا جنبان هر دل بردگی اوست
بعشق اوست دلرا زندگانی بعشق اوست جان را کامرانی
دلی کو عاشق خوبان دلجوست اگر داند دگر[1] نه عاشق اوست

۶۸ لشکر آراستن حسین‌شاه بعزم غزای کافر و روان شدن بجانب بیجانگر

حسین‌شاه آن بادشاه دلیر که پشش بود همچو روباه شیر
سر سرفرازان و گردن کشان که بروی کنند آفرین انس و جان
خداوند[2] شمشیر و تخت و کلاه ۲۶۰ چو تابنده خورشید با عزّ جاه
۶۹ بآن حشمت و جاه و فرزانگی بان هست و زور و مردانگی
نبود و نیامد کسی در جهان جهاندار و فیروز با عزّ و شان
چنان داشت شمشیر و بازوی زور کزو در جهان بود غوغا و شور
بدل غیر ازین آرزوی نداشت جز این میل خاطر بسوئی نداشت
۷۰ که با کافر راو بیجانگر ۲۶۵ کند جنگ و کوته کند شور و شر
که از دست آن کافر نابکار مسلمان بسی کشته بودند زار
همی خواست دائم ز لطف خدا که اورا میسر شود این غزا
روان گشت القصّه از بهر جنگ سوی ملک بیجانگر درنگ[3]

۷۱ تصویر

۷۲ بسیار است لشکر بعزم نبرد بدان سان که کس جمع لشکر نکرد

جنگ کردن حسین‌شاه با رام‌راج که بادشاه بیجانگر بود و فتح کردن

سحر[4] گاه چون مرغ بکشاد بال ۲۷۰ تهی شد دماغ سپهر از خیال
بغول سیه بانگ برزد خروس در امد بغریدن آواز کوس

۱ یہاں سے یہ مخطوط کچھ ناقص معلوم ہوتا ہے کیوں‌کہ اس شعر کے بعد آخیر صفحے پر اگلے صفحے کے لیے جو ترک ہے وہ لفظ «داستان» ہے۔

۲ یہ شعر برہان مآثر صفحہ ۳۵۳ میں اس طرح آیا ہے:
خداوند خورشید و گردیده ماه فروزنده تاج و تخت و کلاه

۳ «بی درنگ» بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۴ شعر ۲۷۰ کچھ مختلف بحر نظر آتا ہے۔

۷۳ چو شد روز آورد گردون شتاب برون ازد[1] سر از کنج کوه آفتاب
بغرّید کوس از در شهریار جهان شد پریشان ز گرد سوار
بفرمود تا فوجها ساختند سواران ز لشکر[2] برون تاختند
همی رفت لشکر گروها گروه ۲۷۵ چو دریا بجوشید هامون و کوه
حسین شاه[3] برون از بارگاه برآراست بر حرب کافر سپاه
چنان تیره شد روز روشن ز گرد تو گفتی که خوشید شد لاجورد
۷۴ دلیران لشکر چو شبرژیان همه بسته بر جنگ کافر میان
ز اسپان تازی و فیلان مست سیه گشت صحرا و هامون و دشت
ز لشکر بداں ساں برآمد غریو ۲۸۰ که کرگشت ازان گوش هر نره دیو
ز نعره برآوردن گاو دم شد از آسمان زهرهٔ گاو کم
همه[4] نامداران و زور آوران برفتند باگرزهای گران
غریو دو لشکر گذشت از فلک بدان ساں که کرگشت گوش ملک
چو کافر خبر یافت کامد سپاه جهان گشت برچشم کافر سیاه
یکی[5] لشکر انگیخت از تیر و تیغ ۲۸۵ فروزنده برقش برامد به میغ
ز نعل ستوران پولاد میخ بجنبش در آمد زمین هم ز بیخ
ز بس[6] نعره کامد برون از کمین فرو اوفتاد آسمان بر زمین
بده ۰ راو بیجانگر رامراج مکر[7] برمیان بست و پوشید تاج
ز شوریدن بانگ چون رستخیز بوحش بیابان برامد گریز
چو بر جنگ شد ساخته ساز شان ۲۹۰ گریزان شده دیو از آواز شان

۱ «زد» زیادہ معلوم ہوتا ہے۔
۲ کاتب نے خود حاشیے پر « ن » لکھکر « ہرسو » لکھا ہے۔
۳ اشعار ۲۷۵ و ۲۷۶ حاشیے پر تھے۔
۴ اشعار ۲۸۲ و ۲۸۳ حاشیے پر تھے۔
۵ برہان ماثر صفحہ ۵۸۷ پر یہ شعر یوں درج ہے:—
یکی لشکر آراست کز ترک و تیغ فروزنده گردش بر آمد بمیغ
علی طبا طبا نے اسے عادل‌شاہ کے محاربہ جمال خاں کے ضمن میں درج کیا ہے۔
۶ یہ شعر نظامی گنجوی کے خمسه سے لیا گیا ہے۔
۷ « مکر » اور یہ شعر صفحہ ۲۸۸ حاشیے پر تھا۔

دوابر از[1] دوسو در خروش آمدند — دو دریای آتش بجوش آمدند
چنان آمد از هر دو لشکر غریو — کزان هول دیوانه شد مغز دیو
۷۷-۸ چو[2] لشکر بلشکر در آورد روئے • — مبارز برون آمد از هر دو سوئے

(دونوں صفحات مزین از تصاویر جنگ)

۷۹ در آمد به غرّیدن ابر سیاه — ز ماهی تف[3] تیغ برشد بماه
ز پویه که پی بر زمین مے فشرد — ۲۹۵ در اندام گاو استخوان گشت خرد
روا[4] رو زبان تیر فولاد پای — در اندام شیران فولاد خای
ترنگ کمانهای بازو شکن — بسی خلق را برده از خویشتن
۸۰ صف ژنده پیلان هیجا شکوه — میان سپاه آمده کوه کوه
مژه چون سنان چشمها چون عقیق — ز خرطوم تا دم در آهن غریق
ز بس ژنده پیلاں بصف اندرون — ۳۰۰ شد از پای پیلان زمین نیلگون
غریو دو لشکر گذشت از فلک — بدان سان که کر گشت گوش ملک
۸۱ چو لشکر[5] بلشکر در امیختند — (یہاں سے مقابل کا صفحہ گم ہے)

تصویر

۸۲ ولی کشتهٔ کافران بیشتر — دل کفر از اسلام دل ریش تر
حسین شاه آن بادشاه جهان — کزو در حذر بوده شیر ژیان

---

۱ فرشتہ نے صفحہ ۲۲۸ پر شعر نمبر ۲۹۱ کو یوں برہان نظام‌شاہ کے تحت درج کیا ہے:

۲

دوا بر از دو سو در خروش آمدند — دو دریای آتش بجوش آمدند

اور غور سے دیکھا جائے تو یہ نظامی گنجوی کی مثنویات سے ہے۔

۲ برہان مآثر صفحہ ۴۰۶ پر یہی جنگ تالیکوٹہ کے بیان کے تحت یوں آیا ہے:

چو لشکر بلشکر در آورد روی — دو دریای آتش نمود ار دو سوی

برہان مآثر کے دوسرے مصرے سے واضح ہے کہ یہ وہی ہے جو یہاں شعر نمبر ۲۹۱ میں ہے اور وہی فرشتہ میں ہے اور اسی شعر کو اہم سمجھ کر مصور نے مصور کیا ہے۔

۳ « تب »

۴ شعر نمبر ۲۹۶ نظامی گنجوی کا معلوم ہوتا ہے۔

۵ یہاں پر مقابل کا صفحہ گم ہے اور اسی پر تصویر تھی مگر ترک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرعہ لفظ « قیامت » سے شروع ہوتا تھا۔ غور سے معلوم ہوگا کہ یہ شعر نظامی گنجوی کا « سکندر نامہ » سے ہے۔

۱ ۔ جنگ تالیکوٹہ کے لیے روانگی

۲ ۔ دونوں لشکر برسر جنگ ہیں

بھارت اتہاس سنشودک منڈل پونہ کی نوازش سے یہ تصویریں شائع کی گئیں

۳ - رامراج مقابل میں آرہا ہے

۴ - رامراج کا خاتمہ

بھارت اتہاس سنشودک منڈل پونہ کی نوازش سے یہ تصویریں شائع کی گئیں

بیـار است[1] بـازار نـاور (؟) دار ۳۰۵ بر انکیخت تاب (؟) روان کردار
حمایل یکے تیغ هندی چـواب　　　بکو بـرتـر از چشمۂ آفتـاب
۸۳ ز فولاد هندی کله بر سرش　　　که کوهر برشک آمد از کوهرش
نشسـته بهر بـارگی کـوه وش　　　بخوشحالی و تندی و روی خوش
بشمشیر کین چوں در آورد دست　　　ببـازار کافر در آمـد شکست
دل از جای شد کافر شوم را ۳۱۰ چو از کورۂ آتشین موم را
۸۴ حسین شاه رافتح شـد ایں رهنمو　　　بزنهـار خواهی در آمد زبوں
چو خصماں کرفتار خواری شدند　　　دلـیراں کافـر بزاری شدنـد
بزخم سنـاں کافـر رامـراج　　　سرش بر زمیں خورد و افتاد تاج
ز افتـاد کافـر از زخم تیـز　　　تو کفتی برامـد یکے رستخیز
۸۵-۶ بیک کس اشارت چوں شاه کرد ۳۱۵ سرش را بـریدنـدو پر کاه کـرد

تصاویر جنک بر هر دو صفحه

ز بس کشته بر کشته مرداں مرد　　　شده را کشته[2] بـر ره نـورد
ز بس غارت آوردن از بهرشاه　　　غنیمت نکـنجید در عرصه کاه
چو شاه آن متاع کران سنج دید　　　چو دریا یکے دشت برکنج دید
شد از فتح کفار و تاراج کنج　　　خوشان و برآسود از راه و رنج
سر[3] رایت شـاه بـرشـد بمـاه ۳۲۰ ز غوغای کافـر تهی شد سپاه
کسی را کـه زبر علم تاختند　　　بفرمـاں خسرو سر انداختند
۸۷ بعبرت دران کشتکاں بنکریست　　　بخندید پیدا و پنهـاں کریست
کـه چندین خلائق درین داروگیر　　　چرا کشت باید بشمشیر و تیر
کنه کر برایشان نهم نـارو است　　　ور از خود خطا بینم این هم خطاست

۱　اس شعر نمبر ۳۰۵ کو یوں پڑھنا بہتر ہوگا:

بیا راست بازار ناوردرا　　　بر انگیخت ز آب روان گرد را

فرشتہ صفحہ ۲۲۸ پر ایک شعر ذیل آیا ہے جس میں شعر نمبر ۳۰۶ کے آخیر کے الفاظ ضرور ہیں.

در خشیدن تیغ آئینه تاب　　　ز ده خنده بر چشمه آفتاب

۲　« راه‌بسته »

۳　اشعار نمبر ۳۲۰ و ۳۲۱ حاشیے پر تھے۔

فلک را سراند اختر شد سرشت ۳۲۵ نشاید کشیدن سر از سر نوشت
۸۸ که داند که این خاک انگیخته بخون چه دلها ست امیخة
بیا ساقی از می مرا مست کن چو می در دهی نقل در دست کن
نه زان مے که دل‌را بدان خوش کنم بدوزخ درش طوق آتش کنم

باز آمدن حسین‌شاه از غزای کافر و فتح بیجانکر بشهر احمد نکر و رحلت کردن او از دارالفنا بدارالبقا

۸۹ گذارندهٔ داستان دری چنین داد نظم گذارش‌گری
که چون فرخے شاه راکشت جفت ۳۳۰ چو گلنار خندید و چو گل شکفت
در گنج نکشاد [1]برکنج خواه توانگر شد از گنج و گوهر سپاه
غنی کرد کردن کشانرا به کنج ز گوهر کشی لشکر آمد به رنج
۹۰ بفرمود تا کوس بنواختند وزآنجا سوی ملک خود تاختند
روا رو زنان نای زرین زدند سرا پرده بر پشت پروین زدند
شهنشه بزد کوس و لشکر برآند ۳۳۵ سر رایت خود بگردون رساند
پس آنکه روان شد بفتح و ظفر بریده سر راو بیجانکر
۹۱ سوی ملکت خویش و آرا مکاه که بد شهر احمد نکر تختگاه
حسین‌شاه آن شاه فیروز مند برافراخته سر بچرخ بلند
نشسته بر مرکب خاص خویش خرامنده بر اسپ رقاص خویش
بموکب روان لشکر از هر کنار ۳۴۰ نچندان که داند کس آنرا شمار

یہاں یہ نسخہ ختم ہوتا ہے اور اس کے اگلے صفحے پر تین مہریں چھوٹی سی ہیں جن میں لکھا ہے

پورن چند سنہ ۱۲۵۰

اور ایک مہر خراب ہوچکی ہے یا مٹائی گئی ہے اور اسی طرح اس کے اگلے صفحے پر بھی خراب شدہ مہر ہے۔

---

[1] « بکشاد »

خطبۂ صدارت

شعبۂ اردو — آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ علی گڑھ — ۱۴ فروری سنہ ۱۹۴۳ع

اے صاحبو! اردو کی داستان جس قدر شاندار ہے اسی قدر دردناک بھی ہے۔ یہ مقام جہاں آپ جلوہ فرما ہیں، اردو کا گہوارہ اور اتارا رہا ہے۔ اسی ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جمگھٹوں میں ہماری زبان کے نامور ادیب، مورخ، مصنف، شاعر تکلیف فرماتے اور اپنے کلام سے اہل کانفرنس کو محظوظ کرتے تھے۔ لوگ دور دور سے کھچے چلے آتے تھے اور بڑے شوق سے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ قطع نظر دوسرے فوائد کے ان بزرگوں کو دیکھنا، ان کی باتیں سننا یا ان سے ملنا ہی اپنی بڑی خوش قسمتی اور اپنی زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھتے تھے اور ان باتوں کا تذکرہ آج بھی ہم اپنی صحبتوں میں بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد کے جوہر یہیں کھلے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ سید احمد خاں ان سب کے سردار تھے۔ سید کے احسانات سے کون انکار کرسکتا ہے یہ گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ اس نے زبان کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا، سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں، اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بےلاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبارنویسی کا پایہ بڑھایا، تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا، ٹائپ کو رواج دیا۔ ان بزرگوں کی سعئی عمل سے علی گڑھ اردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہوگیا تھا جس کی فضیلت

اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اردو زبان کے فروغ اور اوج کا زمانہ تھا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائےگا۔

کیا اب بھی علی‌گڑھ کو یہ فضیلت حاصل ہے ؟ کالج یونیورسٹی ہوگیا ہے عمارتوں کا سلسلہ لامتناہی ہوتا جارہا ہے، علوم و فنون کے شعبے بڑھتے چلے جارہے ہیں، طلبا کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، لایق پروفیسروں کا ایک خاصا گروہ موجود ہے۔ ظاہری شان و شوکت بھی کچھ کم نہیں بلکہ پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن روح نہیں۔ ظاہر شان‌دار اور روشن ہے لیکن باطن دھندلا ہے۔ پہلے یہ اردو ادب کا آستانہ تھا اور اب یہ اس کا مزار ہے۔

اس میں مطلق شبہ نہیں کہ ماحول کا انسان کے مقدر میں بہت بڑا دخل ہے۔ ایک ناسازگار ماحول بعض اوقات اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی صفات کو زائل کردیتا ہے۔ اور اگر کوئی معقول صحبت یا ماحول مل گیا اور صلاحیت بھی ہوئی تو آدمی ترقی کے اوج تک پہنچ جاتا ہے۔ سید کے زمانے میں کالج میں ادبیت کا رنگ نظر آتا تھا۔ اول تو وہ خود ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ دوسرے بعض اہل‌کمال اور ادیب کالج میں آتے اور قیام فرماتے۔ طلبا ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتے۔ اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً پروفیسر آرنلڈ، مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پایے کے تھے کہ ان کی تعلیم، گفتگو اور صحبت صحیح علمی اور ادبی ذوق کی ضامن تھی۔ ظاہر ہے کہ سب ادیب اور عالم نہیں ہوسکتے لیکن جن میں کچھ صلاحیت اور مادہ تھا، اس سے مستفید ہوئے اور کچھ کیا بھی۔ حالاں کہ اس زمانے میں کالج کے نصاب تعلیم میں اردو داخل نہ تھی۔ اب یونیورسٹی میں اس کا الگ شعبہ ہے اور اس کے لیے پروفیسر اور لکچرار بھی ہیں۔ مگر وہ ذوق شوق نہیں۔ شاگردوں میں نہ استادوں میں۔

ذہنی قابلیت کے لیے تعلیم، باقاعدہ مطالعہ، مدارس کے معلم، یونیورسٹی کے پروفیسر، کتب خانے، تجربہ خانے، کتابیں، رسالے، اخبار، اپنے زمانے کے مروجہ خیالات مکتفی ہوتے ہیں۔ اگر معلم اور پروفیسر نہ بھی ہوں تو صرف کتابیں اس غرض کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن اخلاقی اور ذوقی صلاحیت اس طرح حاصل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص لکچروں سے نیک و بد اور

حسن و قبح میں تمیز پیدا نہیں کرسکتا۔ ایک احساس ہے اور دوسرا جاننا۔ یہ دماغ کی دو مختلف کیفیتیں ہیں۔ ضابطے کی تعلیم جو عموماً امتحان پاس کرنے کرانے کی ہوتی ہے صرف ذہن تک پہنچتی ہے۔ اخلاق اور ذوق کا احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ہمارے ماحول میں بسا ہوا ہو اور ہمارے روزمرّہ کی زندگی کا جز بن گیا ہو۔

محض ذہنی قابلیت بیکار ہے، اس کے سوا کچھ اور بھی درکار ہے۔ اس کی تکمیل اخلاقی احساس، عزم، قوت فیصلہ اور تخیل سے ہوتی ہے۔ جو لوگ علم پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں بڑی کڑی تیاری اور سخت جفاکشی کی ضرورت ہے۔ یہ زاہد کا سا زہد اور صوفی کی سی توجہ چاہتی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لیے اخلاقی قوت لازم ہے۔ اسی قوت سے فرض شناسی اور ذمےداری عطا ہوتی ہے جو ہمارے اردو زبان کے متعلّم اور معلّم دونوں میں تقریباً مفقود ہیں۔

یہ کچھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہی کا حال نہیں۔ اس صوبے میں ایک چھوڑ پانچ یونیورسٹیاں ہیں اور ہر جگہ اردو کی حالت نہایت پست اور ادنیٰ ہے اور بعض جگہ تو ناگفتہ بہ ہے۔ اس کی حالت ایک ایسے یتیم کی سی ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں نے اپنی زبان کی وسیع اور زبردست اہمیت کو جو اسے ہندستان کے قومی مسائل میں حاصل ہے پوری طرح نہیں سمجھا۔ علی گڑھ مورد الزام اس لیے ہے کہ یہ کچھ دنوں پہلے مرجع اہل زبان رہ چکا ہے۔ اس کا فرض تھا کہ وہ سنّت سید کو قائم رکھتا اور اسے پستی سے بچاتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اور زیادہ ترقی دیتا اور یہ مقام اردو کا سب سے بڑا مرکز ہوتا۔ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ یونیورسٹی بننے پر اردو کی حیثیت اور بھی کم ہوگئی۔

یونیورسٹی بننے کے بعد پہلا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ اردو ذریعۂ تعلیم قرار دی جاتی۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ سرسیّد پہلے شخص تھے جنھوں نے اردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ میں نے وہ عرض‌داشت دیکھی ہے جو انھوں نے سنہ ۱۸۶۷ء میں حکومت ہند کو بھیجی تھی۔ یہ اس قدر معقول مدلل واضح اور روشن ہے کہ اس کے بعد سے اب تک جتنی تحریریں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس عرض‌داشت میں نہ ہو۔ اسے پڑھ کر مجھے ان کی

اپنے لندن جاتے ہیں اور بیلی صاحب کی عطا کی ہوئی ڈگری فخر سے اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں اور بوالعجبی دیکھیے کہ ہماری یونیورسٹیاں بھی اس ڈگری کو تسلیم کرتی ہیں۔ کیا ہم اپنی یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں کرسکتے؟ کیا یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعۂ عثمانیہ، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو کی تعلیم کا ایسا بہتر انتظام ہوتا کہ یورپ والے ہماری ان یونیورسٹیوں میں آتے اور پی-ایچ-ڈی کی ڈگریاں لےکر جاتے؟

شعبۂ اردو کو بہتر اور اعلیٰ بنانے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ اس زمانے میں زبان کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے، آیندہ اس سے زیادہ مشکلات آنے والی ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسے طالب علموں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں اپنی زبان کی وقعت اور اہمیت پورے طور پر جاگزیں ہو۔ انسان بالطبع کاہل اور آسانی پسند واقع ہوا ہے اور خاص کر آج کل کے طالب علموں میں مطالعہ اور دل لگا کر کام کرنے کی طرف سے بےاعتنائی بڑھتی جاتی ہے۔ انھیں محنت اور جفاکشی کا عادی بنانا چاہیے۔ پیہم اور مسلسل محنت کرنے ہی سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ بےاعتنائی اور بےعملی زندگی کے ہر شعبے میں مصیبتوں کا پیش خیمہ ہوجاتی ہے۔ ان کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ذوق ادب ساتھ لیتے جائیں اور اسے اپنی زندگی کا جز بنالیں اور کسی حال میں ہوں اپنے غور و فکر اور کام سے ادب میں اضافہ کرنے اور اپنی زبان کی ترقی و اشاعت میں کوشاں رہیں۔

اس کے علاوہ زبان کے مطالعے اور تعلیم میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ ہمارے طلبا زبان کی اصل ماہیت اور اس کی فطرت سے بہ‌خوبی واقف ہوں اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں صحت اور صفائی میں کافی قدرت رکھتے ہوں۔ جس طرح اشیا اور ادویہ اور انسانوں کا مزاج ہوتا ہے اسی طرح زبان کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کی فطرت ہے۔ خلاف مزاج دوا ہو یا بات ہمیشہ ناگوار یا مضر پڑتی ہے اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کہی یا لکھی جائے جو زبان کے مزاج یا اس کی فطرت کے خلاف ہو تو وہ بھی ناگوار ہوتی ہے اور اس کا کہنے یا لکھنے والا تعلیم‌یافتہ اور شایستہ نہیں سمجھا جاتا۔ آج کل ہمارے اکثر تعلیم‌یافتہ انگریزی کے ذریعے سے اپنی زبان سمجھتے ہیں اور اردو میں اپنے خیالات انگریزی کی وساطت سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تحریریں اور خصوصاً ترجمے دیکھ کر غور کرنا پڑتا ہے کہ

یه کہتے کیا ہیں۔ ان کے دماغ میں انگریزی ترکیبیں، جملے کی انگریزی ساخت اور انگریزی محاورے سمائے ہوئے ہیں۔ جب وہ انھیں اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں تو وہ ایک عجیب و غریب زبان ہوجاتی ہے جسے اردو داں مشکل سے سمجھ سکتا ہے اور بعض اوقات تو خود مترجم یا مولف بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ علمی ترجموں کی تو بری طرح مٹی پلید ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دوسری طرف وہ یہ نہیں جانتے کہ اردو میں خیال کس ڈھنگ سے ادا کیا جائے کہ وہ ہماری زبان کے روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہو اور زبان کی فطری ساخت کے مخالف نہ پڑے۔ انگریزی زبان کا علم ناقص، اپنی زبان پر عبور نہیں، اب جو کچھ تحریر میں آئےگا وہ جیسا ہوگا، اس کا اندازہ آپ بہخوبی کرسکتے ہیں۔ میں اس کی بےشمار مثالیں پیش کرسکتا ہوں لیکن آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ جسے شبہ ہو وہ دارالترجمہ عثمانیہ کے بعض علمی کتابوں کے ترجمے دیکھ لے اور ان کا مقابلہ ان ترجموں سے کرے جو سو سال پہلے دہلی کالج میں ہوئے تھے۔

سنہ ۱۸۷۱ع کا واقعہ ہے مسٹر ایچ-بی بوئرونی انڈر سکریٹری فارن آفس نے ہئیت کی ایک انگریزی کتاب کے اردو ترجمے کے لیے اشتہار دیا اور ایک ہزار روپیہ انعام مقرر کیا۔ مولوی نذیراحمد نے بھی اس کا ترجمہ کیا اور وہ انعام انھیں کو ملا۔ میں نے وہ ترجمہ دیکھا ہے پڑھتے چلے جائیے کہیں الجھن نہیں معلوم ہوتی۔ الفاظ اور اصطلاحات ایسی برجستہ اور برمحل ہیں کہ ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا، اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اردو تعزیرات ہند ہی کو دیکھ لیجیے، ہے تو ترجمہ مگر تصنیف کی شان نظر آتی ہے۔ اس کی اصطلاحات ہماری زبان کا جز ہوگئی ہیں۔ مولوی نذیراحمد انگریزی کے عالم نہ تھےنہ ان کے پاس یونیورسٹی کی سند تھی۔ بات کیا تھی وہ مفہوم کو سمجھکر اس طرح اپنی زبان کے محاورے میں ادا کرتے کہ اصل کی روح کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ مولوی کرامت حسین فلسفہ اور سائنس کے مضامین کس خوبی سے لکھ گئے ہیں۔ بہت‌سی اصطلاحات جو اب ہماری زبان میں عام ہوگئی ہیں پہلے پہل انھیں کی بدولت ہم تک پہنچیں۔ اب جو ترجمے ہوتے ہیں وہ صحیح بھی ہوں تو روح مفقود ہوتی ہے۔ یہی علمی تالیفات کا حال ہے۔ یہ لسانی تعلیم کی خامی اور اپنی بےمایگی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں اپنی زبان کا مطالعہ سرسری اور اوپری ہوتا ہے۔ اس نظر سے کیا ہی نہیں جاتا کہ اس کی تہ تک پہنچیں اور اس

پر قدرت حاصل کریں ورنہ ہماری زبان ایسی کم مایہ نہیں جیسی خیال کی جاتی ہے۔ اس بےتہی اور خامی کو رفع کرنا اردو شعبوں کا کام ہے۔

یہ شکایت صرف یونیورسٹیوں ہی سے نہیں۔ اس صوبے کی حالت بھی اردو زبان کے معاملے میں روز بروز پست ہوتی چلی جاتی ہے (دلی اگرچہ انتظامی اور سیاسی تقسیم کی بنا پر الگ ہے لیکن ادبی اعتبار سے اس کا شمار اسی صوبے میں ہے) یو۔پی والوں کا یہ فخر بجا ہے کہ اردو کو ترقی اور عروج یہیں حاصل ہوا، یہیں کی زبان فصیح اور ٹکسالی مانی گئی اور ملک کے ہر علاقے میں رائج ہوئی۔ یہاں ایسے نامور اور ممتاز ادیب، شاعر اور مصنف ہوئے جن کے نام جب تک اردو زبان قائم ہے، زندہ رہیں گے۔ لیکن جب ہم صوبے کے موجودہ حالات پر نظر کرتے ہیں تو یہ سب فخر و امتیاز بےجا اور بےمحل معلوم ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ ادبی تخلیق کے کے سوتے بند ہوگئے ہیں بلکہ زبان کی ترقی و اشاعت کے لوازم اور سامان بھی مفقود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب سے بیس پچیس سال پہلے تک صوبۂ متحدہ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا مرکز تھا۔ لکھنؤ، کان پور، الہ آباد، علی گڑھ، آگرے میں بیسیوں اردو کے اچھے چھاپےخانے تھے۔ کان پور کے رحمت اللہ رعد مرحوم کے نامی پریس کی چھپی ہوئی کتابیں مثلاً مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ وغیرہ حسن طباعت اور نفاست کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ رعد مرحوم اپنے فن کے ماہر ہی نہ تھے، انھیں اپنے فن سے عشق تھا۔ آگرے کا ابوالعلائی اسٹیم پریس سنگی طباعت کے لیے صوبے بھر میں مشہور تھا۔ لکھنؤ میں ایک دو نہیں متعدد چھاپےخانے تھے جن کی چھپی ہوئی کتابیں خوبئ طباعت کی وجہ سے بہت پسند کی جاتی تھیں۔ الہ آباد کے بعض چھاپےخانوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ آخر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس نے کتابت و طباعت کی حسن و خوبی کی وجہ سے بہت نام پایا، اور بہت اچھی اچھی کتابیں چھاپیں۔ افسوس کہ چند ہی سال میں یہ مطبعے گم نام و بےنشان ہوگئے اور آج یہ روایتیں داستان پارینہ معلوم ہوتی ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ اس صوبے کی چھپی ہوئی اردو کتابیں طباعت و کتابت کے بھدّے پن کے لیے مشہور ہیں۔ ایک نول کشور پریس ضرور باقی ہے لیکن اب اسے فارسی اردو سے وہ شیفتگی نہیں رہی۔ رہا علی گڑھ جسے صحیح معنوں میں علم و تہذیب کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہے وہ اردو سے بےنیاز ہوچکا ہے۔ یہاں جو اردو کی دو ایک کتابیں چھپ جاتی ہیں

تو ان کا چھپنا نہ چھپنا برابر ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب اس صوبے میں اردو طباعت کے مرکز ہی نہ رہے تو زبان کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔

اگرچہ اس صوبے کی دفتری اور عدالتی زبان اردو کہی جاتی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کے تمام محکمے جن کا تعلق زبان کی ترقی اور اشاعت سے ہے، قریب قریب سب کا رویّہ اردو کے ساتھ غیر منصفانہ اور ایک حد تک معاندانہ ہے ۔ محکمۂ تعلیم، محکمۂ توسیع تعلیم، محکمۂ دیہات سدھار اور اسی قبیل کے دوسرے محکمے اس روش میں متحد ہیں لیکن جہاں حکومت قابل الزام ہے وہاں ہماری اپنی کوتاہی کو بھی بڑا دخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا کبھی ہم نے موثر طور پر حکومت کی ان زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی، ہم نے کبھی بھول کر بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ محکمۂ توسیع تعلیم اور محکمۂ دیہات سدھار میں ہر سال کتنی کتابیں اور کس قسم کی خریدی جاتی ہیں ۔ ان میں اردو کی کتنی ہوتی ہیں اور ہندی کی کتنی ۔ کیا کبھی ہم نے یہ جاننے کی زحمت گوارا کی کہ حکومت کے مدارس اور وہ تعلیم‌گاہیں اور ادارے جو حکومت سے امداد پاتے ہیں اردو کی کتنی کتابیں خریدتے ہیں اور اگر اردو کتابوں کی خریداری کا تناسب ہندی کتابوں کی خریداری سے کم ہے تو کیوں؟

گزشتہ سال میں نے انھیں امور پر غور کرنے کے لیے ایک مختصر کمیٹی لکھنؤ میں منعقد کی تھی جس میں صوبے کے اہل مطابع اور ناشروں نیز بعض ایسے اصحاب کو مدعو کیا تھا جو کتابوں کی اشاعت و تالیف کا تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک مختصر مشاورتی مجلس تھی۔ کافی بحث و گفتگو کے بعد چند تجویزیں منظور ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو ہند انھیں عمل میں لانے کے لیے غور کررہی ہے اور اس بارے میں بعض صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی جارہی ہے۔

یو۔پی کی زبوں حالت کا صحیح اندازہ اردو مطبوعات کی روز افزوں کمی سے ہوتا ہے ۔ یہاں میں چند سال کے اعداد پیش کرتا ہوں۔

	کل ہند		یو۔پی	
	ہندی	اردو	ہندی	اردو
سنہ ۱۹۳۱ع	۲۳۱۹	۱۱۷۷	۱۷۵۹	۳۸۷
سنہ ۱۹۳۲ع	۲۸۲۳	۱۳۹۰	۲۰۹۰	۴۰۱

	کل ہند		یو۔پی	
	ہندی	اردو	ہندی	اردو
سنہ ۱۹۳۳ع	۲۹۶۹	۱۵۴۳	۲۲۳۲	۳۷۵
سنہ ۱۹۳۵ع	۲۸۸۶	۱۲۰۳	۲۰۹۶	۳۰۶
سنہ ۱۹۳۶ع	۲۹۴۱	۱۰۳۸	۲۰۹۸	۲۵۴
سنہ ۱۹۳۸ع			۱۷۸۵	۱۷۲
سنہ ۱۹۴۰ع		(نو مہینے میں)	۱۰۷۷	۱۵۹
سنہ ۱۹۴۱ع	۲۱۱۳	۱۳۲۰	۱۲۹۰	۱۹۸

یہ اعداد بہت ہمت‌شکن اور مایوس‌کن ہیں۔ انہیں اعداد کو دیکھ‌کر بعض زمانہ‌شناس صاحبوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اردو اس صوبے میں چند سال کی مہمان ہے۔ ایک مدت پہلے معاملہ اس کے برعکس تھا اور ہندی اردو کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے اتنا وقت نہیں ملا کہ سنہ‌وار مسلسل اعداد جمع کرتا، جلدی میں جو چند اعداد دست‌یاب ہوئے وہ پیش کررہا ہوں جس سے آپ کو اس کا اندازہ ہوجائے گا۔

سنہ ۱۸۵۱ع میں ہندی اردو کی کل کتابیں ۱۲۶ شایع ہوئیں جن میں سے (۸۴) اردو کی تھیں۔ سنہ ۱۸۶۱ع میں صوبۂ شمال مغربی میں (۱۷) اخبار تھے۔ ان میں (۱۱) اردو کے تھے اور ۶ ہندی کے۔ سنہ ۱۸۶۸ع میں میٹریکولیشن کے امتحان میں ۲۵۲ طلبا اردو کے تھے اور ۲۸ ہندی کے۔ ڈائرکٹر تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کی رپوٹ سنہ ۱۸۶۹ع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۸ع میں کل کتابیں ۲۵۳ شایع ہوئیں جن میں (۱۴۶) اردو کی تھیں اور ۱۰۷ ہندی کی۔ ہندی اردو کے کل اخبار ۲۴ تھے۔ اردو کے (۱۶) اور ہندی کے پانچ۔ سنہ ۱۸۶۹ع میں ۳۱ اخباروں میں سے (۲۶) اردو کے تھے اور پانچ ہندی۔ اردو اخباروں کے کئی اڈیٹر ہندو تھے۔

سنہ ۱۸۷۴ع میں آگرہ واودھ سے (۲۵) اردو کے اور صرف ۹ ہندی اخبار نکلتے تھے۔ سنہ ۱۸۷۵ع میں ۲۰ نئے اخبار شایع ہوے جن میں (۱۸) اردو کے تھے اور دو ہندی کے۔ ڈائرکٹر تعلیمات صوبۂ پنجاب کی رپوٹ سنہ ۱۸۶۷ و ۶۸ سے

نے اس تبدیلی کے خلاف حکومت کو لکھا ہے۔ مسٹر ایڈی بنگال کے نئے لفٹنٹ گورنر حال میں بہار کا دورہ کرکے لوٹے ہیں وہ از راہ انصاف کہہ دیں کہ عوام کی زبان کون سی ہے کیا انھوں نے پڑوس کے صوبہ جات شمال و مغربی کی عدالتوں کی زبان نہیں دیکھی۔ اس شہادت کے بعد کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں رہتی"۔ الغرض سنہ ۱۸۷۳ع جب سرسید کو یہ معلوم ہوا کہ مدرسوں اور دفتروں میں دیوناگری جاری کرنے کے لیے ایک درخواست ہندوؤں کے دستخطوں کے لیے گشت کرائی جا رہی ہے تو انھوں نے ۹ دسمبر سنہ ۷۳ع کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اردو کی حفاظت کے لیے ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی جس کے سکرٹری سرسید قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں۔ سرسید نے ایک پر زور اور مدلل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو مفصل طور پر بیان کیا جو اس تبدیلی سے پہنچیں گے۔ سنہ ۱۸۸۲ع میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایجوکیشن کمیشن کا دورہ بہ غرض تحقیقات ملک میں ہوا تو یہ جنون پھر بڑی شدّت سے اچھلا اور اضلاع شمال مغربی اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان کی بڑے زور شور سے مخالفت کی اور دونوں صوبوں کی بےشمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے۔ چناں چہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے، ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے اڈریس کے جواب کے ضمن میں کہا کہ "روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بےشمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں میموریل وصول ہورہے ہیں۔ صرف ایک درخواست پر جو کل ہی وصول ہوئی تین ہزار دوسو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں"۔ کمیشن میں بھی یہ معاملہ پہنچایا گیا، لیکن سرسید نے اس بنا پر کہ یہ معاملہ اب تعلیمی نہیں رہا سیاسی ہوگیا ہے اس ناگوار بحث کو کمیشن میں نہ آنے دیا۔

یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، مارچ سنہ ۱۸۹۸ع میں یکایک بھڑک اٹھی۔ اشتعال کا باعث سر اینٹنی میکڈانل ہوئے جو اس صوبے میں لفٹنٹ گورنر ہوکر آئے تھے۔ اس سے پہلے صوبۂ بہار میں کلکٹر تھے۔ وہاں بھی انھوں نے اس آگ پر بہت کچھ تیل چھڑکا تھا۔ ان کے آنے سے ہندی کے طرف‌داروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے

تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۵ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شایع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ‌آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بہ‌ذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ ' اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہوسکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا، میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں '۔

اسی سال ہندی والوں کا ایک ڈیپوٹیشن لفٹنٹ‌گورنر بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس کو جواب دیتے ہوئے ' ہزآنر نے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کرکے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ حاصل ہوسکتا ہے '۔ ڈیپوٹیشن کی یہ بڑی کام‌یابی تھی کہ لفٹننٹ گورنر نے ان کے مطالبے کو قابل قبول سمجھا۔ جلد نہیں تو بدیر پوری کام‌یابی میں کچھ شک و شبہ نہ رہا۔ چناں‌چہ گورنمنٹ کے ریزولیشن مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ع میں ناگری حروف جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کردیا گیا۔ لفٹنٹ‌گورنر نے تو صرف ناگری حروف کی قید لگائی تھی، لیکن وائسرائے بہادر (لارڈ کرزن) نے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان کا لفظ بنادیا۔ وہ جو زرا سا تسمہ لگا رہ‌گیا تھا ظالم نے وہ بھی کاٹ کے رکھ دیا۔

اس پر مسلمانوں میں بڑا ہیجان ہوا۔ نواب محسن‌الملک بہادر نے ان احکام کی ناانصافی کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانے کی غرض سے ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے کی تیاری کی اور ملک کے سربرآوردہ اور تعلیم‌یافتہ اصحاب کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ ۱۷، ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ع کو بہ مقام لکھنؤ بارہ‌دری قیصر باغ میں بڑی دھوم‌دھام اور جوش و خروش سے ہوا۔ ریزولیشن پاس ہوئے اور بہت مدلل اور سنجیدہ تقریریں ہوئیں خصوصاً پنڈت کدارناتھ صاحب بی-اے وکیل بنارس نے اس ریزولیوشن کی مخالفت میں نہایت معقول اور پرجوش تقریریں کیں۔ مولوی کرامت‌حسین بھی اس جلسے میں شریک تھے اپنی تجویز پیش کرتے وقت انھوں نے فرمایا ' اے حضرات، میں اہل قنوط سے ہوں اور مجھ‌کو دل افسردہ کرنے والا پہلو بھی نظر آتا ہے، خدا کرے ایسا نہ ہو اور آپ حضرات دعا فرمائیں کہ میرا اندیشہ وسواس کی حد سے کبھی آگے نہ بڑھے۔ میرا اندیشہ یہ ہے کہ ہندی ریزولیوشن نے فی‌الحال مسلمانوں کے دلوں میں دودھ کا سا ابال پیدا کردیا ہے جو نفسے چند کا مہمان ہے۔ اگرچہ خدا

نہ کردہ موجودہ متحدہ کوشش کا بھی انجام ہونے والا ہے تو ہمارا ادبار مستمر ہے۔ ہماری جہالت، ہمارا افلاس، ہماری بےعزتی، ہماری تباہی دن دونی اور رات چوگنی ہوگی۔ ہم ایسے ناشدنی دائرے میں ہوں گے جس کے ہر طرف 'ضربت علیہم الذلة والمسکنة' لکھا ہوگا"۔ آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا اور مولانا مرحوم کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ باوجودیکہ نواب محسن الملک نے اپنی تقریر میں کمال ادب و انکسار سے احکام پر نظرثانی کی گزارش کی تھی اور قدم قدم پر مہربان گورمنٹ اور حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کے عدل و انصاف اور نیک نیتی کی مدح سرائی اور ان کے احسانات کا شکریہ کیا تھا تو بھی حاکم کے جبروت اور غرور کو زرا سا اختلاف رائے بھی گوارا نہ ہوا اور ایسی سخت دھمکی دی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک چھوڑتے بنی اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا۔ یہ واقعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ یہ اردو کی بہت بڑی شکست تھی۔

اس وقت سے یہ زبان جسے اب ہندی کہا جاتا ہے، ترقی کرتی چلی گئی۔ پنڈت مالویہ جی نے جب شدھی اور سنگھٹن کے دنگل قائم کیے تو اس کا زور اور بڑھا۔ اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی ہندو ریاستوں میں اس وقت تک دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی۔ وہاں وفد بھیج بھیج کر اردو کو اکھاڑا اور ہندی کو جمایا۔ ایک جے پور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نامی نے مرن برت رکھا کہ جب تک تمام ریاست میں اور اس کے دفتروں اور عدالتوں میں ہندی دیوناگری حروف میں جاری نہ ہوگی اور اردو کو دیس نکالا نہ دیا جائےگا میں برت نہیں توڑوں گا اور جان دیدوں گا۔ راجپوتانہ پراونشل ہندوسبھا اور جے پور ہندوسبھا نے اس کی حمایت میں زمین آسمان ایک کردیا۔ اس قسم کی فاقہ کشی گاندھی جی کی ایجاد ہے۔ گاندھی جی اور ان کی تقلید میں بہت سوں نے مرن برت رکھے لیکن مرا ایک بھی نہیں۔ یہ مرن برت نہیں دھمکی برت ہے۔ اور جس طرح راجکوٹ کے معاملے میں وائسرائے دھمکی میں آگئے تھے اسی طرح جے پور کے مدبر اعظم بھی دھمکی میں آگئے۔ سر اینٹنی میکڈانل نے ہندو ڈیپوٹیشن کے جواب میں کہا تھا کہ یہ تبدیلی جلد نہیں ہوسکتی لیکن جے پور کے وزیر اعظم نے فرمایا جہاں تک جلد ممکن ہوگا ہندی جاری

کردی جائے گی۔ سرا ینٹنی کو دیوناگری جاری کرنے میں دو سال لگے، مگر جے پور کے وزیر باتدبیر نے چند ھی روز میں حکم ناطق نافذ کردیا۔ اور بے گناہ اردو کے قتل کا فتویٰ سر مرزا اسمعیل کے دست مبارک سے لکھا گیا انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرات۔ پہلے یہ تنازع بہار، یو پی اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں تھا۔ لیکن جب گاندھی جی نے اس میدان میں قدم رکھا اور انھوں نے یہ اعلان کیا کہ میں ھندی کو اس ملک کی قومی زبان بنا کے رھوں گا اور اس کی اشاعت کا کام باقاعدہ تندھی سے شروع کر دیا تو یہ آگ سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور جو نزاع ایک خاص علاقے میں محدود تھی وہ ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور ایک مقدس صلح کل اور مقبول لیڈر کی بدولت مستقل بنیاد فساد کی قائم ھوگئی جس کے اثر زبان ھی تک نہ رھے بلکہ دور دور تک پہنچے۔ اور زندگی کا ھر شعبہ اس میں الجھ گیا۔ گاندھی جی ھزار تاویلیں کریں، جو کام انھیں کرنا تھا وہ کر چکے اور جو کاری ضرب اردو پر لگانی تھی لگا چکے۔

اب حالت یہ ھے کہ ھر شخص خواہ وہ اردو یا ھندی جانے یا نہ جانے اس معاملے میں رائے دینے کو تیار ھے کیوں کہ یہ معاملہ اب صرف زبان کا نہیں رھا بلکہ لسانی، تعلیمی، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی، مذھبی سب ھی کچھ ھوگیا ھے۔ تقریباً دو ھفتے ھوتے ھیں آپ نے اخباروں میں پڑھا ھوگا کہ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری نے مدراس میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ ھندی ایک روز اس ملک کی قومی زبان بن کے رھے گی۔ یہ ایک نہایت نرم، حلیم الطبع اور اعتدال پسند سیاست داں کا قول ھے۔ جب اینٹنی میکڈانل، گاندھی جی، شاستری جی اور مرزا جی جیسے بزرگوں کے ھاتھ میں ھماری زبان کی قسمت کا فیصلہ ھو تو جو نہ ھو کم ھے۔ کچھ دن ھوئے سر تیج بہادر سپرو نے، جو اردو کے شیدائیوں میں ھیں، مجھ سے بڑے افسوس اور حسرت سے فرمایا کہ "ھندو اردو چھوڑتے جاتے ھیں، اب تک مجھے یہ توقع تھی کہ کائستھ اور کشمیری پنڈت ھمارا ساتھ دیں گے لیکن افسوس وہ بھی ھٹتے جاتے ھیں"۔ اردو جو ھندوستان کی تاریخ میں ھندو مسلم اتحاد کی سب سے عظیم الشان اور مبارک یادگار ھے وہ بڑی بیدردی سے فرقہ داری سیاست کی بھینٹ چڑھائی جارھی ھے۔

حضرات، ھم میں ایک گروہ مذبذبین کا بھی ھے۔ وہ اردو کے زبان داں اور قدرداں ھیں انشا پرداز اور صاحب تصانیف بھی ھیں ان میں سے بعض صاحب ادارہ بھی

ھیں - ان کے ھاتھ میں یا ان کے اثر میں اخبار یا رسالے بھی ھیں - ھر چند کہ ایک مدت سے اردو پر پیہم حملے ھو رھے ھیں اور حالات نازک ھوچلی ھے، لیکن خدا کے یہ نیک بندے کچھ نہیں کہتے - سب کچھ دیکھتے اور جانتے ھیں مگر خاموش ھیں وہ نہ اس فریق کو ناخوش کرنا چاھتے ھیں نہ اس فریق کو - وہ زبان کھولتے ھوئے ڈرتے ھیں کہ کہیں ان کی شان غیر جنبہ داری میں جفتے نہ پڑ جائیں - ممکن ھے کہ خاموشی میں وہ کوئی خاص مصلحت سمجھتے ھوں اور ان کے کام کا طریقہ کوئی ایسا ھو جس کا علم دوسروں کو نہ ھو لیکن یہ وقت کانا پھوسی کرنے یا پردے میں گفتگو کرنے کا نہیں، خلوت سرائے سے نکل دیوان عام میں آنے کی ضرورت ھے - آپ شخصی معاملات میں خاموش یا غیر طرفدار رہ سکتے ھیں لیکن قومی معاملات میں، خصوصاً ایسے امور میں جن پر قومی فلاح کا انحصار یا زیاں کا اندیشہ ھے، خاموش رھنا جرم ھے - یونان کے مشہور مقنن لائی کرگس نے اپنے قانون میں نیوٹرل یعنے ناطرفدار کو غدار سے تعبیر کیا ھے اور اس کی سزا وھی مقرر کی ھے جو غدار کی ھوتی ھے - قوم کا معزز رکن ھوتے ھوئے ایسے اھم معاملے میں کوئی رائے نہ رکھنا یا مصلحتاً اس کا اظہار نہ کرنا بے معنی ھے -

ان حالات میں ھمارا فرض صاف اور واضح ھے - اب ھم تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے - سکوت و سکون، بے عملی و بے اعتنائی انسانوں اور قوموں کے سب سے بڑے دشمن ھیں - بقا کے لیے جد و جہد لازم ھے - تاریخ شاھد ھے کہ قوموں نے اپنی زبان کی بقا کے لیے بڑی بڑی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلیں اور جانیں کھپادی ھیں - اگر ھم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے خواھاں ھیں تو ھمیں لگاتار کوشش اور محنت، سختیوں اور قربانیوں کے لیے تیار رھنا چاھیے - بڈھا سرسید آخر دم تک اپنی زبان کی حفاظت کے لیے لڑتا رھا - ھمین آج اسی سید احمد خانی خلوص و درد اور جوش و ھمت کی ضرورت ھے - اب سنت سید کو زندہ کرنا لازم ھوگیا ھے - اور اس کے لیے علی گڑھ سے بڑھ کر کونسا مقام ھو سکتا ھے جہاں وہ اپنی قوم کے لیے مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار لڑتا رھا اور اسی دھن میں یہیں کام کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ھو گیا - آج ھی اس کے مزار پر ھمیں اس عہد کو استوار کرنا چاھیے جب زندوں میں ایسا کوئی نہیں تو پھر اس شہید مرد کے مزار ھی سے ھمت کیوں نہ طلب کریں ؟

صاحبو ۔ آخر میں اس طول بیانی کی معافی چاہتا ہوں اگر کسی کو اس سے ملال طبع ہوا ہو تو اس الزام میں میرے ساتھ نواب صدر یار جنگ بہادر بھی شریک ہیں جن کی محبت اور شفقت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے ۔ میں اس تلخ نوائی کے لیے بھی عذر خواہ ہوں جو اس تحریر میں کہیں کہیں آ گئی ہے ۔ لیکن اس معاملے میں، میں مجبور ہوں ۔ حیدرآباد کے ایک کرم فرمانے میرے مقدمات جمع کر کے مرتب کیے اور نواب صدر یار جنگ سے ان پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی ۔ نواب صاحب اپنے اس مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "اور زور ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مقدمہ لکھتے نہیں لڑتے ہیں" مجھے اس کا اعتراف ہے ۔ میں ہمیشہ لڑتا رہا ہوں اور یہ لڑائی اب بھی جاری ہے اور جس بات کو حق سمجھتا ہوں اس کے لیے آیندہ بھی برابر لڑتا رہوں گا :

گفتند، جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد ۔ گفتند کہ برہم زن

عبدالحق

—◆◆ ◆—

ادبیات

مضامین عظمت | (تالیف محمد عظمت اللہ مرحوم) ۔ صفحات ۳۲۳
قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ مطبوعہ اسٹیم پریس حیدر آباد دکن

یہ محمد عظمت اللہ خاں مرحوم کے مضامین کا دوسرا حصہ ہے ۔ اس میں متفرق مضامین ہیں ۔ ادبی لحاظ سے سب سے اچھا مضمون خواجہ میردرد پر ہے اور بلاشبہ ادبی اور تنقیدی خوبی کے اعتبار سے قابل داد ہے ۔ باقی مضامین زیادہ تر مزاحی ہیں اور جو مزاحی نہیں وہ معمولی ہیں ۔ آخر میں « مریض وہم » فرانس کے مشہور مزاحی ڈراما نگار « مولیر » کے ایک ڈرامے کا ترجمہ ہے ، بہت خوب ترجمہ کیا ہے ۔ اس قسم کی ادبی چیزیں مرحوم کی طبیعت کے بہت ہی مناسب اور موزوں تھیں ۔ دوسرے مزاحی دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن ان کی تہ میں بعض کار آمد نکات بھی آ گئے ہیں اور یہی مضامین کے لکھنے کی غایت بھی تھی ۔

بن باسی دیوی | از اشرف صبوحی دھلوی ۔ قیمت ڈھائی رپے ۔ ناشر کتب خانہ علم و ادب ۔ دھلی

اشرف صبوحی صاحب اچھے اور نامی لکھنے والے ہیں ۔ یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی ۔ اس کتاب میں بنی آدم کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اتارا گیا ہے جب کہ وہ سنگین عہد میں سے گزرھا تھا یعنی ابھی تک لوھا وغیرہ دھاتوں سے کام لینا اسے نہیں آیا تھا ۔ پتھر کے نکیلے ٹکرے رگڑ رگڑ کر تیز کرتا اور انھی سے پیکان اور سنان کا کام لیتا ۔ انھی سے جانور مارتا چقماق سے آگ جھاڑتا اور کچّا پکا بھون بھان کر چٹ کرتا ۔ جرگوں یا قبیلوں میں

رهنا۔ ایک سردار بنا لینا اور توهمات جادو ٹونے میں مستغرق رهنا اور روحوں سے ڈرنا اور دعائیں مانگنا یہ ابجدی تہذیب اس انسان کی تھی جس کی حالت اس کتاب میں درج ھے۔ کتابت اور کاغذ وغیرہ اچھا ھے۔ اور اس مہنگائی کے زمانے میں بہت اچھا کہنا چاھیے۔ جلد اور گرد پوش پر جو تصویر ھے معلوم هوتا ھے کہ برنارڈشا کی ' بلیک گرل ' کی ستر پوشی کرکے تیر کمان اس کے ھاتھوں میں دے دیے ھیں۔ کتاب اچھی دلچسپ ھے اور زبان فصیح ھے۔

(ک)

جنت نگاہ | از مرزا فداعلی خنجر لکھنوی
۲۴۲ صفحات۔ مجلد قیمت درج نہیں

حکیم عبدالعلی فغان ایم۔اے نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا ھے۔ یہ تیئیس افسانچوں کا مجموعہ ھے۔ صاحب مقدمہ لکھتے ھیں کہ " ان کا عاشقانہ رنگ عمومیت سے پاک بلند اور ارفع ھے "۔ مگر کتاب کے دیکھنے سے معلوم هوتا ھے کہ " امرد پرستی کا عنصر " بھی جناب خنجر کی نظر غایر سے نہ بچا۔ (صفحہ ۱۶۸) " رنڈیوں کے محلّے بھی موجود ھیں۔ بعض افسانچوں کے عنوان بھی عجیب و غریب ھیں مثلاً کرائے کا ٹٹو۔ محاورہ ھے بھاڑے کا ٹٹو۔ " چاہ کند را چاہ در پیش "۔ نہ معلوم ' چاہ کن ' کی جگہ " چاہ کند " کو کیوں دی گئی۔ متن کی زبان بھی قدامت کا پتا دیتی ھے جیسے جلائے وطن (۱۶۷) ' تزویر کے دام میں ' " پل پسی کر "۔ " شوهر پرستی کے عدیم النظیر اسباق دیے تھے "۔ " خدا کے افضال سے "۔ " چند سطریں ضبط تحریر میں بھی لایا پھر کچھ سوچ کر چاک کر ڈالا "۔ " کتنا شرمناک محجوب کن حال تھا " " وہ بلو رنگ کا لفافہ پیش کرکے واپس گیا " ایک مظلوم نہا ظالم ممثلہ ریحانہ "۔ " چند تاجرون اور دولت مند طایفوں سے ان کی قصیدہ خوانی " اس قسم کی زبان اور ترکیبیں اس کتاب میں بہت ملتی ھیں۔

اردو افسانہ اب ھر لحاظ سے بہت ترقی کرگیا ھے مصنف کو اپنی ھر تصنیف بےنظیر اور بہترین معلوم هوتی ھے مگر مقدمہ نگار کو بھی یہ دیکھ لینا چاھیے تھا۔

(ک)

شمیم عشرت | سید احمد علی عشرت مرحوم رئیس گیا کا مجموعۂ کلام مرتبہ سید حسن امام صاحب حسنین منزل گیا (بہار) صفحات ۲۸۳ تقطیع ۲۰ × ۲۶ قیمت درج نہیں

حضرت عشرت اردو کے بہت اچھا کہنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی تمام زندگی ادب کی خدمت اور ادبی مشاغل میں گزری۔ ان کی ذات سے بہار کی ادبی فضا کو جو چار چاند لگے محتاج بیان نہیں، آپ کا کلام فصاحت کی جان اور مضمون آفرینی کی کان ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں وہ معنے بھر دیتے ہیں اور ایسی پیاری باتیں کہہ جاتے ہیں کہ ہر غزل کو دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر استادانہ شان نمایاں ہے اردو کی کلاسیکل شاعری میں شمیم عشرت ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

سرمایۂ خار | سوتی برہم سروپ صاحب خار میرٹھی میونسپل کمشنر کی نظموں کا مجموعہ۔ چھوٹی تقطیع صفحات ۱۴۴۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف سے کوچہ سوتیاں شہر میرٹھ کے پتے پر مل سکتا ہے۔

مجموعہ خار صاحب کی وطنی نظموں کا حامل ہے۔ آپ نے عموماً غزل اور پھر مسدس کی صنف کو پسند کیا ہے۔ عام اسقام اور پالغز سے کلام پاک ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں اس لیے اس میں اثر بھی ہے چونکہ ان کے ہاں زیادہ‌تر کام کی باتیں ہوتی ہیں ان میں تکلف اور تصنع کا دخل ناممکن ہے مجموعی طور پر سرمایۂ‌خار وطنی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ شروع میں پنڈت پیارے‌لال شرما ایم-ایل-اے مرحوم کا دیباچہ ہے جو بذات خود اس کتاب کی کافی اور معتبر سفارش اور اعتراف ہے۔ (ک-ب)

من کیستم | یعنی مرزا محمد عسکری صاحب بی-اے کی خود نوشتہ سوانح۔ چھوٹی تقطیع۔ صفحات ۱۳۶۔ مجلد قیمت درج نہیں مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

پہلے اکسٹھ صفحے مصنف نے اپنی سوانحعمری اور خاندانی حالات میں لکھے ہیں۔ پھر اپنے احباب کا تذکرہ ہے۔ آخر میں اپنی تالیفات کی فہرست دی اور ایک ضمیمے پر کتاب ختم ہوجاتی ہے۔

مرزا صاحب نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے سوانح خود قلم‌بند کردیے۔ اس سے اس زمانے کے بہت سے خیالات معلوم ہوتے ہیں جس میں سے وہ گزرے ہیں۔ چھبیس

احباب کے حالات جو دیے ہیں وہ بھی خوب ہیں۔ اس باب میں ذرا تفصیل سے کام لیا جاتا تو بہتر تھا بہ‌ہر حال کتاب دل‌چسپ ہے اور ایک نامی ادیب کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔

تفریح القلوب | جناب مولوی سید عبدالغفور صاحب شہباز مرحوم کی نظموں کا مجموعہ صفحات ۷۲ تقطیع ۲۶×۲۰ قیمت ایک روپیہ ناشر حاجی محمد عبدالقیوم تاجر کتب ۱۶ وارلی سکوایر۔ کلکتہ

شہباز مرحوم کا تعارف ادبی دنیا سے حیات بےنظیر کے ذریعے کافی ہوچکا ہے یہ کتاب ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جو محض نصابی حیثیت رکھتا ہے یہ کہنے میں تحقیر کا عنصر ہرگز نہیں، بچکانہ ادب کی ہماری زبان میں کمی ہے جسے پورا کرنا چاہیے۔ ہم خوش ہیں کہ اس مجموعے کی نوعیت ایسی ہے جیسی اوپر بیان کی گئی بعض نظمیں نہایت دل‌چسپ ہیں۔ جیسے مٹھائی کی مناجات۔ پڑھنا۔ سہیلی کا بیاہ۔ ننھے بچوں کے دانت کیوں نہیں ہوتے۔ بھنگانامہ۔ شہد کی مکھی وغیرہ۔

بہتر ہوتا اگر ان نظموں میں فارسی کسرۂ اضافت سے پرہیز رہتا اور بعض اور احتیاطیں بھی مدّنظر رہتیں۔ مثلاً بیر کی تعریف میں شعر ہے:

زرد ہیں بعض کہربا کی طرح
سرخ کچھ دست دل‌ربا کی طرح

یا ایسی ترکیبیں۔ع۔ پانو اس کا تہمتن ساں میدان میں دھنستا ہے۔ ع فتراک وہ شیروں سے ایک آن میں بھر لائے۔ یہ پرانی ترکیبیں نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔

(ک۔ ب)

سریلی بانسری | جناب سید انورحسین آرزو لکھنوی کی نظموں کا مجموعہ صفحات ۲۰۰ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ قیمت دو روپے ناشر انڈین بک‌ڈپو لکھنؤ

جناب آرزو تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو دنیا ان کو خوب جانتی اور ان کی عزت کرتی ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ غزلیں ہیں۔ ان کے سوا دو رباعیاں۔ ایک مرثیہ اور دس گیارہ صفحے نثر کے ہیں۔ جو بہ‌طور کہانی ہے۔ کل کتاب کی زبان جسے نکھار

اردو کہتے ہیں۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر فارسی۔ عربی الفاظ سے محروم ہے۔ جناب آرزو کو ایسی زبان لکھنے میں کمال ہے۔ ان کی ایسی بہت سی متفرق غزلیں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی زبان کوئی لکھنے بیٹھے تو جد و جہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور جہاں اس کا دخل عمل ہوا تو روانی اور آمد کا نام لیناہی فضول ہے۔ چناں‌چہ ایسی زبان میں مشّاقی کے باوجود آرزو صاحب کو رک رک کر بولنا پڑا ہے۔ فارسی وغیرہ سے بچنے کے لیے محاوروں میں تصرف بھی ہوا جو معیوب ہے۔ اور ایسے لفظ بھی کلام میں جگہ پا گئے جو دہات میں ہی سنے نہیں جاتے۔ اس سے یہ بانسری کہیں کہیں بے سری ہوگئی:

جی میں اجاتی ہے جدھر سے برائی
وہ بھی ایک سانپ کا بلسوکا ہے (۱۰۴)
سنتے سنتے وہ ایسی کہہ بیٹھے
نہ چلی ایک تھک کے وہ بیٹھے (۱۲۲)
بےکلی جی کی کیسے دیتی ہے جانگر ڈھیلے (۱۲۳)
جو گھاؤ نہ بن جائے یہ چیٹ نہیں ایسی (۱۶۸)
بھد تو لے چاہت کا بس چانا ہوا (۲۲)

ایسی بہت سی مثالیں نامانوس الفاظ کی اس مجموعے میں موجود ہیں۔
محاورے میں تصرف بھی کیا گیا ہے فرمایا ہے:—

بڑھتے بڑھتے جی کی بے آسی کہاں تک آ گئی (۷۹)

بےآسی کی جگہ نراسی لکھدیتے تو مضایقہ نہ تھا۔ یہی حال اس کا ہے:

ہیں دیس بدیس ایک گزر اور بسر میں (۵۴)

ایک جگہ فرمایا ہے:—

رت پلٹنے کا پتا دیتی ہے ہر کھلتی کلی
ہاں چلو چاہت کے متوالو! سہالک آ گئی (۸۹)

اور قافیے میں تک۔ جھک وغیرہ

ہمارے علم میں سہالک کوئی لفظ نہیں۔ یہ سہالگ میں تصرف کیا گیا۔

آرزو صاحب کی قادرالکلامی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ایسے کلام اردو کے دامن کی وسعت اور اس کی ہمہ گیری پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ضرور پبلک کے نظر افروز ہونے چاہئیں۔

(ک ب)

گنج ہائے گرانمایہ۔ از حضرت رشید احمد صدیقی۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ اردو بک ایجنسی علی گڈھ۔

یہ مولانا محمد علی رح، ڈاکٹر انصاری، سید سلیمان اشرف مرحوم، ابوبکر محمد شعیب فاروقی مرحوم، اصغر گونڈوی، ایوب عباسی، ڈاکٹر اقبال اور مولانا احسن، مارہروی کی خانگی زندگی کے چند مناظر ہیں—ان کی سیرتوں کے چند نا تمام خاکے ہیں۔ اردو ادب کے طالب علموں کو یہ کتاب اس حد تک مدد دیگی کہ وہ اپنے محبوب ادیبوں کی زندگی کی چند جھلکیاں دیکھ لیں۔

کتاب کا نام اچھا نہیں۔ یہ اس لیے کہ خیال فوراً افریقہ کی کانوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ کتاب کا نام دیباچہ ہوتا ہے، کتنا یہ نہیں——اور بعض اچھی کتابیں بھی نام کے مبہم ہونے کی وجہ سے چرائی تک نہیں جاتیں۔

(ع ت)

اسلامیات

معارف القران جلد اول: اللہ

رسالہ طلوع اسلام کے مدیر شہیر جناب غلام احمد صاحب پرویز کا یہ ایک علمی اور اسلامی کارنامہ ہے جو بڑی تقطیع کے ۶۲۰ صفحات پر باریک و روشن خط میں بڑی خوبی سے طبع ہوا اور نفیس جلد میں مجلّد دبیز کاغذی غلاف میں محفوظ کر کے ارباب ذوق کے ہاتھوں تک پہنچایا گیا ہے۔

مگر یہ جمال ظاہری بھی کمال معنوی کے سامنے بے قدر ہے۔ کیوں کہ اول تو یہ تفسیر ہے اس پاک اور مبارک قانون کی جو انس وجان کے لیے رحمت و شفا کا دائمی پیغام ہے۔ اور پھر بفحوائے کریمہ:—

ان علینا جمعه و قرآنه ثم ان علینا بیانه

تفسیر قرآن بالقرآن کے محکم اصول پر اسے مدون کیا گیا ہے۔ شروع میں مولانا اسلم صاحب جیراج پوری نے پر مغز مقدمہ لکھا ہے۔ اوراب تک جو تفسیرین تالیف کی گئیں۔ ان کی اجمالی تاریخ کے ساتھ اصولی اسقام پر نظر ڈالی ہے۔ مولانا کا سب سے پہلا اعتراض یہ ہے۔ کہ آج تک ہمارے مفسّرین نے قرآن مجید کی تشریح کے کوئی خاص اصول مرتب نہیں کیے لہذا تفاسیر میں طرح طرح کی افراط و تفریط ہوگئی ہے۔ لیکن آگے چل کر خود مولانا نے جو اصول تفسیر بیان کیے ہیں، ان میں بھی ہمارے نزدیک توضیح و بحث کی کافی گنجایش پائی جاتی ہے۔ ان کی ہمہ گیر تنقید کا بھی غالباً یہ مطلب نہیں ہے۔ پہلے مفسر تفسیر بالقران کی بدیہی حکمت و ضرورت سے بالکل ناواقف تھے یا انھوں نے اس اصول کے مطابق کوئی عمل نہیں کیا۔

مولانا نے بجاطور پر یہ حقیقت باربار سمجھائی ہے کہ "جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ عہد صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا، اور اب ہم کو انھی کے فہم پر قناعت کرلینا چاہیے وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں"۔ عملی لحاظ سے صحابۂ کرام رض کی افضیلت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن "قرآن کسی مخصوص ماحول کی کتاب نہیں ہے۔" بلکہ ہر زمانے میں نئی روشنی اس سے نکالی جاسکتی ہے۔" علاوہ برایں اس باب میں صحابہ کی جو روایات ہم تک آئی ہیں ان کے ذرائع اس قدر غیر یقینی ہیں کہ "قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار ان کے اوپر رکھنا اس کی قطعیت کو کھو دینا ہے"

اس سلسلے میں مولانا نے ایک نکتہ یہ بیان کیا ہے۔ کہ "جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائےگا اسی قدر وہ قرآنی تفصیلات سمجھنے کے زیادہ قبل ہوگا۔ اگر فہم معانی میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ .... اس لیے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائق فطرت کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لیے ایک خاص شعبے کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کرلیتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل جو ان کے علم سے تعلق رکھتی ہیں، اپنے ذمے لیں اور ان پر علمی بصیرت کے ساتھ غور و فکر کریں......... لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا"۔ فاضل مولف تفسیر نے بھی اپنے تعارف میں اس پہلو پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کے ہرچند قرآن مجید کسی تاریخ و جغرافیہ، ہیآت و طبیعیات کی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں اجمالی طور پر بہت سے علوم و فنون کا ضمنی تذکرہ آتا ہے اور ان جزیات کی صحیح تفسیر وہی لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو ان علوم کے ماہر ہوں۔ اس اعتبار سے تفسیر قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں ہے بلکہ ایسی اجتماعی کوشش کا طالب ہے جس میں "ماہرین فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لے کر اس پر عمریں صرف کردیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج آگے منتقل کرتی چلی جائیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے حتی کہ قرآن کریم کی متشابہ آیات محکمات کی ذیل میں آتی جائیں اور انسان علی وجہ البصیرت پکار اٹھے کہ ذالک الکتاب لاریب فیہ........."

فاضل مولف نے اس تفسیر میں اہتمام یہ کیا ہے کہ ہر موضوع پر قرآن مجید کی جملہ آیات کریمہ جو اس مضمون سے متعلق ہیں، یکجا کردی ہیں اور اپنی تصریحی عبارات کے ساتھ تفسیر بالقرآن کا عملی نمونہ قارئیں کے سامنے پیش کیا ہے۔ البتہ اپنی تصریحات میں ان شکوک و شبہات کو بھی دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو نوجوانوں کے ذہن میں مغربی تعلیم کے اثر سے آج کل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہادی مطلق ان کی یہ سعی مشکور فرمائیے لیکن جیسا کہ اب مغرب کے عقل پرست مفکر بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، مذہب کی وجدانی صداقتوں کو عقل سے جانچنا ایسا ہے جیسے کوئی گز لے کر انسان کی شجاعت و فیاضی کی پیمایش کرنے لگے

عقل سلیم مذہب کے عقائد و احکام کی تجربے کے بعد تصدیق تو کرسکتی ہے لیکن قوانین آلٰہی کی حقیقت کو پہنچنا عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ علم کی سیڑھی پر اوپر چڑھ سکتی ہے۔ اور انسانی علوم جیسے پہلے محدود و ناقص تھے، ہزار وسعت و ترقی کے بعد بھی محدود و ناقص ہی رہیں گے۔

بہر حال، پرویز صاحب نے عہد حاضر کی زبان میں قرآن مجید کو سمجھانے کی جو کوشش کی ہے وہ ہمارے لیے احسان مندی اور صاحب قرآن عزاسمہ کی نظر میں انشاء اللہ استحسان کا موجب ہوگی۔ اس طریق تفسیر میں مضامین کی تقسیم و تبویب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم نے اپنے مترجم قرآن کے ایک نسخے میں عقائد و احکام وغیرہ کے ابواب قائم کر کے تمام آیات متعلقہ کو جمع کر دیا تھا لیکن پرویز صاحب نے اپنی تفسیر میں بہت محنت اور زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے اور مضامین کی بطور خود تقسیم کی ہے۔ چناں‌چہ اس پہلی جلد میں ۲۸ ابواب کے عنوان حسب ذیل ہیں: الہ۔ اللہ۔ (توحید۔ صمدیت) خالقیت۔ امر۔ ابوبیت۔ رزاقیت۔ رحمت۔ انعام۔ فضل۔ احسان۔ عتاب۔ لعنت۔ قہار۔ علم۔ قدرت۔ عرش و کرسی۔ ملکوت۔ احیا و اماتت۔ مشیت۔ (مصائب۔ رزق۔ اقوام عالم کا عروج و زوال۔ موت۔ تخلیق۔ ہدایت و ضلالت) دعا۔ نصرت۔ توکل۔ درمنشور۔ (متفرق صفات الٰہی)۔ پیرایۂ مجاز۔ ذالکم اللہ۔

بےشبہ ان کو اختیار ہے کہ سہولت تفہیم کی غرض سے وہ جو ترتیب بہتر و مناسب سمجھیں، اس کے مطابق عنوان مرتب فرمائیں۔ لیکن انھوں نے اپنی تفسیر کے پانچ حصّے تجویز کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے اور یہی مناسب بھی ہے کہ عام طور پر جو ترتیب رائج رہی اس کو بلا ضرورت تبدیل نہ کیا جائے۔ یعنی ذات و صفات الٰہی۔ رسالت۔ عقائد۔ احکام۔ قصص انبیا علیہم السلام۔ عالم آخرت۔ حتی‌الامکان عنوانات اس طرح قائم کیے جائیں کہ ایک ہی مضمون اور متعلقہ آیات کا بار بار اعادہ نہ ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر عنوان ایک مستقل بحث کی صورت میں پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ عنوانات کی ترتیب بے شبہ جامع ہونی چاہیے لیکن لازم نہیں کہ ان کی تعداد زیادہ ہو۔ اسی طرح کسی عنوان کی جملہ آیات متعلقہ ایک جگہ لانے میں یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی ترتیب سے پیش کی جائیں جس ترتیب

سے اب قرآن مجید میں واقع ہوئی ہیں ورنہ ممکن ہے پرویز صاحب کا اصل مقصد تفسیر دلنشیں طریق پر پورا نہ ہو۔

بہرحال ہم پروفیسر صاحب کو اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان کی تفسیر کے مفید و مقبول عام ہونے کے آرزومند ہیں۔ زیرنظر کتاب پر قیمت درج نہیں ہے۔ دفتر رسالہ طلوع اسلام دہلی سے درخواست کرنے پر مل سکے گی۔

تفسیر پارہ الم | مرتبہ ادارۂ دارالاسلام (ڈاک خانہ جمال‌پور پٹھان کوٹ۔ پنجاب) قیمت ۱۰ آنے

یہ قرآن مجید کی ایک اور نئی تفسیر ہے جسے ادارۂ دارالاسلام سے بالاجزا شائع کیا جارہا ہے۔ پارہ عم کی تفسیر پہلے چھپی تھی اور بعض ارباب علم نے اسے پسند کیا۔ اب الم کی تفسیر شائع ہوئی ہے اس میں ہر لفظ کے معنی الگ الگ لکھکر دوبارہ اردو محاورے کے مطابق ترجمہ دیا ہے اور پھر مختصر مگر ضروری باتیں بطور تفسیر کے درج کردی ہیں بیان کا پیرایہ صاف اور دل‌نشیں ہے۔ طلبہ اور عام قارئین کے واسطے ضرور مفید ہوگی۔

مسلمانوں کی دیہی تنظیم | اس چھوٹی سی کتاب میں تنظیم صلواۃ و زکواۃ اور نظام‌نامہ تحریک سیرت کے نام سے تین رسالے یکجا چھپے ہیں۔ پٹی ضلع لاہور کی تحریک سیرت کافی شہرت حاصل کرچکی ہے اور اب بانیان تحریک اسے ایک باقاعدہ کل‌ہند نظام کی شکل میں منظم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مقاصد نیک اور کوشش قابل تعریف ہے۔ وہ مسلمانوں میں انجمن سازی کے شوق کو جو مغرب کی تقلید سے پیدا ہوا ہے پسند نہیں کرتے لیکن خود ایک نئی انجمن کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں اگرچہ یہ خالص مذہبی قسم کی تنظیم ہوگی اور اس کے مقامی مرکز محلے کی مسجد کو بنایا جائےگا۔ فاضل مدبر نے اس سلسلے میں ایمۂ مساجد کے مخلص و باعمل عالم ہونے پر بہت زور دیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ خود اس قسم کے امام تیار کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیں تو آیندہ ان کے حسب

مراد، مساجد کی تنظیم کی مشکل بھی حل ہوسکتی ہے ۔ کتاب کی قیمت ۳ آنے ہے اور دفتر تحریک، سیرت، پٹی لاہور کے پتے سے دستیاب ہوسکے گی۔

خلافت راشدہ تالیف قاضی زین العابدین صاحب رفیق ندوۃ المصنفین ۔ قرول باغ دہلی

اس موضوع پر اردو میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں چھپی ہیں لیکن یہ ایک متوسط درجے کی کتاب ہے جس میں خلافت راشدہ کے ضروری تاریخی واقعات بہت اعتدال اور سلیقے سے جمع کیے گئے ہیں ۔ یہ سلسلہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ طلبہ اور عام قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مقدمہ کتاب اور آخر میں بعض اصولی مباحث آ گئے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یا ان کو چھیڑا نہ جاتا اور یا زیادہ شرح و بسط سے بحث کی جاتی ۔ ان کے بیان میں بھی مولویانہ تحریر کا رنگ غالب ہے مگر متن کتاب کی عبارت نسبۃ صاف اور واضح ہے ۔ کتاب کی تقطیع چھوٹی صفحات ۴۳۲ اور مجلد کی قیمت ۳ روپے ہے ۔

متفرقات

Muslim Monuments of Ahmadabad مولفہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب ۔ صفحات ۱۱۰ ۔ ناشر : دکن کالج ریسرچ اسٹی ٹیوٹ پونا۔ قیمت ساڑھے سات روپے جو کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے زائد ہے ۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب تحقیق و تدقیق کے میدان میں نئے نہیں ۔ تاریخ ان کا خاص مضمون ہے اور اس میں وہ کافی مفید اور کار آمد ریسرچ کرچکے ہیں ۔

زیر نظر کتاب انگریزی میں ہے اور اس کے لکھنے سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد گجرات (صوبۂ بمبئی) کے عہد وسطیٰ کے تاریخی مطالعہ کے لیے کچھ نئی راہیں کھولنا ہے ۔ گجرات میں مسلمانوں کا آرٹ، کلچر اور فن تعمیر اپنی نوعیت اور ندرت کے

لحاظ سے ایک خاص جگہ رکھتا ھے۔ھماری نہ صرف بدقسمتی بلکہ بڑی کوتاھی اور تغافل تھا کہ گجرات کی اسلامی تاریخ کی طرف کسی نے توجہ نہ کی تھوڑا بہت جو کچھ لکھا وہ مغربی محققین نے اور وہ جو کام اس سلسلے میں کرگئے ھیں اس کی اھمیت سے کسی کو انکار کی جرات نہیں ھوسکتی ۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنے خطبے «یاد ایام» میں اس طرف توجہ دلائی جو سنہ ۱۹۱۹ع میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے اجلاس سورت میں پڑھا گیا۔ اس کے تقریباً بیس برس بعد مشہور پارسی مورخ خان بہادر م۔س کمپاریٹ نے انگریزی میں گجرات کی قابل‌قدر تاریخ شائع کی۔ تاھم گجرات کے مسلم تہذیب و تمدن اور فنون کے متعلق ھمیں ابھی بہت کچھ جاننا ھے اور ھمیں ڈاکٹر چغتائی کا ممنون ھونا چاھیے کہ انھوں نے اس زینے پر ھمیں ایک سیڑھی اور اوپر چڑھا دیا ھے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے احمدآباد (گجرات) کے مآثر قدیمہ سے انسٹھ کتبات منتخب کرکے ان کا اصل متن اور اس پر اپنے تشریحی نوٹ قلم‌بند کیے ھیں۔ ان مآثر قدیمہ میں زیادہ تعداد مساجد کی ھے اور ان پر جو کتبات درج ھیں ان کی تاریخوں سے پتا چلتا ھے کہ ان کا زمانۂ تعمیر سنہ ۴۴۵ ھجری سے سنہ ۱۲۰۰ ھجری تک ھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور عرق‌ریزی سے ان کتبات کے نقوش لےکر ان کا غائر مطالعہ کیا ھے اور اپنے سائنٹفک طرز تحقیق و مطالعہ کے باعث اپنے پیشرو محققین سے ایک قدم آگے بڑھ گئے ھیں۔ ان کتبات کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ ان کے کندہ کرنے والوں کے نام دائم و قائم ھوگئے اور صحیح تاریخیں محفوظ ھوگئیں بلکہ ان سے اس زمانے کے علم‌خط اور خوش‌نویسی کی مختلف طرزوں پر بھی روشنی پڑتی ھے۔ سب سے بڑا اور خاص کام جو مطالعۂ تاریخ میں ان سے لیا جاسکتا ھے وہ یہ کہ ان کتبوں سے بعض ایسے واقعات کا انکشاف ھوتا ھے جنھیں مورخوں نے یا تو قطعا نظر انداز کردیا ھے اور یا ان کے بیان کرنے میں غلط ذرائع سے استفادہ کیا ھے جس کے نتیجے میں اصل واقعہ اکثر مسخ ھوکر رہ جاتا ھے ۔ مثلاً ایک کتبے میں درج ھے کہ سنہ ۸۷۴ ھجری (مطابق سنہ ۱۴۶۹ع) میں سلطان محمود بگڈا کے خواجہ سرا خواص‌الملک نے جو سلطان کے حرم کا مہتمم تھا قطب عالم میں ایک بڑی شاندار مسجد بنوائی ۔ تواریخ میں اس واقعے کا کہیں ذکر نہیں۔

کتاب کے آخر میں آرٹ پیپر کے ۱۸ صفحات پر چھیالیس کتبات کی عکسی تصاویر چھاپی گئی ہیں جنھوں نے کتاب کو زیادہ دل‌کش اور کار آمد بنا دیا ہے۔

گجرات کی اسلامی تاریخ سے دل‌چسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ دل‌چسپی اور فایدے سے خالی نہ ہوگا۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہمارے محققین اس قسم کی تحقیقات کرتے وقت اپنی زبان کو نہ بھولتے اور اگر اصل کتاب نہیں تو کم از کم اس کا ترجمہ ہی اردو میں شائع کردیتے۔ (خ)

ریحان نستعلیق علم‌خط کے بیان میں ۲۸ صفحے کا یہ چھوٹا سا رسالہ جو سنہ ۹۸۹ ہجری میں لکھا گیا تھا ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی محنت اور کوشش سے دکن کالج ریسرچ انسٹی‌ٹیوٹ پونا سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سنہ ۱۹۳۶ع میں ایک ایسا ہی رسالہ «حالات ہنروراں» کے نام سے شائع کرچکے ہیں یہ سنہ ۹۵۲ ہجری کی تالیف تھا۔ زیرنظر رسالے کا مسودہ ان کو اکتوبر سنہ ۳۲ میں آکسفرڈ کی بوڈلین لائبریری کے مسودات میں ملا۔ اس مسودے سے مصنف کے نام کا کہیں پتا نہیں چلتا لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحقیق سے قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مصنف کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس چھوٹے سے رسالے میں نہ صرف خوش‌نویسی کی مختلف طرزوں کا بیان ہے بلکہ تقریباً ایک سو ایک مشہور خوش‌نویسوں کا ذکر آگیا ہے۔ مصنف نے زیادہ‌تر شاہ‌طہماسپ اول کے عہد تک ایران کے خوش‌نویسوں اور طرزہائے تحریر کا تذکرہ کیا ہے۔

علم‌خط سے دل‌چسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس چھوٹے سے رسالے میں دل‌چسپی اور معلومات کا کافی سامان موجود ہے۔ کاغذ اور طباعت نفیس لیکن کتابت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ مرتب سے آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔ (خ)

بھید (برنارڈشا کے ڈرامے «کینڈڈا» کا ترجمہ) از نورالحسن ہاشمی ایم۔اے (علیگ) قیمت دس آنے۔ غالباً مکتبۂ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ ناشر کا نام درج نہیں۔

یہ برنارڈشا کے ایک لطیف اور دل‌چسپ ڈرامے کا ترجمہ ہے

برنارڈشا کے مقصدی ڈرامے اکثر اوقات کچھ « خشک » ہوجاتے ہیں — لیکن یہ بھی ایک مقصدی ڈرامہ ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس کشش اور دلکشی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کردارنگاری چینی مصوری کی طرح نازک اور نمایاں ہے۔

ڈرامے کا بنیادی خیال اشتراکی نقطۂ نظر سے ازدواجی زندگی پر بحث کرنا ہے اور ضمناً یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ایک پادری نئے خیالات سے کہاں تک اور کس حد تک متاثر ہوتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ پادری ماریل جو اشتراکی عقائد رکھتا تھا اور رہنماؤں کی سی زندگی بسر کرتا تھا، اپنی بیوی کے حقوق سے غافل ہوگیا۔ اس کی بیوی بہت خوب‌صورت تھی اور پادری بھی اسے بےحد چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ سفر سے واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک شرمیلا شاعر لڑکا یوجین تھا۔ یوجین کو پادری کی بیوی کینڈڈا سے عشق تھا اور ایک دن اس نے صاف صاف اس کا اظہار بھی کردیا۔ پادری اور یوجین میں بالآخر یہ طے پایا کہ کینڈڈا دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بتانا کچھ زیادتی ہے۔

ترجمہ سلیس اور الفاظ کے استعمال میں جذبات اور رجحانات کا خیال رکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں بعض جملے اردو روزمرہ کے خلاف بھی نظر آتے ہیں۔ صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے۔ « میں آپ سے تہ‌دل سے اپنے خراب خیالات کی معافی چاہتا ہوں »۔

صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے۔ « بہت بدمزگی اور معمولی طریقے سے کرسی میں بیٹھتے ہوئے »۔ اور صفحہ ۲۰۶ پر (کمبل پر اکڑوں بہت ہی مضحک بےڈھنگے پن سے بیٹھے ماریل کی طرح نہایت مطمئن بلکہ ہونٹوں پر شرارت کھیلتی ہوئی)۔

(ع۔ت)

نئے رسالے اور سالنامے

نظام ادب مدیر: پروفیسر آغا حیدر حسن ۔ شائع کردہ طلبائے نظام کالج قیمت درج نہیں ۔

یہ طلبۂ نظام کالج کا شش‌ماہی رسالہ ہے ۔ صورت اچھی ہے اور سیرت بھی!

پروفیسر حیدر حسن کا مضمون ‹‹سلطان عبداللہ قطب‌شاہ کے گیت›› ایک نیک فال ہے ۔ ہندستان کی صحیح تہذیب و معاشرت، ہندستانی طرز فکر اور جذبات کے صحیح اور موزوں پیمانے گیتوں میں ملتے ہیں ۔

زبان کی فطنت (Genious) کا اندازہ گیتوں سے ہوتا ہے، اسی لیے ہر زبان میں گیتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔

اگر حیدر حسن صاحب جیسے سرگرم لوگ اس طرف متوجہ ہوں تو اردو ادب کی خلیج بھی پاٹ دی جائے گی ۔

محترمہ عاصمہ رحمن کا ہلکا پھلکا مضمون (Light Essay) ‹‹اور کچھ سنائیے›› بہت خوب ہے ۔ مضموں، عبارت کے بانکپن اور مشاہدات کی رنگارنگی کی وجہ سے دل‌کش ہوگیا ہے لیکن اس میں کام کی باتیں کم ہیں ۔

ہلکے پھلکے مضمون میں مرکب جملے نہیں ہوتے — چھوٹے چھوٹے جملے ۔ شملے کی ناخوں کی طرح گداز ہوتے ہیں، جو منھ میں ڈالتے ہی گھل جاتی ہیں مضمون کا مقصد ‹‹انبساط›› ہوتا ہے اور ضمنی طور پر کچھ کام کی باتیں ۔

اسرائیل احمد صاحب مینائی نے تیرہ انشاء پردازوں کے خطوط پیش کیے ہیں جو انھیں تین سوالات کے جواب میں بھیجے گئے تھے ۔ سوالات یہ ہیں :— (۱) اردو زبان میں آپ کی عزیز کتابیں کون سی ہیں (۲) اگر آپ مصنف ہیں تو آپ کی مرغوب ترین تصنیف کون سی ہے؟ (۳) اردو کے نثار و نقاد انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ۔ اس مختصر فہرست میں آپ کو علی قدر مراتب سب سے زیادہ کون پسند ہیں؟

یہ جدّت قابل داد ہے اور بہت مفید بھی، کہ بہت کم محنت میں خاصے طول طویل مضمون کا سرمایہ ہاتھ آ گیا۔

یہ طلبہ کا رسالہ ہے اور بہ حیثیت مجموعی خوب ہے۔ اگر رسالے کے کارفرماؤں نے توجہ کی تو ترقی کی کافی گنجایش ہے۔

(ع۔ت)

مشہور (سالنامہ سنہ ۱۹۴۳ع) ایڈیٹر: حکیم محمد تقی صاحب۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ضخامت ۲۱۸ صفحات۔

مشہور کا دہلی کے اچھے رسالوں میں شمار ہے۔ لکھنے والوں میں اردو کے مشہور انشاء پردازوں کے نام نظر آتے ہیں۔

سالنامہ بہت خوب صورتی سے شائع ہوا ہے اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔

عالم گیر (سالنامہ سنہ ۱۹۴۲ع) ایڈیٹر: حافظ محمد عالم۔ قیمت بارہ آنے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات۔

مجموعی طور پر سالنامہ بہت خوب ہے۔

شفیق الرحمن صاحب کا افسانوی مضمون "بیزاری" پڑھنے کے لائق ہے۔ لکھنے والوں میں ملک کے نامور انشا پردازوں کے نام نظر آتے ہیں۔ پروفیسر علم الدین سالک، احمد ندیم قاسمی، عطاءاللہ پالوی، سیماب اکبر آبادی اور امجد حیدر آبادی وغیرہ۔

(ع۔ت)

Vol. 23 JANUARY & APRIL 1943 No. 89, 90

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by
ABDUL HAQ

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.

جلد ۲۳ جولائی ۴۳ء نمبر ۹۱

اُردُو

انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

۱ ۔ یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے ۔

۲ ۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے ۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔

۳ ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے ۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۔

۴ ۔ مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۰، دریا گنج ۔ دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے ۔

اُردُو

جلد ۲۳ | جولائی سنہ ۱۹۴۳ع | نمبر ۹۱

انجمن ترقی اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقامِ اشاعت:— دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی‌ماران دہلی میں چھپوا کر
دور انجمن ترقئی اردو (ہند) دہلی سے شایع کیا۔

اُردو

جلد ۲۳ جولائی سنہ ۱۹۴۳ع نمبر ۹۱

فہرست مضامین

ادب میں نئے رجحانات

(از علامہ پنڈت دتاتریہ صاحب کیفی)

[مرادآباد میں ایک مشاعرہ اور ادبی جلسہ گزشتہ ماہ مئی میں منعقد ہوا تھا۔ اسی موقع پر جناب کیفی نے ذیل کا مقالہ پڑھا، جو حسن اختصار کے باوجود ایسی عالمانہ جامعیت رکھتا ہے کہ ہمیں یقین ہے اہل نظر اسے نہایت دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں گے۔ مدیر اردو]

دنیا ہمیشہ بدلی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ اگرچہ سورج اب بھی مشرق سے نکلتا ہے، اور مغرب میں جاکر چھپ جاتا ہے، اگرچہ گنگا اب بھی پورب کو بہتی ہے، اور اٹک پچھم کا رخ پسند کرتا ہے، لیکن موسموں میں اگلے زمانے کے مقابلے میں فرق آجانا بدیہی صداقت ہے، اسی طرح گنگا اور اٹک کی چال میں بھی بے شک فرق آگیا ہے، اگرچہ ان کے رستے وہی پرانے ہیں۔

طبیعیات کی طرح ذہنیات بھی تغیر پزیر ہیں، اور اسی سے معاشرت میں انقلاب پیدا ہوتا ہے، معاشرت ہی کو میں مبادی قائم کرکے آج کے موضوع کی وضاحت کروں گا۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں جو انقلاب ہماری معاشرت اور اس کے تمام شعبوں میں ہوا ہے، تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی، اور ہر متمدن قوم کا ادب چونکہ معاشرت کا نہایت اہم شعبہ ہے، ناممکن تھا کہ ان انقلابی عوارض سے متاثر نہ ہوتا جو اب تک ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ماحول بنانے میں مصروف ہیں۔

تفصیل کی بحر طویل سے الگ ہوکر کسی شخص کو کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ ہماری معاشرت اب وہ نہیں رہی جو پچاس ساٹھ برس پہلے تھی جب امر واقعہ یہ ہے تو پھر ادب کے انقلابات کو گرم آنکھ سے دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟

قدامت پرست اور جدت پرست ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں، اور ہمیشہ رہیں گے، یہ چاہنا کہ ایک خاص کام جس طرح آج ہو رہا ہے، ازل سے اسی طرح

ہوتا رہا ہے، اور ابد تک اسی طرح ہوتے رہنا چاہیے شیخ چلّی کی چاہ سے کم نہیں ایسا تو ہوا ہے، نہ ہوسکےگا۔

اگر آپ اردو شاعری ہی پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ زبان اور محاورے سے قطع نظر تخیل کا طرز، ادا، اور اسلوب اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے وہ نہ تھا، جو ڈیڑھ دو سو برس پہلے تھا، شاہ گلشن نے ولی کو کیا مشورہ دیا؟ حاتم نے کیوں اپنے دیوان سے دیوانزادہ اخذ کیا؟ ناسخ نے کیوں اپنے تخلص کو اسم بامسمیٰ ثابت کیا؟ غالب نے کیوں طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کی ٹھانی؟ اور داغ نے کیوں اعلان کیا:—

کہتے ہیں اسے زبان اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

یہ واقعات جتنے زبان اور اسلوب سے متعلق ہیں قریباً اتنے ہی تخیّل شاعری سے متعلق ہیں، اگر اس میں کسی کو کلام ہو تو میں کہوں گا کہ میر اور سودا، مصحفی اور جرات، منشی جوہر اور شیفتہ اور داغ و امیر کے دیوانوں کا موازنہ کرکے دیکھ لیں، ایک دوسرے سے ہر امر میں جدا ہی ملےگا، اور انشا کی تو دنیائے شاعری ہی ادب کے سارے جہاں سے جداگانہ ہے، صاف الفاظ میں یہ کیوں نہ کہوں کہ اردو ادب میں قدامت سے بغاوت ہوتی آئی ہے، پہلی بغاوت کے علمبرادر شاہ گلشن، اور شاہ حاتم تھے، دوسری بغاوت کا جھنڈا جرات نے واقعہ پردازی اور معاملہ بندی کا نعرہ لگا کر بلند کیا ناسخ کی بغاوت ادب کے فنّی لباس تک محدود رہی، لیکن اس کے مقلّد یہاں تک آزادی پسند تھے کہ قافیے کی بنا صرف صوت پر رکھنے لگے[۱] داغ نے جرات اور جوہر کے اجتہاد کو تازہ کیا، مگر اس کی بغاوت آئینی حدود کے اندر ہی رہی۔

سب سے بڑی بغاوت قدامت کے خلاف وہ ہے جو لکھنؤ میں ہنگامہ آرا ہوئی، یہ بیان ذرا تفصیل چاہتا ہے جب ہم غزل کی چٹنی تیار کرنے بیٹھے تو بارہ مسالے جو ہم نے اس کے لیے پیس چھان کر رکھّے ان میں ایک بھی دیسی نہ تھا، معشوق کا تلوار کھینچے ہوئے مقتل میں آنا اور عاشقوں کی گردن اڑانا، خنجر اور کٹار کے وار کرنا، گھوڑے پر سوار ہوکر عاشق بسمل کو روند ڈالنا، اور ایسی بیہودگیاں کل تک ہمارے مشاعروں میں داد لیتی تھیں۔

---

۱ ملاحظہ ہو معایب سخن۔ مولفہ مولانا حسرت موہانی۔ صفحہ ۵۵

ہاں تو میں ذکر کررہا تھا لکھنؤ کی اہم بغاوت کا، ان کو یہ مردانہ عشق پسند نہ آیا، انھوں نے اس کا علاج یہ کیا کہ زنانہ پوشاک، اور دوسرے جنسی لوازمات کا تذکرہ غزل میں داخل کیا، اس طرح انھوں نے ایک بہت بڑا عیب ہماری شاعری کا دور کیا، لیکن ان کا فعل اصلاحی تھا، انقلابی نہ تھا، کاش وہ فعل کے صیغوں کی تذکیر کو بھی بدل دیتے، مگر لکھنؤ کے دل میں اپنے استادوں کی عزت تھی اس لیے رک گئے اکثر کم بیں نقاد لکھنؤ اسکول کی شاعری کو انگیا کرتی، کنگھی چوٹی کی شاعری کے طنزآمیز کلمے سے یاد کرتے ہیں، لکھنؤ کی دفاعی کوشش بدنام ہوئی، افسوس ہے، کہ کسی نے اس بغاوت کی علت غائی پر نظر نہ ڈالی، خیر اس بدعنوانی کو میں ایک اور جگہ واضح کرچکا ہوں[1] ۔

میں یہ کہ رہا تھا کہ اردو شاعری میں ہمیشہ انقلاب آتے رہے ہیں اور بغاوتیں ہوتی رہی ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت میں آپ مجھ سے متفق ہیں۔

ایک اور جدید بغاوت کا ذکر رہا جاتا ہے جو سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد شروع ہوئی اور جس کے علم کی پرچم کشائی محمدحسین آزاد نے سنہ ۱۸۷۴ع میں کی اور پھر حالی نے اسے آسنبھالا، یہ بغاوت اگلی تمام بغاوتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر نتیجہ‌خیز اور عالم‌گیر تھی، قدامت‌پرستی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے جو بن پڑا کیا، کہیے جو نہ کرنا تھا وہ بھی کیا، لیکن اسے ہارھی ماننی پڑی، کیوں‌کہ وہ بغاوت حقیقی اور اصولی تھی، اس کے علم‌بردار حقائق اور واقعات سے متاثر تھے، اس کی تحریک میں تشخّص یا تخریب نہیں بلکہ اصلاح اور تجدید کارفرما تھی، آزاد کا اجتہاد کسی نظریے پر مبنی نہ تھا، حالی کی معرکہ آرائی ذاتی پسند سے ملوث نہ تھی ان کا فعل تعمیری بلکہ نوتعمیری تھا، ان کے ذہن سے شک اور تذبذب منزلوں دور تھا۔

آزاد کو شکایت تھی کہ وطن کے وہ نوجوان جنھوں نے مغربی علم و ادب کی روشنی پائی ہے کیوں اردو سے بےپروا ہیں، وہ ان کے التفات کی محتاج ہے۔ سرعبدالقادر کے ابتدائی زمانے تک قوم کی انگریزی‌خواں جماعت اسی طرح اردو سے بےرخ رہی، اب اس کا ردّ عمل ہوا اور اس شدّت سے ہوا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

۱۔ میری کتاب منشورات میں ملاحظہ ہو لکھو «متروکات»۔

پچھلے پچیس تیس برس میں ہماری معاشرت میں جو انقلاب ہوا، وہ اس انقلاب سے بہت شدید اور ہمہ گیر ہے جو اس سے پہلے کے بیس پچیس برسوں میں ہوا تھا، یہ منتہا ہے، اس انقلاب کا جو سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا تھا، اب ہمارا ہر فعل ،حریت تخیل، کے تابع ہے، اب سند پر استدلال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سمجھیے کہ میں نے سب کچھ کہہ دیا جب یہ کہہ دیا کہ اب پبلک جلسے اس خطابی کلام سے شروع ہوتے ہیں:—

«محترم خواتین اور معزز حاضرین!»

بس اس میں سب کچھ آگیا اب تفصیل طول فضول ہے۔

انصرام اور اہتمام کے ساتھ ،حریت تخیل، کا جو سبق آریہ سماج اور علی گڑھ کی تحریک نے پڑھایا تھا، وہ رنگ لایا اور اب آزادی کا کلمہ ہر شخص کے ذہن میں گونجنے لگا۔

اقبال نے کہا:—

سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

قاعدہ ہے کہ ذہن جب ایک قید سے آزاد ہو جائے تو اسے دوسری قیدیں بھی دوبھر محسوس ہونے لگتی ہیں اور وہ ان کو بھی توڑ ڈالنے میں کسر نہیں کرتا، وہ تحریکیں جن کا آگے ذکر ہوا، اپنی نوعیت میں ملّی، رواجی یا نیم مذہبی تھیں لیکن ان کا اثر انداز ہونا تھا کہ قوم کی ذہنیت کا رجحان عام آزادی کی طرف ہوگیا۔ اقتصادی کش مکش اور سیاسی حادثوں نے اسے اور برچک دی، نتیجے پر تاویل غیر ضروری ہے پھر ادب جو زندگی کا ایک اہم شعبہ اور معاشرت کا آئینہ بردار ہے کیوں کر اس انقلاب آفریں عہد کے تاثرات سے محفوظ رہتا۔

اس ضمن میں جو کچھ اب تک عرض کیا گیا وہ مبادیات کی حیثیت رکھتا ہے، اصل تنقیح سے اب بحث ہوگی۔

آپ کو یاد ہوگا، قدیم شاعری میں عموماً جنسی قباحت اور رکاکت کا عیب تھا، جس کے دور کرنے میں لکھنؤ کی کوشش شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکی، وہ قباحت اب رفع ہونے کو ہے، آج کل آرٹسٹ کا ایمان یہ ہے کہ آرٹ جنسی جذبے کی صلاحیت کے بغیر لطافت نہیں پیدا کرسکتا، داخلیت اور خارجیت یا خارجی داخلیت کو

کوئی نہیں پوچھتا، اب واقعیت کا راج ہے، واقعہ نگاری اور جذبات کی عکاسی پہلے بھی تھی لیکن وہ معاملہ بندی کے پنجرے میں بند تھی، مزدور، کسان، سرمایہ‌دار، آمریت اور اشتراکیت، وطنیت اور جمہوریت وہ موضوع ہیں جن پر ہمارے نوجوان شاعر آج کل طبع آزمائی کرتے ہیں، یہ موضوع ہم بوڑھے آدمیوں کو بھلے نہیں معلوم ہوتے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ "ہائے ادب اور شاعری کا خون ناحق ہورہا ہے" جب 'ادب لطیف'، 'ترقی‌پسند' اور 'نیا ادب' کا نام سنتے ہیں تو ہمارے غصے کی حد نہیں رہتی، فن کے قواعد سے انحراف بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا اور ہم جابرانہ تنقید میں دل کا بخار نکالتےہیں اور سمجھتےہیں کہ مخربان ادب پر بےپناہ وار کیا۔ بزرگانْ ادب کا یہ غصہ اور سلوک نہ زیبا ہے اور نہ قرین مصلحت ہے۔

عمرانیات میں یہ امر مسلّم ہے کہ جماعت کا ایک حصہ جب کسی معاملے میں سختی اور عصبیت سے ایک حد پر ہو، تو مختلف رائے والا حصہ دوسری حد پر مستحکم ہوجاتا ہے، ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ناخوش‌گوار محاذ قائم ہوجاتا ہے جس کے شاخسانے دور تک پہنچتے ہیں، شاہ‌نظیر کے حق میں ثقات ادب کا جو سلوک ہوا اور جو اس کا ردعمل ہورہا ہے وہ ہمارے ادب کی تاریخ کا ممتاز حصہ ہے، خواجہ حافظ کا شعر ہے:

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانان سعادت‌مند پند پیردانارا

اس پیار کے لہجے میں انہیں خطاب کرنا چاہیے کہ 'بھیّا! بےشک تم ہی قوم کے ادب کا مستقبل ہو، ہم جو کچھ بھی ہیں اب پنشنر کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر عزیز ہم نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے، ہمارے تجربے تم کو فائدہ پہنچائیں‌گے، ان سے سبق لو، موجودہ زمانے کے رنگ میں دلاویزی پیدا کرکے اس کو اپناؤ اور آیندہ کی ضرورتوں کا اندازہ کرکے ابھی سے ان کا بندوبست کرو، مگر اس کا لحاظ رکھو کہ قوم کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے اور فن سرے سے برباد نہ ہوجائے۔

اگر اس لہجے اور طرز میں قوم کے نوجوان ادیبوں کو سمجھایا جائے تو مجھے یقین ہے اکارت نہ جائےگا، مجھے امید ہے کہ ہمارے جوان دوست اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ‌داری کو بھی محسوس کرتے ہیں اور یہ کہ عہد حاضر خواہ کیسے

ھی زبردست رجحانات مہیا کرے وہ جان بوجھ کر کوئی ایسا کام نہ کر گزریں گے، کسی ایسے نظریے پر لایحۂ عمل کی بنیاد قائم نہیں کریں گے جس کے خراب نتیجے نکلیں۔

بات جو یہاں تک پہنچ گئی تو میں اپنے جوان دوستوں سے چند دل کی باتیں کہہ دینا چاھتا ھوں، لاگ لپیٹ واھیات ھے، میں آج معاملہ صاف کیے دیتا ھوں، جب آج کل کی برھنہ واقعیت اور عریاں نویسی کی شکایت کی جاتی ھے تو آپ کا جواب یہی ھوتا ھے نا؛ کہ جرات کی معاملہ بندی بھول گئے واسوخت امانت کے فلاں بند تو ذرا بہ آواز بلند سنا ڈالیے، داغ کا فلاں شعر تو ذرا اپنے نورچشم کو واضح کرکے سمجھایے۔ وغیرہ

جواب میں گزارش ھے کہ ان بے اعتدالیوں کو کوئی پسند نہیں کرتا، عیب، عیب ھی رھےگا، خواہ وہ کسی ذات سے سرزد ھو، لیکن آپ کیسے دانش مند ھیں کہ عیب کو عیب جانتے ھیں مگر اس کی پیروی کیے جاتے ھیں، ایک بات آپ کو ھرگز نہ بھولنی چاھیے، کہ وہ زمانہ اور تھا، اب اور زمانہ ھے، جب یہ چیزیں بیٹھکوں اور دیوان خانوں تک محدود رھتی تھیں، جب ھماری صنف نازک کو اس خرافات کی کانوں کان خبر نہ ھوتی تھی، عورتوں میں تعلیم اور آزادی جو اب ھے، پہلے کہیں تھی؟ اب گھر کا زنانہ اور مردانہ ایک ھے، یعنی رسپشن یا ڈرائینگ روم۔ آج کئی رسالوں کی ادارت عورتوں کے ھاتھ میں ھے عورتیں غیر ملکوں میں پبلک حیثیت سے یا سیاحت اور تعلیم کے لیے جاتی ھیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ لڑکیوں کی اچھی تعلیم آج کل اچھی شادی کا پاسپورٹ ھے ایک بل کے سلسلے میں مرکزی اسمبلی نامکمل سمجھی گئی جب تک اس کے ممبروں میں ایک خاتون کا اضافہ نہ کیا گیا۔ ان حالات اور اس ماحول کے لحاظ سے آپ کو اس سے انکار نہیں ھوسکتا کہ نظم ھو یا نثر تصنیف و تالیف سے متعلق آپ نوجوانوں کی ذمہ داریاں بہت زیادہ اور اھم ھیں، مغرب کی تہذیب اور تمدن کے محاسن سے ھم سب کو استفادہ کرنا چاھیے ان کو اپنی معاشرت میں سمونا ضروری اور مفید ھے، لیکن مغرب کی کورانہ تقلید ھماری ذھنیت کو غلامانہ بنادےگی، بہ قول شاعر 'کانٹوں کو ھٹا کے پھول چن لینا دانش مندی ھے'۔

جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ھے شاعر اور منشی کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ھیں، یہ نہ سمجھیے کہ فصاحت کے قدیم ضابطے اور فن کے تعزیری آئین سے آزاد

ہوکر اب ہمیں کیا سانسا اور کس کا اندیشہ ہے۔ حضرت! یہ زمانہ چھوٹ اور کھار کھیلنے کا نہیں، آپ کو اپنی تحویل کی خبر ہے؟ قوم کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق، جماعت کا ناموس، قوم کی نسائیت کے ذہن کی پاکیزگی، نوجوانوں کے تخیل کی لطافت، وطن کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت، اس قسم کی اور بھی ذمہ داریاں ہیں، جو آپ کے سر ہیں، آپ کو ماضی سے سبق لینا ہے، حال کو جانچنا ہے اور مستقبل کا انتظام کرنا ہے، یہ فرائض ہیں جو آپ کو سرانجام کرنے ہیں اور ادائے فرض کے لیے جو سامان آپ کے پاس ہے وہ ہے زبان اور ولولۂ صادق، آپ جانتے ہیں جذبہ، ذہن کا وہ داخلی جوہر ہے جو تزکیۂ نفس اور معصوم خودفہمی سے پیدا ہوتا ہے، خارجی تقلید سے نہیں، جنگ عظیم کے بعد جو انقلاب دنیا بھر کی زندگی کے ہر شعبے میں عمل پیرا ہوا، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے مگر ہماری حالت کچھ انوکھی سی ہے ع برما بگزشت و ایں دل زار ہماں۔ سیاسیات میرا میدان نہیں مگر یہ رازفاش ہے کہ ہندستان کی خود مختاری کا مسئلہ اس کی رعایا کے دو بڑے حصوں کے اتحاد اور باہمی سمجھوتے پر آکر اڑا ہوا ہے، ہمارے شاعر اور مصنف اس اختلافی جمود کے دور کرنے میں کیا کررہے ہیں؟

مزدور ہمارا داہنا ہاتھ ہے، اور کسان ہمارا مجازی رازق ہے، ان کی حالت اس میں شک نہیں اصلاح اور بہبودی کی محتاج ہے، آپ نے کبھی کارخانوں میں جاکر اس امر کے دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی کہ فیکٹری اور ملوں میں وہ کیا کام کرتے ہیں، اور اس کے باہر کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں؟ کبھی گانووں میں جاکر دیکھا، کہ کسان اپنے کھیت کی پیداوار سے کیا اور کیوں کر سرکاری سکہ وصول کرتا ہے؟ اور اسے کس طرح صرف میں لاتا ہے؟ ایک چمکتی ہوئی نظم یا چٹختا ہوا افسانچہ لکھ دینے سے کچھ کام نہیں بن سکتا برسوں سے سن رہے ہیں کہ:—

جس کھیت سے دھقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو
سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

مگر کیا؟ نہ جنبد گل محمد۔ ہماری دنیا وہیں ہے جہاں پہلے تھی، ہماری معاشرت کی خاص صورتیں ہیں، ہم جن مخصوص عوارض میں جوں توں زندگی کے دن بھر رہے

ہیں، وہ کرۂ زمین پر اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ اس لیے مغرب کی اندھی تقلید قبل جنگ عظیم سے تعلق رکھتی ہو یا اس کے بعد سے ہمیں راس نہیں آسکتی اس ضمن میں اور کچھ آگے عرض کیا جائے گا۔

صرف دو چار اور باتیں کہہ کر میں اس تنقیح پر بحث ختم کیے دیتا ہوں، رومان اور جذباتی نظموں کا آج کل بہت زور ہے، افسوس ہے، کہ اس میں ندرت کا رنگ نظر نہیں آتا، چند حضرات ہیں جو اس نوعیت کی نظمیں کامیاب پیش کرتے ہیں یہ نظمیں جیسی کچھ بھی ہوتی ہیں، ان کا پس‌منظر کلاسیکل یا متغزلانہ ہوتا ہے، جو ان سے مختلف ہوتی ہیں ان میں رکاکت اور ابتذال آجاتا ہے۔ ان شاعروں کو میرا یہ مشورہ ہے، کہ انہیں یاد رکھنا چاہیے 'حرّیت تخیل'، 'عصمت تخیل' سے الگ ہوکر قومی ذہنیت کے حق میں زہر قاتل بن جاتی ہے، ہمارے جوان شاعروں سے یہ کوئی نہیں کہتا، کہ 'دلائل‌الخیرات' اور 'جوگ بششت' سے اپنی نظموں کے موضوع اخذ کیا کریں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ وہ اپنی فطری شبابیت کو مصنوعی فرتوتیت سے بدل ڈالیں، جب کہ بوڑھوں میں تزکیۂ‌نفس 'عصمت بی بی از بے چادری' سے زیادہ نہیں، جوانوں میں عصمت تخیل اور تزکیۂ‌نفس وہ نعمت سبحانی ہے جس کے بغیر کوئی قوم پروان نہیں چڑھ سکتی۔

جدید ادب نے کتنی ایسی نفیس اور وقیع چیزیں پیدا کی ہیں، جو قوم کی زبان کا بیش‌بہا سرمایہ ہیں، اور ہم خوش ہیں، کہ وہ ہماری آنکھوں کی نورافروز ہوئیں، مگر عموماً رومان اور جذباتی کلام ایسا نکل رہا ہے کہ اسے دیکھ کر چپ ہی رہنا پڑتا ہے۔

ہمارا عنوان تھا «ادب میں نئے رجحانات» اب تک جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ‌تر نظم سے متعلق ہے، اگرچہ اصولاً نثر پر بھی اسی طرح عائد ہوتا ہے، لیکن میں اب چند باتیں خصوصی طور پر نثرجدید سے متعلق کہنا چاہتا ہوں، نثر کا میدان نظم سے کچھ زیادہ ہی وسیع ہے، لیکن طوالت کے خوف سے نثر کے صرف دو شعبوں پر نظر ڈالی جائے گی، یعنی افسانچہ اور تبصرہ۔

افسانچہ اپنے خارجی رنگ روپ کے ساتھ اردو میں نئی چیز ہے، اور جس سرعت سے اس نے ترقی کی، اور عروج پکڑا، نہایت حیرت انگیز ہے۔ خیر! آج کل

کے افسانچے ایک وہمی واقعیت اور پھوہڑ سادگی کا شکار ہیں، اس کو کوئی صاحب کلیہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ میں عام حالت کا ذکر کر رہا ہوں، اب تک یہ ہوتا تھا، کہ بعض باتیں فطرت پر اور وقت پر چھوڑ دی جاتی تھیں، ان کی ماہیت، مشاہدہ بلکہ مشاہدۂ بالواسطہ تک محدود رہتی تھیں، رات کو گھر میں بلّی کے بچے ہوئے صبح کو گھر کا سات برس کا لڑکا پوچھتا ہے یہ کہاں سے آئے، کہہ دیا جاتا ہے «تمھاری بلّی کو ہوئے ہیں» معاملہ وہیں ختم ہو جاتا ہے، وہی لڑکا بڑا ہوکر اور لکھ پڑھ کر بائی‌اولوجی کا پروفیسر اور آدھی درجن اولاد کا والد بزرگوار ہوجاتا ہے، یہ کہاوت سنی ہوگی، کہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھائے، یہی حال جنسی تشریح اور جنسی نفسیات کا ہے، واقعیت کی دھن جذبات عالیہ اور اخلاق حسنہ سے گزر کر ہمارے افسانچوں کے بڑے حصے کو زندہ جسم پر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بنا دیتی ہے، یہ عیب اب اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، لوگ اور ملک کا قانون برہنہ عکاسی اور عریاں نویسی سے تنگ آ گئے ہیں، یہ قباحت متقدمین کو کھٹکتی تھی، چناں‌چہ «صاحب اخلاق جلالی» نے تاکید کی:—

> «و الفاظ غریبہ و کنایات بعید استعمال نہ کند، و از فحش و شتم احتراز نماید و اگر احتیاج بہ تعبیر از امرے فاحش افتد بہ تعریض و کنایہ اکتفا کند»[۱]

میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے تمام افسانچے اور افسانے اس ضمن میں نہیں آتے بلکہ تردید کے خوف کے بغیر میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں، کہ ہمارا افسانوی خزانہ ملک کی کل نہیں تو اکثر و بیش‌تر زبانوں کے ذخیروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، یہ رجحان کہیں پھیل کر وبائی صورت نہ اختیار کرلے اس لیے اس کی روک تھام لازمی ہے، مگر یہ روک تھام اگر کارگر ہوسکتی ہے، تو خود افسانہ نگاروں کے ہاتھ سے، اس کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے کہ:—

مغرب زدگی اس کو نہ کردے کہیں برباد وہ جوہر جنسی کہ لقب جس کا حیا ہے

معلوم رہے، کہ اب اخباروں میں جو شادی کے اشتہار نکلتے ہیں، ان میں دلہن کے لیے «ماڈریٹ ایجوکیشن» اور «ہاؤس ہولڈ ورک» کی شرط بھی وارد ہونے لگی ہے، آپ خود سمجھتے ہیں کن صورتوں نے یہ شرطیں لازم کیں۔

---

۱ اخلاق جلالی،لامع دوم لمعہ چہارم

آپ سے معافی کی درخواست کیے بغیر ان الفاظ کے ساتھ اس مد کو ختم کیا جاتا ہے ۔ غزل ہو یا نظم افسانہ ہو یا افسانچہ غرض کہ جو تحریر ماں، باپ، جوان بیٹی یا بیٹے کے سامنے بلند آواز سے اور ماتھے پر رومال پھیرے بغیر نہیں سنائی جاسکتی وہ دیاسلائی کے حوالے کر دینے کے قابل ہے،

ایک سوال رہا جاتا ہے اس سے پہلے کہ میں اس مد کو ختم کروں، وہ ہے قومی روایات کی بابت۔ معلوم رہے کہ اعتبارات اور رجحانات سے قطع نظر ایک قوم اپنی روایات ہی سے زندہ رہتی ہے، روایات ہی ایک قوم کے احساسات اور جذبات کی تشکیل کرتی ہیں، اس کے ارادوں اور ولولوں میں حسن اور حسن عمل کا موجب ہوتی ہیں، روایات ہی نسل انسانی کو لافانی راحت عطا کرتی ہیں، اور یہی اس کی بقا کا سبب ہوتی ہیں، ان کی حفاظت ہر محب قوم کا مذہب ہونا چاہیے۔

لغت میں «تبصرہ» کے معنے ہیں «سجھانا» «سمجھانا» دولفظ اور ہیں جو تبصرے کے مترادف الفاظ کی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، یعنی «نظر» (سوچ) اور «نقد» بہ معنی «پرکھ» انتقاد اور تنقید، نقد سے مشتق ہیں، تبصرے سے یہ مقصود ہوتا ہے، کہ مصنف کو سجھایا، اور سمجھایا جائے، کہ تمھاری تصنیف میں فلاں فلاں نقائص ہیں، اور فلاں فلاں محاسن ہیں اور اس پرکھ کی توجیہہ یہ ہے، اگر تبصرے کے اصول کے مطابق تبصرہ ہو، تو مصنف اس سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا ہے، لارڈ ٹنی سن نے تبصرے سے جو فائدہ اٹھایا، اس کا تذکرہ انگریزی ادب کی تاریخ کا ایک ممتاز باب ہے، شرر مرحوم کی ایک کتاب کا نام تھا «بدرالنساء اور اس کی مصیبت» ایکن تبصرے کے بعد اس کے نام میں سے کلمۂ عطف حذف ہوگیا۔ اگر سجھانے اور سمجھانے کی اہلیت مبصر میں اور سوجھنے اور سمجھنے کی قابلیت مصنف میں ہے، تو کہہ سکتے ہیں، کہ کوئی ادب تبصرے کے بغیر صحیح ترقی نہیں کرسکتا، لیکن جب ہم تبصرے کو مناظرہ اور مکابرہ بنا دیں، تو اس کی افادیت مفقود ہو جاتی ہے۔

سب مانتے ہیں کہ اردو ادب میں تبصرے کے شعبے نے جو ترقی کی ہے بےنظیر ہے، اس کی نظیر ملک کی اور زبانوں میں نہیں ملتی، جنگ کے بعد کی افراتفری نظم کی طرح تبصرے پر بڑی چھاگئی، اب ہم اپنی تصنیفوں کی جانچ مغربی پیمانے سے کرتے ہیں، معاشرت کے رنگ اور ماحول سے آنکھیں بند کرکے ان قاعدوں کو سامنے رکھ کر تبصرے ہوتے ہیں جو مغرب کے حضرات اپنی شاعری کے لیے باندھتے ہیں، میں یہ

نہیں کہوں گا کہ وہ قاعدے سب کے سب اعتناء کے ناقابل ہیں لیکن کچھ مدّت سے ہماری ذہنیت "خذماصفا" کے سنہری اصول سے منحرف اور اندھی تقلید کی عادی ہوگئی ہے۔ جب انگلستان کے ایک حال کے نقاد نے یہ کہنے میں تکلف نہیں کیا کہ "ملٹن انگریزی بھول گیا تھا"[۱] تو ہمارے ایک نقاد نے بھی یہ کہنے میں تامل نہ کیا کہ "میر کے کلام کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ اسے سربازار زدوکوب کیا جائے"[۲] منہ پھٹ کی تقلید ہتھ چھٹ ہی پیدا کرسکتی ہے، وہ لیوس ہوں یا رچرڈس، الیٹ ہو یا کوئی، ہم کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہماری معاشرت اور ادب کا ماحول کس درجے تک ان کے اصول انتقاد سے مستحسن اثر لے سکتا ہے، اخذ اور تقلید میں جو فرق ہے کسی تاویل و تعبیر کا محتاج نہیں، اب میں ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

معرکۂ حیات مستقل اور مسلسل مساعی کا طالب ہے، اس کا مطالبہ ہے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اگر آپ ماحول کو اپنے مزاج کے مطابق نہیں بناسکتے تو خود کو اس کے مطابق بنایئے، جب ماحول اور عوارض میں تغیر واقع ہو اور اس میں اور آپ میں موافقت کی اور امتزاج کی صورت نکل آئے تو اسے معاشرت کی کامیابی اور ترقی سمجھنا چاہیے، جب تغیر کی رفتار اتنی تیزوتند اور طوفانی ہو کہ موافقت اور امتزاج ناممکن ہوجائے تو معاشری موت اس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، جب تغیر بیرونی اسباب کا نتیجہ ہو تو کسی احتیاط کو غیر معتدل نہیں کہہ سکتے۔

اپنے دو شعر سناکر آپ سے رخصت ہوتا ہوں:-

رہنے دو پردہ دار حقیقت مجاز کو
وہ لطف پھر کہاں - جو فریب نظر میں ہے
ہے بحر نیل گوں میں بھی آب اس کی برقرار
خود داری اس قدر تو ہو جتنی گہر میں ہے

۱ Revaluation, by F.R. Leavis, p. 53.

۲ اردو شعرا پر مضامین کا سلسلہ، راقم مولوی محمدیحیٰ تنہا بی اے مطبوعہ رسالہالناظر۔ لکھنؤ۔

فارسی کے زیرسایہ زبان اردو کی تدریجی ترقی

از

ڈاکٹر* سید عبداللہ ایم۔اے۔ڈی لیٹ لیکچرار یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور

زبان اردو نے تدوین لغت کی منزل تک پہنچنے سے پہلے بہت سے مرحلے فارسی زبان کے زیر سایہ طے کیے۔ موجودہ مقالے میں فارسی اور اردو کے باہمی تعلق کے اسی پہلو پر بحث کرنی مقصود ہے۔

اردو فرہنگ نویسی کا باقاعدہ آغاز عہد عالمگیری میں ہوتا ہے، چناںچہ اردو کا قدیم ترین لغت موسوم بہ 'غرائب اللغات' (از میر عبدالواسع ہانسوی) اسی زمانے میں لکھا جاتا ہے جسے آخری عہد مغلیہ کے فاضل بے بدل سراج الدین علی خاں آرزو تصحیح و ترمیم کے بعد 'نوادر الالفاظ' کے نام سے دوبارہ شائع کرتے ہیں[1] اسے زبان اردو کی پختگی کا دور سمجھنا چاہیے اس لیے کہ کسی زبان کا، لغت کی بنیادی زبان بن جانا، اس کی اہمیت، ترقی اور اثر کی دلیل ہے۔ 'غرائب اللغات' اور 'نوادر الالفاظ' زبان اردو کے ارتقائی سفر میں اہم تکمیلی منازل کی نمایندگی کرتی ہیں جس سے محققین لسانیات اچھی طرح باخبر ہیں۔

موضوع بحث 'غرائب' اور 'نوادر' کا مابہ‌الامتیاز کیا ہے؟ ان دونوں کی جداگانہ خصوصیات کیا ہیں؟ ان کے بعد اردو لغت نویسی نے کیا انداز اختیار کیا؟ ان سب سوالات کا جواب میرے مقالے کا دوسرا حصہ ہے۔ آج میں مختصراً یہ

---

1 مصنف نے 'غرائب' کے مقاصد کی جو تصریح کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کی اصل غرض ہندستانی زبان کی خدمت نہیں تھی بلکہ فارسی کی تحصیل کے سلسلے میں جو دقتیں پیش آتی تھیں ان کو رفع کرنا تھا۔ پس اس لحاظ سے ممکن ہے کہ 'غرائب اللغات' کو اردو کا فرہنگ قرار دینا کچھ بےجا معلوم ہو لیکن اس حقیقت سے کسی حالت میں انکار نہیں کیا جاسکتا کہ 'غرائب اللغات' جیسے لغت کی موجودگی جس کی بنیادی زبان اردو ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ اس دور میں ہندستانی زبان عام نظام تعلیم میں داخل ہوچکی تھی۔ اور تعلیم کے سلسلے میں تشریحی ضرورتوں کے لیے ہندستانی زبان کا حق باقاعدہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔

بتانے کی کوشش کروں گا، کہ 'تدوین لغت سے پہلے کے مراحل ہندستانی زبان نے کس طرح طے کیے' اور غزنوی دور سے لےکر عہد عالمگیری تک فارسی اور ہندستانی کے باہمی تعلق اور اختلاط نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں؟ اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندستانی نظام تعلیم میں ہندستانی زبانوں کا داخلہ کب اور کس طرح ہوا؟

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غزنوی دور کو اگر مستثنیٰ قرار دیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارسی زبان ہندستان میں اسلامی عہد کے ہر دور میں ایک علمی اور اکتسابی زبان رہی ہے۔ ایرانیوں اور تورانیوں کے پہلے قافلے تو بےشک فارسی دان اور اہل زبان تھے، مگر جب وہ سر زمین ہند میں قیام پزیر ہوگئے، تو ان کے بیٹوں اور پوتوں کے لیے بھی فارسی اکتساب کی چیز ہوگئی جو تحصیل کے بغیر نہیں سیکھی جاسکتی تھی۔

ہندی‌الاصل مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں سے مجبور ہونا پڑتا تھا اور علمی اور شایستہ سوسائٹی میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے فارسی زبان سیکھنی پڑتی تھی، چناں‌چہ بہت جلد ہندستان میں ایک فارسی دان جماعت پیدا ہوگئی۔ یہی وہ گروہ ہے جو فارسی ادب کی تاریخ میں «فارسی زبانان ہند» کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تحصیل فارسی کے سلسلے میں ہندستانیوں کا ذریعۂ تعلیم کیا تھا؟ اس کے متعلق مغلوں سے پہلے کے دور میں کوئی قطعی تحریری شواہد نہیں ملتے۔ تاہم اس امر کے باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ ابتدائی اور ثانوی مدارج تعلیم میں ہندستانی زبانوں سے ضرور کام لیا جاتا ہوگا۔ باقی رہا مغلوں کا عہد، سو اس میں یقینی طور پر دیسی زبانیں نظام تعلیم میں داخل ہوچکی تھیں۔

نظام تعلیم میں دیسی زبانوں کے داخلے کا مسئلہ بہت اہم ہے اور میرے خیال میں کچھ تفصیل چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی زبان فارسی کے غلبے کے زمانے میں مندرجۂ ذیل مراحل سے گزری:—

۱۔ سب سے پہلے اس نے فارسی زبان کی ماہیت پر اثر ڈالا، جس سے «استعمال ہند» وجود میں آیا۔

۲۔ تشریحی مقاصد کے لیے مرادفات کی صورت میں کتابوں میں داخل ہوئی

۳۔ پھر بچوں کے نصابوں کی صورت میں ذریعۂ تعلیم بنی۔
۴۔ اس کے بعد لغات کی اصل اور بنیادی زبان قرار پائی۔
۵۔ اور بالآخر ہندستان کی قومی، علمی اور تعلیمی زبان بن کر فارسی کی جانشین بنی۔

ذیل کی سطور میں ان اجمالی اشارات کو کسی قدر پھیلا کر بیان کرتا ہوں:—

تصرّف ہند

یہ غالباً محتاج تفصیل نہ سمجھا جائیگا کہ ہندستان میں فارسی ادب کا پہلا اثر غزنوی دور میں ظہور میں آیا، چناں‌چہ ایک صدی کے اندر اندر ہندستان میں فارسی ادب کا پہلا مرکز غزنوی سلطنت کے ہندستانی صوبہ لاہور میں قائم ہوگیا۔ جس کا ذکر عوفی کی 'لباب الالباب' اور دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ ہندستان میں جن لوگوں نے فارسی میں کتابیں لکھیں یا دیوان مرتب کیے ہندستان کے باشندوں سے میل جول کی وجہ سے ان کی زبان میں ہندستانی زبانوں کے الفاظ داخل ہوگئے اور ہندستانی تراکیب و محاورات اور ہندستانی مضامین[1] کا عکس دکھائی دینے لگا۔ یہ ہندستانی اثر ابتدائی دور سے لے کر فارسی کے زوال تک تمام مصنفین میں کم و بیش نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شعرا جو مغلیہ دور میں ایران سے ہندستان میں آکر مقیم ہوگئے ان کی زبان بھی اس ہندستانی اثر سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ ہندستان کے فارسی ادب کی اس خصوصیت کا نام 'استعمال ہند' یا 'تصرف ہند' ہے۔ اور یہ وہ خاصہ ہے جو بقول بلوخمن امیر خسرو جیسے بلندپایہ شاعر اور ابوالفضل جیسے صاحب کمال نثرنگار سے لےکر معمولی ضیافت ناموں کے لکھنے والوں تک سب ہندستانی انشاپردازوں میں کم و بیش موجود ہے۔

---

۱ ہندستانی مضامین میں علاوہ معمولی ہندستانی خیالات کے وہ تمام موضوع شامل ہیں جن کا تعلق یہاں کے درباروں اور بادشاہوں کے حالات سے ہے۔ نیز وہ بھی جو ہندستانی شہروں کے مناظر، عمارتوں اور باغوں کی تعریف، میلوں اور تہواروں کی توصیف اہم واقعات تاریخی کی سرگزشت وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ خسرو کے علاوہ بعض اور شعرا نے بھی ان موضوعوں پر لکھا ہے مثلاً ابوطالب کلیم کی مثنوی در تعریف اکبرآباد و باغ جہاں آرا، تعریف جنگ فیل اورنگ‌زیب، ظفرنامہ شاہجہانی، ملا طغرا کی مثنویاں، ملا محمد قلی سلیم کی صفت کشمیر، قدسی کی صفت کشمیر، مرزا خلیل: در صفت زنانہ بازار، سلیم: تعریف بلاد ہند، زبردست خاں: تعریف پنگھٹ، ارادت خاں: زنانہ بازار، یحیٰی کاشی: صفت کشمیر اور مذمت برشگال لاہور، کلیم: صفت دولت خانہ اکبرآباد، طغرا: چشمہ سارویرناگ وغیرہ وغیرہ۔

'استعمال هند، کے ضمن میں فارسی پر هندستانی کے جو اثرات ظاهر هوئے هیں وہ کم و بیش یه هیں :-

۱۔ فارسی کتابوں میں هندستانی زبانوں کے مفرد الفاظ۔
۲۔ فارسی کتابوں میں هندستانی ترکیبوں اور جملوں کا استعمال۔
۳۔ هندستانی محاورات کا بہصورت ترجمه فارسی کتابوں میں شامل هونا۔
۴۔ هندستان میں بعض فارسی الفاظ کا خاص مفہوم۔
۵۔ هندستانی تلفظ اور هندستانی لب و لہجه۔
۶۔ هندستانی مضامین فارسی کتابوں میں۔
۷۔ ریختہ (وہ نظم جس میں ایک مصرعه فارسی میں اور دوسرا هندستانی میں هوتا هے)
۸۔ اردوئے معلیٰ (هندستانی کا وہ دبستان جو دهلی میں فارسی کے اصول اور بنیاد پر قائم هوا)

هندستانی کے مفرد الفاظ فارسی کتابوں میں هندستانی زبانوں[۱] کے مفرد الفاظ کا استعمال شروع هی سے هو چلا تھا۔ ابوالفرج رونی، منوچهری فرخی، مسعود سعد سلمان بلکه حکیم سنائی غزنوی (جو هندستان نہیں آئے) کے دواوین میں هندستانی الفاظ پائے جاتے هیں۔ مغلوں سے پہلے کے دور میں منهاج سراج کی کتاب 'طبقات ناصری'، امیر خسرو کی متعدد تصانیف مثلاً 'قران السعدین'، 'خزائن الفتوح'، 'دیول رانی خضر خاں'، برنی کی 'تاریخ فیروز شاهی'، سید محمد بن مبارک کرمانی (متوفی سنه ۷۷۰ھ) کی 'سیرالاولیاء'، شمس سراج عفیف کی کتاب 'تاریخ فیروز شاهی' اور کتاب 'باراهی'، تاج الدین مفتی الملک کی کتاب 'مفرح القلوب' وغیرہ میں سینکڑوں هندستانی الفاظ موجود هیں[۱]۔ علی الخصوص امیر خسرو کی تصنیفات تو اس هندستانی آمیزش سے سراپا لبریز هیں۔ اسی طرح مغلوں کے زمانے کی کتابوں میں هندستانی کے مفرد الفاظ بهکثرت پائے جاتے هیں۔ بابر جیسا نووارد بھی 'تزک'

---

۱ اس موضوع پر پروفیسر شیرانی صاحب کے محققانه مضامین اورینٹل کالج میگزین میں شایع هوئے هیں ناظرین کرام تفصیلات کے لیے ان کا مطالعه فرمائیے۔

میں سینکڑوں ہندستانی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور ان کے ہندستانی نام بتاتا ہے
ہمایوں کے بعد اکبری عہد میں اگرچہ ہندستان پر ایرانی اثرات کا زبردست سیلاب
آیا تاہم اس دور کے سب سے بڑے فاضل ابوالفضل کی کتابوں میں ہزاروں کی تعداد
میں ہندستانی الفاظ موجود ہیں۔

عہد جہاں گیری میں اکبری دور کی طرح زبردست ایرانی اثرات موجود تھے،
پھر بھی ہندستانی اثرات جلوہ‌گر نظر آتے ہیں۔ خود 'تزک جہاں‌گیری' میں الفاظ کی
بڑی بھاری تعداد موجود ہے۔ شاہ جہاں کا دور عروج کمال کے بعد ایرانی اثرات کے
آغاز زوال کا پتا دیتا ہے۔ تاہم چوں‌کہ فارسی‌داں علمی جماعت میں ہندستانی عنصر
بہت بڑھ چکا تھا اس لیے ہندستانی کا استعمال بھی اسی نسبت سے زیادہ نظر آتا ہے،
یہاں تک کہ شاہ جہاں اور عالم‌گیر دونوں بہ‌وقت ضرورت ہندستانی زبان میں گفتگو کیا
کرتے تھے۔

ملاّ عبدالحمید لاہوری 'بادشاہ نامہ' میں لکھتے ہیں :--

« بیش‌تر بہ فارسی درکمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بہ بعضے ہندستانی
زبانان کہ فارسی ندانند بہ ہندستانی »۔ (صفحہ ۱۳۲)

(اس موقع پر رائج‌الوقت زبان کے متعلق لفظ « ہندستانی » کا استعمال قابل ملاحظہ ہے)

ملاّ محمد کاظم اورنگ‌زیب کے متعلق 'عالم‌گیر نامہ' میں لکھتے ہیں :--

« آں‌زبان سروش بخت و اقبال اگرچہ اکثر اوقات بزبان سلیس ملیح فارسی
تکلم می نمایند لیکن ترکی چغتائی راخوب می دانند و باترکان بداں زبان
سخن می‌کنند و باجمعے از اہل ہند کہ فارسی نمی‌دانند یا نیکو نمی توانند
گفت بہ‌ضرورت زبان بہ لغت ہندی می‌کشایند » (عالم‌گیر نامہ صفحہ ۱۰۹۵

ہندستانی محاورات و امثال | 'استعمال ہند' کے سلسلے میں سب سے عجیب چیز یہ ہے
کہ بہت سے فارسی مصنف جن میں بعض قادرالکلام لوگ
بھی شامل ہیں، ہندستانی محاورات و امثال کا اپنی فارسی میں ترجمہ کرتے نظر آتے
ہیں۔ ہندستان کے فارسی ادب کے اس پہلو پر زبان داںوں نے بہت اعتراضات کیے ہیں،
(جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا) لیکن اس کے باوجود اس عنصر کی موجودگی سے
انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امیر خسرو ہندستان کے فارسی گو شعرا کے سرتاج ہیں، لیکن ان کے اشعار میں ہندستانی محاورے بہ کثرت موجود ہیں مثلاً :-

جاں می رود زمن چوگرہ می زند بہ زلف مردن مراست از گرہ اوچہ می رود
(خسرو)

خان آرزو نے 'مثمر' میں لکھا ہے کہ دراصل یہ ایک ہندستانی محاورے کا ترجمہ ہے۔ اگر کوئی ایرانی لکھتا تو یہ لکھتا کہ «از کیسۂ اوچہ می رود»۔

اسی طرح خسرو نے 'غرۃ الکمال' کی ایک رباعی میں «سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا» کا یوں ترجمہ کیا ہے :-

ع زیں گونہ بہ یک چوب مراں ہر ہمہ را۔

ایک اور خصوصیت ہندستانی فارسی کی یہ ہے کہ اس میں بعض فارسی الفاظ اپنے اصل معنی سے ہٹ کر نیا مفہوم اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً :-

غصّہ، خوش، ناخوش وغیرہ وغیرہ

اور 'دفتری اور ملکی انتظامی اصطلاحیں، مثلاً رسید، رسد، احدی وغیرہ۔

اس کے متعلق تفصیلات خان آرزو کی کتاب 'مثمر' اور 'چراغ ہدایت' سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔

ہندستانی فارسی کی خصوصیات

میں نے 'استعمال ہند' کے متعلق بہت کچھ بیان کر دیا ہے اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ اردوداں پبلک کے فائدے کے لیے بلوخمن کے ایک مضمون Contribution to persian Lexioography سے چند ضروری امور کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کروں، تاکہ ہندستانی فارسی کی نمایاں خصوصیات پورے طور پر واضح ہوسکیں :-

«تصرف» کے معنی ہیں، ہجے، شکل، معنی اور بناوٹ میں کچھ ردوبدل کرنا، اہل ایران نے عربی الفاظ میں جو تصرفات کیے ہیں، وہ 'استعمال فرس' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اہل ہندستان نے عربی یا فارسی میں جو تصرفات کیے ہیں وہ 'استعمال ہند' کہلاتے ہیں...... اگرچہ 'استعمال ہند' کو فضلا اچھا نہیں سمجھتے، پھر بھی یہ اس قدر عام ہے کہ اس کو صحیح ہی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات کم علم والے ہندستانی فارسی‌دانوں کے تصرفات اسقام سے خالی نہیں ہوتے، پھر بھی یہ

ملحوظ خاطر رهنا چاهیے که بڑے مصنفین سے لے کر ادنیٰ منشیوں تک سب کی تحریریں اس سے متاثر هیں......یه تصرف عهد مغلیه هی سے شروع نهیں هوتا بلکه اس سے قدیم تر هے۔ هندستانی فارسی میں قدیم ایرانی فارسی کے بعض ایسے عناصر اور آثار اب بھی پائے جاتے هیں جو ایران میں نظر نهیں آتے۔ یه عناصر تورانی فارسی کے ذریعے داخل هوئے اور هندستانی فارسی کا جزو بن گئے۔ هندستان کے فارسی دانوں نے کلاسیکل فارسی کے ان اثرات کو آج تک محفوظ رکھا هے جو تورانی فارسی نے بطور ورثه اهل هند کو بخشے۔ هندستانی فارسی کا یه پهلو علمی اور لسانی اعتبار سے بےحد اهم هے، کیوں‌که بعد میں زبان‌اردو بھی اس سے متاثر هوئی۔

ذیل کی خصوصیات هندستانی اور تورانی فارسی میں مشترک هیں:—

۱۔ بهت سے الفاظ ایسے هیں جو تورانی فارسی میں 'ک' پر ختم هیں بہ‌خلاف اس کے ایرانی فارسی میں 'گ' پر خاتمه هوتا هے مثلاً:—

کبک (تورانی)	کبگ (ایرانی)
مشک (")	مشگ "
اشک "	اشگ "
سرشک "	سرشگ "

وغیره وغیره

۲۔ اسی طرح بعض الفاظ کے شروع میں جو 'ک' آتا هے وه ایران میں 'گ' هے مثلاً:—

کشادن (تورانی)	گشادن (ایرانی)
کشنیز "	گشنیز "

'ک' اور 'گ' کا یه فرق ان لغات میں نمایاں طور پر ظاهر هوتا هے جو حرف اول اور حرف آخر کے اعتبار سے مرتب هوئی هیں مثلاً 'مجمع الفرس' سروری (جو ایرانی لغت نگار هے) میں 'اشگ' « فصل الف مع کاف فارسی » میں هے اور 'مدارالافاضل' (هندستانی) میں 'اشک' « فصل الف مع کاف تازی» میں هے۔

۳۔ 'معروف و مجهول'— جدید فارسی میں مجهول نهیں، لیکن تورانی اور هندستانی فارسی میں 'معروف و مجهول' کے امتیاز کو قائم رکھا گیا هے

جو آج تک موجود ہے۔ اور اس بات کے شواہد موجود ہیں
ایرانی فارسی میں بھی یہ امتیاز بڑی دیر تک قائم رہا۔

۴ ۔ نون غنّہ ۔ تورانی (اور ہندستانی) فارسی میں نون غنّہ محفوظ ہے، خاص کر جب کہ وہ الف کے بعد آئے۔

۵ ۔ تورانی فارسی میں دال اور ذال کے باہم ابدال کو روا نہیں رکھا گیا، ایرانی فارسی میں یہ موجود ہے۔

۶ ۔ بعض الفاظ جو تورانی فارسی سے مخصوص ہیں (تفصیل کو ترک کیا جاتا ہے)

۷ ۔ بعض الفاظ جو ہندستانی فارسی میں خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ (تفصیل کو ترک کیا جاتا ہے)

۲ ۔ لفظ 'کہ' کا تلفظ بہ‌طور 'کے'، مثلاً کاشکے

۳ ۔ اضافت کا تلفظ، خانۂ من (نہ کہ خانیے من)

۴ ۔ بعض الفاظ کی تبدیلی بوجۂ تنافر و قباحت، مثلاً بادشاہ بجائے پادشاہ

۵ ۔ تصریف کی بعض خاص شکلیں، مثلاً پیدائی بجائے پیدایش، سختگی، مہر بانگی،

۶ ۔ مدّہ کی تقصیر۔ اچار بجائے آچار، ال‌تمغا بجائے آل‌تمغا۔

۷ ۔ ساکنین کے اجتماع سے احتراز، ارجمند بجائے ارج‌مند۔

۸ ۔ بعض الفاظ میں تشدید کا حذف، نواب بجائے نوّاب۔

۹ ۔ بعض الفاظ کے تلفظ میں کسرے کی طرف میلان مثلاً خزاں بجائے خزان دراز بجائے دراز، فضا بجائے فضا، حماقت بجائے حماقت۔

۱۰ ۔ بعض عربی الفاظ میں تصرف، قلعہ بجائے قلعہ، قیامت بجائے قیامت قطعہ بجائے قطعہ۔

۱۱ ۔ بعض الفاظ کے املا میں تصرف، ازدھام بجائے ازدحام، تعویز بجائے تعویذ خورم بجائے خرّم۔"

(انتہیٰ)

ہندی ایرانی نزاع

'استعمال ھند،' جو ھندستان کے قادر الکلام شاعروں اور نثاروں کی تصانیف میں ھے اپنی جگہ درست سہی، لیکن عام طور پر ایرانی ناقدین نے اس پر پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

اکبری عہد میں ھندستان میں ایرانیوں کی درآمد بڑی کثرت سے ھوئی، اور جہاں‌گیر کے زمانے میں یہ ایرانی اثرات انتہائے کمال کو پہنچ گئے، پھر بھی چوں‌کہ فارسی زبان ھندستان میں صدیوں سے رائج چلی آتی تھی اور اھل ھند اس کو اپنی زبان سمجھتے تھے، اس لیے یہاں کے اکابر علما فارسی زبان پر ایرانیوں سے بڑھ کر اپنا حق سمجھتے تھے، اور فضلائے اھل ھند کو ایرانیوں کی طرح فارسی زبان کا استاد مانتے تھے، چناں‌چہ خان آرزو اپنی کتاب 'مثمر' میں لکھتے ھیں:—

«زیرا کہ اینہا (اھل ھند) بہ‌سبب توغل و کثرت ورزش و تصفح و تفحص زبان فارسی داخل زمرۂ فارسیاں شدہ اند» (ق ۱۷ الف)

مگر فارسی کا ھندی دبستان خالص ولایتی حضرات کی نظروں میں کچھ زیادہ وقیع نہیں سمجھا جاتا تھا، اور عام طور پر ھندستانی فارسی مورد طعن و اعتراض بنائی جاتی تھی۔ یہی چیز ھمارے ادب میں «ھندی ایرانی نزاع» کے نام سے مشہور ھے۔

ھندستان میں فارسی لغت نگاری

'ھندی ایرانی نزاع،' نے اگرچہ ھندستان میں فارسی کو بہت نقصان پہنچایا پھر بھی اس کش‌مکش سے ایک بہت بڑا فائدہ مترتب ھوا اور وہ ھندستان میں «فن لغت نگاری» کی ترقی اور 'علم اسراراللسان،' اور 'فقہ‌اللغۃ،' کا فروغ ھے ھندستان سے پہلے تدوین لغت کا فخر توران کو حاصل ھوا چناں‌چہ بہ‌قول بلوخمن سنہ ۱۴۰۰ع سے قبل جس قدر لغت لکھے گئے، وہ توران سے متعلق ھیں» اس کے بعد ھندستان نے اس خدمت کو اپنے ذمے لے لیا اور مسلسل آٹھ نو سو سال اس فرض کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ «ولایتی» حضرات بھی جو صرف اھل زبان ھونے کے پندار سے پھولے نہیں سماتے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے چناں‌چہ فارسی لغات کی طویل فہرست میں 'مجمع‌الفرس،' سروری (جسے نصف ھندستانی سمجھنا چاھیے) اور 'انجمن آرائے ناصری،' اور اسی طرح کے دو تین ناموں کے علاوہ کسی ولایتی کا ذکر آپ موجود نہ پائیں گے۔

درحقیقت اس شان‌دار خدمت کا سبب ھندستانیوں کا یہ نفسیاتی احساس تھا کہ فارسی میں ان کی مہارت مسلم سہی، مگر ایرانیوں کے اس دعوے کا ان کے پاس کوئی

جواب نہیں کہ زبان ہماری ہے اور ہماری بات ہی زبان کے معاملے میں سند ہوسکتی ہے ۔ ہندستانی فارسی دانوں نے اس کمی کی تلافی اس صورت میں کی کہ الفاظ کی صحت اور عدم صحت کا ایک علمی معیار قائم کیا تاکہ اگر ایرانی کبھی یہ کہیں کہ فارسی ہماری مادری زبان ہے تو ہندستانی فضلاء اس کا یہ جواب دےسکیں جےکہ « ملاّ ! شما فارسی را از پیرہ زالہای خود آموختہ اید وما از فصحائے شما مثل انوری و خاقانی........و تربیت کردۂ خواص از تربیت کردۂ عوام بہتر است » (مثمر ورق ۱۴ ب)

اس قسم کے اسباب کی بنا پر ہندستان میں لغت‌نویسی کو بڑی ترقی ہوئی اور اس لحاظ سے اہل ہندستان نے فارسی زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

ہندستان میں باقاعدہ لغت نویسی کا رواج سنہ ۱۴۰۰ع کے بعد ہوا، اگرچہ اس سے پہلے بھی بعض فرہنگوں کا سراغ ملتا ہے۔

'اداۃالفضلا' سنہ ۱۴۱۹ع میں لکھی گئی، اس کے بعد 'شرف‌نامہ احمدمنیری' مصنفۂ ابراہیم قوام فاروقی سنہ (۱۴۲۸—۱۴۴۵ع)، 'مویدالفضلا' از شیخ محمد بن شیخ‌احمد لاڈ سنہ (۱۵۱۹ع / ۹۲۵ھ) 'مدارالافاضل' از شیخ اللہ داد فیضی سرہندی سنہ (۱۵۹۳ع / ۱۰۰۱ھ) 'کشف اللغات' از ابراہیم بن احمدسور (۱۶ویں صدی‌ع) 'فرہنگ جہانگیری' از میر جمال‌الدین حسین انجو سنہ (۱۶۰۸ع) 'مجمع الفرس' سروری (اشاعت اول سنہ ۱۰۰۸ھ اشاعت ثانی سنہ ۱۰۲۹ھ) 'فرہنگ رشیدی' از میرعبدالرشید تتوی سنہ (۱۶۵۳ع) 'مجمع‌اللغات خانی' سنہ (۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ع) 'برہان قاطع' از محمد حسین تبریزی (۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ع) 'سراج‌اللغات' از خان آرزو سنہ (۱۷۳۵ع) 'چراغ ہدایت' از خان آرزو سنہ (قبل از ۱۱۶۹ھ) 'بہار عجم' از ٹیک چند بہار (۱۷۳۹۔۱۷۶۸) 'غیاث‌اللغات' از مولوی غیاث‌الدین رام پوری (سنہ ۱۸۲۶ع) وغیرہ وغیرہ

'فرہنگ جہانگیری' کے ساتھ ہندستانی لغت نویسی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، بقول بلوخمن «'جہانگیری' سے لےکر 'برہان قاطع' تک «تدوین» کا دور ہے» 'فرہنگ رشیدی' سے «تنقید کا دور» شروع ہوتا ہے اور 'سراج‌اللغہ' کی تدوین سے تقابلی 'فقہ‌اللغہ' (Comparative philology) کے زمانے کا آغاز ہوتا ہے۔

فارسی لغات اور هندستانی الفاظ

ان لغات فارسی کے سلسلے میں دو باتیں ایسی هیں جن کا هندستانی زبان کی تاریخ کے ساتھ خاص تعلق هے - پہلی بات تو یہ هے کہ ابتدا سے لےکر آخر تک هندستان کے فارسی لغت نگاروں نے اکثر تشریحی طور پر اردو (هندستانی) مرادفات بھی دینے کی کوشش کی هے۔ چناں‌چہ فخرقوّاس کے فرهنگ سے لےکر آخری عہد کے فرهنگوں تک سب میں هم هندستانی الفاظ موجود پاتے هیں۔ یہ درحقیقت زبان اردو کی ترقی کا پہلا قدم تھا۔

دوسری چیز یہ هے کہ میر جمال‌الدین حسین انجو نے 'فرهنگ جہاں‌گیری' کے مقدمے اور خاتمے میں زبان فارسی کے جو قواعد و اصول بیان کیے هیں ان سے فارسی کی لسانیاتی تحقیق کی ابتدا هوئی هے اور بعد کے آنے والے اکثر لغت نگاروں علی‌الخصوص رشیدی اور خان آرزو نے اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی هے۔ اس سے فارسی قواعد اور فیلولوجی کی ترقی هوئی، چناں‌چہ میر عبدالواسع هانسوی کا رسالہ بھی 'فرهنگ رشیدی' کے قواعد کی ترمیم یافتہ شکل هے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات ذکر کے قابل یہ هے کہ میر انجو نے 'ژند' اور 'پا ژند' کے الفاظ کے متعلق بھی چھان بین کی هے اور اس بارے میں 'برهان قاطع' نے اس کا تتبع کیا هے۔

اس 'فیلولوجی‌کل' تحقیق سے هندستانی زبان کو یہ فائدہ پہنچا کہ بالواسطہ هندستانی زبان کے بعض بنیادی قواعد بھی مرتب هوگئے۔

خان آرزو اور فقہ‌اللغہ

فیلولوجی یا فقہ‌اللغہ کے سلسلے میں سراج الدین علی خان آرزو کا نام ایک خاص حیثیت سے شاید بالکل یکتا اور وہ حیثیت یہ هے کہ غالباً خان آرزو پرانے فضلاے مشرق میں سے پہلے بزرگ هیں جنھوں نے فارسی اور هندی کی وحدت اور توافق کو دریافت کیا هے۔ خان آرزو نے تقریباً اپنی سب کتابوں میں اس بات کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا هے چناں‌چہ 'شرح سکندر نامہ' میں میاں‌جی کی تشریح کرتے هوئے جہاں اس بات کی تردید کرتے هیں کہ 'میاں‌جی' کا 'جی' جیسا کہ بعض حضرات سمجھتے هیں هندی یا اردو نہیں، وهاں توافق لسانین کی دریافت کے سلسلے میں لکھتے هیں:-

«که این (یعنی توافق لسانین) برمولف تنها منکشف شده است فبحمدالله علیه
(ق ۷۰ الف: شرح سکندر نامه آرزو قلمی، پنجاب یونیورسٹی)

خان آرزو نے اپنی مشہور و معروف کتاب 'سراج اللغات' میں الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں توافق لسانین سے بڑا کام لیا ہے۔

افسوس ہے کہ اس کتاب کے یہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے اس اصول پر کہاں تک کامیابی کے ساتھ عمل کیا ہے، تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ بعض دوسری کتابوں سے اس بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں، چناں‌چہ 'مثمر' اور 'چراغ ہدایت' وغیرہ سے چند امور درج ذیل ہیں:—

مثمر میں اردو فیلولوجی کے اصول   'مثمر' خان آرزو کے فلالوجی کل خیالات کے سلسلے میں بڑی قیمتی کتاب ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے اور میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کتاب میں خان نے مفصلاً توافق لسانین کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں ۔ موجودہ لسانیاتی تحقیق اب اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ اس کے سامنے آرزو کی بعض باتیں شاید چنداں توجہ کے لائق نہ سمجھی جائیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خان آرزو کی یہ تحقیق فارسی کی لسانیاتی جستجو کی تاریخ کا ایک شان‌دار باب ہے۔

'مثمر' میں ایک موقع پر لغت نگاروں کی بعض غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

«و جمال‌الدین انجو در لفظ، ما ری نوشته که هیچ معلوم نیست که در فارسی آمده یانه؟ مولف گوید این عبارت دلالت دارد که اینها از حقیقت......(؟) غافل بوده اند۔ و حق آنست که تاالیوم هیچ‌کس به دریافت توافق زبان هندی و فارسی باآں همه کثرت اهل لغت چه فارسی و چه هندی و دیگر محققان این فن مهتدی نه شده اند الاّ فقیر آرزو۔ و کسیکه متتبع و پیرو این عاجز باشد و این را اصل مقرر کرده و بنائی تصحیح بعضے از الفاظ فارسیه برین گزاشته

چناں چه از کتب مصنّفۂ خود مثل "سراج اللغة" و "چراغ هدایت" وغیره نوشته ام و عجب است از رشیدی وغیره که در هندستان بوده اند و هیچ لحاظ نه کرده اند که دریں دو زبان توافق است"

(ق ۹۳ ب مثمر قلمی، پنجاب یونی ورسٹی)

توافق لسانین خان آرزو نے "تصرف هند" کے جواز کے سلسلے میں توافق لسانین اور هندی و فارسی کی وحدت کے اصول سے بڑا کام لیا هے اور ان ایرانیوں پر بڑی لے دے کی هے جو فارسی میں هندی الفاظ کی موجودگی کو مخل فصاحت سمجھتے هیں۔

توافق کیا هے؟ "وآن اشتراک یک لفظ است در دو زبان یا زیاده، مثلاً فارسی و عربی، فارسی و هندی، عربی و هندی وغیره"
(مثمر ق ۷۳ ب)

جهاں تک فارسی و هندی میں اشتراک کا سوال هے اس کے چند اقسام هیں:—

(الف) توافق۔ یعنی اشتراک دراصل وضع، اس قسم کے الفاظ دونوں زبانوں میں شروع سے چلے آتے هیں اس اشتراک کی یه صورتیں هوسکتی هیں:—

۱۔ بعض الفاظ بعینه دونوں زبانوں میں موجود هیں۔
۲۔ بعض الفاظ میں اول یا آخر کے اعتبار سے حروف بدل دیے گئے هیں۔
۳۔ بعض الفاظ ایسے هیں جن میں حرکات کا اختلاف هے، ورنه مشترک هیں۔
۴۔ بعض الفاظ ایسے هیں جن میں اختلاف حروف پایا جاتا هے، ورنه مشترک هیں۔
۵۔ بعض میں عموم و خصوص کا اختلاف هے، ورنه مشترک هیں۔
۶۔ بعض میں کیفیت حروف کا اختلاف هے، ورنه مشترک هیں۔
۷۔ کبھی جوهر لفظ میں کمی یا زیادتی کا اختلاف هے، ورنه مشترک هیں۔

خان آرزو کی رائے میں توافق کے اصول کو سامنے رکھ کر همیں الفاظ کی ماهیت، حرف اصل و غیر اصل اور دوسرے لسانی کوائف کا پتا لگانا چاهیے (مثمر، ق ۱۰۷ ب)

(ب) دوسری وجہ اشتراک لسانین محض بر بنائے اتفاق ہے (اس کی تفصیل ترک کی جاتی ہے)۔

(ج) تفریس کسی غیر فارسی لفظ یا کلمے کے جوہر میں ایسا تصرّف جس سے لفظ، فارسی کے اصول موضوعہ کے موافق معلوم ہو۔

خان آرزو نے تفریس کی بحث کو بہت طول دیا ہے کہ اہل ایران چوں کہ توافق لسانین سے بےخبر تھے اس لیے انھوں نے بہت سے الفاظ کو ہندی کہہ کر مفرّس قرار دیا ہے اور تعجّب کی بات ہے کہ 'جہاں‌گیری' اور 'رشیدی' کے فاضل مصنّفین سے بھی اس بارے میں مضحکہ‌خیز غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

خان آرزو کی یہ رائے ہے کہ تفریس صرف ایسے الفاظ کے سلسلے میں جائز و مستند قرار دی جاسکتی ہے جو ہندی اور فارسی کے اختلاط سے قبل عمل میں آچکی ہو اور پھر یہ کہ وہ لفظ مشترکہ نہ ہو، ورنہ یہ لازمی ہوجائےگا کہ اس غیر فارسی لفظ کا تلفّظ اور استعمال صحیح طور پر کیا جائے۔ بہ‌صورت دیگر یہ غلط استعمال پایۂ صحّت اور معیار فصاحت سے گرا ہوا تصّور کیا جائےگا مثلاً:—

بھیم کو بہیم، بروزن فہیم۔ لنگھن کو لنگن وغیرہ پڑھنا، یا یحییٰ کاشی کا یہ شعر:—

سر راج‌پوتاں جگت سنگ بود ؛ کہ برشیشۂ نہ فلک سنگ بود

یہ غلطیاں بہ وجہ بےخبری اور بےاعتنائی کے سرزد ہوتی ہیں البتّہ وہ الفاظ جن کے ادا کرنے پر غیر ہندی قادر نہیں، ان کے بارے میں بہ وجہ ایک قدرتی مجبوری کے، کوئی جائز اعتراض نہیں ہوسکتا۔

خان آرزو نے اس سلسلے میں عہد عالمگیری کے ایک فرمان کا ذکر کیا ہے، جس میں حکماً بعض ہندستانی الفاظ کے املا کی تصحیح و اصلاح کی ہدایت تھی:—

«و ایں کہ اواخر عہد محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ رحمۃاللہ علیہ
قدغن شدہ بود کہ (بنگالہ وغیرہ را) بہانہ نویسند و بالف بنگارند
(یعنی بنگالا) چرا کہ تصرّف در اعلام بےجا است و غلط بود،
چرا کہ تصرّف اعلام ہر زبان در زبان آں ملک جائز»

خان آرزو اس فرمان کو صحیح اور حق بہ جانب خیال نہیں کرتے۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسماء و اعلام ہندی میں تفریس کے (بہ‌شرط عدم قدرت تلفظ وغیرہ) قائل ہیں لیکن عام تفریس کے شدّت سے مخالف ہیں، اور اکثر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ فضلائے ایران کو صحیح ہندی لفظ کی تحقیق کرنی چاہیے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خان آرزو نے اپنی فیلولوجی کی بنیاد جلال‌الدین السیوطی کی کتاب 'مزہر' اور جوالیقی اور ابن‌سیدہ وغیرہ کی کتابوں پر رکھی

بی لٹریچر فارسی فرہنگ‌نگاری کی طرح نصابی لٹریچر بھی اردو فارسی کے باہمی تعلقات کا آئینہ‌دار ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے نصاب کی کتابوں کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ شروع شروع میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے ایران وغیرہ میں فارسی نصاب تیار ہوئے۔ ان نصابوں کا اصول اور مقصد یہ تھا کہ بچّے اپنی مادری زبان کے ذریعے عربی کو آسانی سے سیکھ سکیں۔ ابتدا میں یہ نصاب نثر میں تھے لیکن یہ نثری نمونے آج کم‌یاب ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے ایک قدیم رسالۂ منطق کا ذکر کیا ہے جو سلطان‌شاہ بن ایل بن ارسلان بن اتسز خوارزم‌شاہ کے لیے سنہ ۵۶۸ ھ میں عربی کی تسہیل کے لیے لکھا گیا تھا، لیکن بعد میں نصاب، نثر سے نظم میں منتقل ہوگئے اور درحقیقت یہ تبدیلی اصول تعلیم کے اعتبار سے زیادہ قابل عمل اور مفید تھی اس لیے کہ بچے نظم کو نثر کی نسبت آسانی سے یاد کرلیتے ہیں۔

منظوم فارسی نصابوں میں 'نصاب‌الصبیان' غالباً سب سے قدیم ہے اس کے مصنف ابونصر فراہی ہیں جنھوں نے یہ کتاب سنہ ۶۱۷ ھ میں لکھی۔ یہ کتاب صدیوں تک داخل نصاب رہی ہے اس کے قبول عام کا یہ عالم تھا کہ بہ‌قول پروفیسر شیرانی "اس کے شارحین اور حواشی‌نگاروں کی تعداد گلستان کے شارحین سے بہت زیادہ ہے"۔ (ملاحظہ ہو پروفیسر شیرانی کا مضمون "تعلیمی نصاب" صفحہ ۵۹)

'نصاب‌الصبیان' کے زیر اثر ہزاروں نصاب تیار ہوئے علی‌الخصوص ہندستان میں اس نے نصابی لٹریچر کے پیدا کرنے میں بڑا حصّہ لیا۔ امیرخسرو شاید پہلے ہندستانی ہیں جن کے قلم سے ایک نصاب کی کتاب یعنی 'بدیع‌النصاب' وجود میں آئی اس کے بعد بےشمار فارسی نصاب لکھے گئے جن کی تفصیل سے اس موقع پر ہمیں کوئی دل‌چسپی نہیں۔

نصاب کی وجہ تسمیہ اردو میں نصاب کی کتابیں اتنی نہیں جتنی فارسی میں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی اور فارسی بین‌الاقوامی زبانیں تھیں جن کی تحصیل کے لیے ایشیا کے بہت سے ممالک میں فارسی کے نصاب لکھے گئے لیکن اردو کی یہ حالت نہ تھی ایک تو اردو نسبتاً نوعمر تھی۔ دوسرے متذکرہ بالا زبانوں کی اہمیت اس کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

اردو نصاب سے وہ کتابیں مراد ہیں جن میں ہندی یا اردو کے ذریعے اور مدد سے فارسی یا عربی الفاظ سیکھے جاسکتے ہیں۔ فارسی چوں‌کہ ہندستان میں ہمیشہ سے اکتسابی زبان رہی ہے، اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے لیے بچے کی مادری زبان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہوگا۔ فارسی کے قدیم ترین لغت نگاران ہند نے تو بعض بعض الفاظ کے ہندی مرادفات دینے میں بڑی پابندی روا رکھی ہے لیکن تعجب ہے کہ نصاب میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا رواج (جہاں تک تحریر کا تعلق ہے) دسویں صدی سے پہلے نظر نہیں آتا۔

مشہور و معروف کتاب 'خالق‌باری' جسے عام روایت خسرو کی طرف منسوب کرتی ہے، شاید دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے، اس لحاظ سے قدیم‌ترین کتاب جس کا زمانۂ تصنیف ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے، حکیم یوسفی ہروی کا «قصیدہ درلغات ہندی» ہے۔ حکیم صاحب ہمایوں کے زمانے کے بزرگ ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب 'ریاض‌الادویہ'، سنہ ۹۴۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

اردو نصاب کا اس قدر تاخیر سے ظہور میں آنا کسی حد تک تعجب کا باعث ضرور ہوتا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے پہل ہندستان میں عربی تعلیم مطمح نظر تھی جسے فارسی کی مدد سے حاصل کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں خالص ہندستانیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی پر جو تھی اس کے لیے تحریری نصاب کی بہ‌جائے زبانی افہام و تفہیم سے کام لیا جاتا ہوگا۔ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں شعر، راگ اور تصوف کے ذریعے مقامی زبانوں کا چرچا ہوا اور نویں صدی میں تو یہ حالت ہوگئی کہ فارسی زبان کا ستارہ گہنانے لگا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندی کے بڑے بڑے شعراء نظر

آتے ہیں مگر فارسی میں کوئی بڑا شاعر پیدا نہ ہوا، فی الحقیقت اگر مغلوں کی آمد کے ساتھ تاریخِ ہند کا ایک جدید باب نہ کھلتا اور اکبری عہد میں شدید ایرانی اثرات کا طوفان نہ آگیا ہوتا تو شاید ہندستان میں فارسی کا چراغ دسویں صدی ہجری میں گل ہوچکا ہوتا۔

بہرحال اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں یہ بات ممکن نہ رہی تھی کہ فارسی، عربی کی تعلیم ہندستانی کی مدد کے بغیر دی جائے اس لیے کہ خالص ہندستانی مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ اس کے بغیر حل نہ ہوسکتا تھا۔ اکبری دور میں اگرچہ فارسی کا احیاءِ ثانی ہوگیا تھا اور فارسی زبان اور ادب کی حیثیت بلا شرکت غیرے و بلا شرکت احدے منفرد اور غالب تسلیم کرلی گئی تھی، پھر بھی ذریعۂ تعلیم ہونے کے لحاظ سے ہندستانی زبانوں کے استعمال کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اردو کے بعض قدیم نصاب میں عرض کرچکا ہوں کہ 'قصیدہ درلغات ہندی' حکیم یوسفی کی تصنیف ہے جو دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں مرتب کی گئی تھی۔ یہ اگرچہ نصاب کی کتاب نہیں لیکن افادہ اور مقصد کے لحاظ سے اسے اگر نصاب کی کتاب کہ دیا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔ اس قصیدے میں حکیم صاحب ہندی الفاظ خاص کر ہندی ادویہ کے اسماء سے بحث کرتے ہیں۔ موصوف تلفظ کی دشواریوں سے اگرچہ مجبور ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہندی یا اردو سے خاصی واقفیت ہے اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں:—

نام ہر چیزے بہ ہندی بشنواز من اے پسر
خاصہ نام ہرد وائے نفع برداری مگر

بل تکلم باشد و بل کر یعنی سخن
شکر فرماید ترا آں کس کہ گوید شکر کر

آنکہ چشم و ناک بینی بون ابرو ہونہ لب
دند دنداں کارہ گردن گونہ زانو مونڈ سر

ہست پیشانی متہ و سینہ چھاتی دست ہتہ
موہ رو و چل رواں شو بیٹہ بنشیں دیکھ نگر

'خالق باری' بھی شاید اسی زمانے کی تصنیف ہے اور 'نصاب الصبیان' کی طرح ہندستان میں مقبول رہی ہے اور اردو کی نشر و اشاعت میں بھی اس نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

'خالق باری' کے بعد بہت سے نصاب ظہور میں آئے ۔ ان میں سے بیش تر 'خالق باری' کی تقلید میں لکھے گئے اور ان سب پر اس کا گہرا نقش نظر آتا ہے چناں چہ ذیل کے اسما اس بات کا پتا دیتے ہیں:—

حمدباری، اللہ خدائی، اللہ باری، رازق باری، ایزدباری، قادرباری، فیض جاری، ناصرباری، صادق باری، اعظم باری۔

زمانے کے لحاظ سے 'خالق باری' کے بعد دوسرا نمبر 'اللہ خدائی' کا ہے ۔ اس کے مصنف تجلی ہیں، اس کا سن تصنیف سنہ ۱۰۶۶ھ (یا سنہ ۱۰۶۰ھ) ہے جو عہد شاہ جہانی ہے لیکن اس سے پہلے صوبۂ پنجاب میں 'فرح صبیان' کے نام سے ایک نصاب شیخ اسحاق لاہوری نے عہد شاہ جہانی میں تصنیف کیا۔ واضح رہے کہ پنجاب میں اردو کے نصابوں کے علاوہ پنجابی زبان کے نصاب بھی مرتب ہوئے، چنان چہ ہم دیکھتے ہیں کہ 'واحدباری' سنہ ۱۰۳۲ھ (یا سنہ ۱۰۴۱) میں تصنیف ہوتی ہے جو پنجاب کا قدیم ترین نصاب ہے اس کے بعد بہت سے خالص پنجابی نصاب اور بھی تصنیف ہوئے۔

ہانسوی کا نصاب

اس کے بعد میر عبدالواسع 'ہانسوی' کا 'نصاب سہ زبان' آتا ہے جس کا دوسرا نام 'صمدباری' یا 'جان پہچان' ہے۔ میرصاحب عہد عالمگیری کے بزرگ ہیں اور ہریانہ پنجاب سے ان کا تعلق ہے اس لیے قدرتی طور پر ان کی زبان میں ہریانے کے اثرات نظر آتے ہیں۔

اس نصاب کا طرز جدا ہے، اس میں الفاظ متناسب کو جدا جدا عنوانوں کے تحت میں جمع کردیا گیا ہے مثلاً ادویہ، میوے، اعضاء انسانی، الفاظ قرابت وغیرہ وغیرہ عربی، فارسی، ہندی تینوں زبانوں کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

عبدالواسع کے بعد نصاب سازی کا سلسلہ اور بھی تیز ہوجاتا ہے اور عالمگیر کے زمانے کے بعد تو ملک کے ہر حصے میں یہ نصاب کثرت سے تیار ہوتے اور پڑھے جاتے ہیں۔

ہریانہ میں ادبی تحریک

میر عبدالواسع ہانسوی جس زمانے میں 'صمدباری' لکھتے ہیں اس وقت کے متعلق یہ بات خاص ذکر کے لائق ہے کہ ان کے وطن مالوف ہریانہ میں اردو تصنیفی تحریک زوروں پر ہے ۔ شمال میں اردو کے ادوار ترقی میں ہریانوی ادب خاص طور پر لائق ذکر اس لیے ہے کہ یہ اس

وقت فروغ پاتا ہے جب شاہجہاں آباد میں ابھی تصنیف و تالیف کی تحریک پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔ ہانسوی کا رسالۂ سہ‌زبان ہریانوی کے ادبی خیالات و رجحانات کا پتا دیتا ہے نیز یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ فارسی زبان کی تحصیل کے سلسلے میں دیسی زبانوں کی بنیادی اہمیت کا احساس اس وقت کے فضلا کو عام طور پر ہوچکا تھا اور غالباً یہ خیال بےجا نہ سمجھا جائےگا کہ غرائب‌اللغات بھی شاید اسی احساس کا ایک مظاہرہ ہے۔

ہانسوی کی 'غرائب‌اللغات'

ہانسوی کی 'غرائب' نصاب کی کتاب نہیں بلکہ ایک لغت اور فرہنگ ہے لیکن اس کے متعلق یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فرہنگ‌نگار کا مقصد اردو کا لغت مرتب کرنا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل فارسی زبان کے سلسلے میں ایک تعلیمی مقصد کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں پہلی دفعہ اردو کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

یہ وہ زمانہ[1] ہے جس میں ہندستانی فارسی‌دان گروہ اور ولایتی شعراء و ادباء کی ادبی کش‌مکش انتہائی عروج پر ہے اور ہندستانی فضلا ایرانیوں کے مقابلے میں اپنی حیثیت اور مقام کے تحفظ کے لیے پوری قوت صرف کرتے نظر آتے ہیں چناں‌چہ اسی دور میں بعض ایسے تذکرے اور کتابیں لکھنے میں آرہی ہیں جو محض «ہندستانی» احوال و کوائف پر مشتمل ہیں، مثلاً خالص ہندستانی شاعروں کے تذکرے اور فارسی دانان ہند کے لیے لغت کی کتابیں، استعمال متأخرین کے سلسلے میں ہندستانی شعراء کا خاص ذکر وغیرہ۔

خان آرزو نے اپنی کتاب چراغ ہدایت کے دیباچے میں اس کو بہ تفصیل بیاں کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی چوں‌کہ ہندستانی حضرات کے لیے ایک اکتسابی زبان تھی اس لیے فارسی کے سلسلے میں ہندستانیوں کے تعلیمی مسائل

---

۱ اسی زمانے میں شیخ علی حزیں ہندستان میں وارد ہوتے ہیں۔ ان کی راے ہندستانی فضلا کے متعلق اچھی نہ تھی۔ انھوں نے جس طریق سے ہندستان کے خدمت‌گزاران فارسی کا تذکرہ کیا، اس سے اہل‌ہند کو بڑا صدمہ ہوا خان‌آرزو نے اس کا جواب دیا اور علمی‌انداز میں ہندستانی فرسی کی مدافعت کی۔ ان کی سب کتابوں میں اس نزع کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعض لوگوں نے خان‌آرزو کی ان کوششوں کو ذاتیات پر محمول کیا اور دوسرا راستہ اختیار کیا۔ چناں‌چہ وارستہ، قتیل اور غالب، حزیں کے طرف‌دار ہیں البتہ غلام علی آزاد بلگرامی نے «خزانہ عامرہ» میں اعتدال کا مسلک اختیار کیا ہے۔

اور دشواریاں ایرانیوں سے مختلف تھیں چناں چہ ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے ایسی کتابیں لکھی گئیں جو خالصتاً فارسی دانان ہند کے لیے کار آمد ہوں ، مثلاً ' چراغ ہدایت ، اور ' غرائب اللغات ، جس طرح ' چراغ ہدایت ، فارسی دانان ہند کے فائدے کے لیے مرتب ہوئی ، اسی طرح ہانسوی کی ' غرائب ، بھی ہندستانی فارسی دانوں کی امداد کا ایک دوسرا ذریعہ بنی ۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کی مدد سے ان ہندستانی الفاظ کے فارسی مرادفات کا علم حاصل کرسکیں جو عام طور پر ہندستان میں لوگوں کو معلوم نہیں ۔

عہد عالمگیری کے بعد ادب میں « ہندستانیت » کی تحریک اور بھی ترقی پکڑ جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر ' غرائب ' کے قسم کی کتابوں کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی چناں چہ ذیل کی کتابیں اسی اسلوب کی حامل ہیں ۔ ' نوادر الالفاظ ' ' حواشی واضافات نوادر ' ، ' عجائب اللغات ' ، ' نفائس اللغات ' ، ' ظہیر العلما ' وغیرہ وغیرہ ۔
(ان کی تفصیل کو ترک کیا جاتا ہے)

نوادر الالفاظ

ان سب میں خاص ذکر کے لائق ' نوادر الالفاظ ' ہے جو ۱۲ صدی ہجری کے بہترین محقق خان آرزو کی تصنیف ہے ۔ یہ اگرچہ ' غرائب ' کی تصحیح و ترمیم ہے لیکن اس کے حواشی واضافات کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اسے مستقل اور اور جداگانہ تصنیف کہ دیں تو بےجا نہ ہوگا ۔

غرائب اور نوادر کے امتیازات

خان آرزو کی ' نوادر ' اور ' غرائب اللغات ' کے مفصّل امتیازات پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ۔ اس کے لیے میں کوئی دوسرا موقع تلاش کروں گا ۔ مختصراً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ' غرائب ' ایک سیدھی سادھی کتاب ہے ' جس میں ہانسوی نے درمیانے درجے کے طلبہ کی تعلیم کو اپنے سامنے رکھا ہے ۔ اس کے برعکس نوادر کو آرزو نے اپنے عالمانہ حواشی کے ساتھ علماء و فضلاء کے لیے بھی کار آمد بنا دیا ہے ۔

ایک اور چیز اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہانسوی کے الفاظ میں ہریانی تلفظ اور ہجے کا عنصر غالب ہے لیکن خان آرزو نے اس کو دھلی کی زبان اور کہیں کہیں گوالیاری کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کی ہے کیوں کہ خان آرزو کے خیال میں گوالیاری ہی افصح اور شاعری کے لیے موزوں ترین ہندی زبان ہے ' تیسری چیز یہ ہے کہ ہانسوی نے عربی الفاظ کے سلسلے میں جو غلطیاں کی ہیں آرزو نے ان کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔

چوتھی بات جو خان آرزو کو تمام ماہرین لسانیات قدیم میں بہت بڑا درجہ دیتی ہے وہ جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے، اصول اتحاد لسانین کی دریافت ہے، سنسکرت (اور اس کی وساطت سے ہندی) اور فارسی میں جو رشتہ ہے اس کا حال جہاں تک ہماری موجودہ معلومات کا تعلق ہے شاید خان آرزو سے پہلے کسی پر منکشف نہیں ہوا۔ ہانسوی نے اپنی کتاب میں بعض الفاظ کو ہندی کہا ہے، حالاں کہ فارسی قدیم میں وہ الفاظ آتے ہیں لہذا وہ فارسی ہیں، خان آرزو نے 'غرائب' کے اسی کمزور پہلو کی بے حد تصحیح کی ہے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ 'غرائب' اور 'نوادر' ہر دو حصے اصولاً فارسی کی خدمت کے لیے لکھی گئیں ہیں، پھر بھی ہم ان دونوں کو خاص کر 'نوادر' کو اردو لغت نویسی کی طرف پہلا مؤثر قدم اور باقاعدہ کوشش قرار دے سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سراج الدین علی خاں آرزو قواعد زبان اردو[1] کے پہلے محقق اور موسس ہیں، جنھوں نے اس کے لغات کے مفہوم اور ماہیت کو نہایت ماہرانہ اور محققانہ انداز میں فارسی میں بیان کیا ہے۔ خان آرزو ہی سب سے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اردو کے اولین لغت کو فلسفیانہ اور علمی بنیادوں پر مرتب کیا، اور زبان اردو کو فارسی کی طرح ایک مستقل اور زندہ زبان بنانے کی کوشش کی، چناں چہ ان لسانیاتی سرگرمیوں کے علاوہ، انھی کی سر پرستی میں دہلی میں اردو شاعری کا وہ دبستان قائم ہوا، جس کے اولین نام وروں میں میر تقی میر اور میر درد وغیرہ کے اسماے گرامی شامل ہیں۔ اس وقت تک زبان اردو فارسی کے زیر سایہ پرورش پاتی رہی لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے اپنی جداگانہ ہستی منوا کر اپنے لیے ایک مستقل جگہ پیدا کی اور آج اس حالت میں ہے کہ ہم اسے فارسی کی صحیح جانشین کہہ سکتے ہیں۔

---
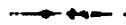
۱ زبان کے معنوں میں «اردو» کے لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس نے کیا؟ عام طور پر اس کا سہرا مصحفی کے سر باندھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خان آرزو «مثمر» اور «داد سخن» میں اس کا استعمال بہ کثرت کررہے ہیں۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس سے بہت قبل اس لفظ کا رواج اس معنی میں ہوچکا ہوگا۔ میرا مضمون «خان آرزو اور اردو» عنقریب اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہورہا ہے۔ اس میں میں نے اسی مبحث پر مفصل بحث کی ہے۔

ھندی کے نقش اولیں

از جناب گوری سرن صاحب سری واستو، ایم ۔ اے (علیگ)

ھندی زبان اور اس کے ھمسایہ

قدیم زمانے میں یوروپ اور ایشا کی سرحد پر جو زبانیں بولی جاتی تھیں انھی سے موجودہ زبانیں پیدا ھوئیں ۔جو فرقہ آریہ کہلاتا ھے مشرق کی طرف بڑھا ۔ آگے چل کر ان میں دوطبقے پیدا ھوگئے ۔ ان کی جدا جدا زبانیں ھوگئیں ایک زبان کی شاخیں میدی، پہلوی، فارسی وغیرہ ھیں اور دوسری کی سنسکرت یہ دوسری شاخ کابل ھوکر شمالی ھند کے میدانوں میں پہنچی تھی اسے ھند آریائی شاخ کہتے ھیں ۔ سنسکرت کے معنی ھیں 'صاف ستھری اور منزہ زبان' سنسکرت میں بدلتے رھنے کی قابلیت نہیں ھے ۔وہ اپنے قدیم اصول صرف ونحو پر ابھی تک قائم ھے ۔ البتہ بول چال کی پراکرت (یعنی فطری زبان) بتدریج بدلتی رھی ۔ اس کی صورت بھی سنسکرت سے ملتی جلتی ھے ۔ فرق صرف یہ ھے کہ سنسکرت میں ثقیل الفاظ آتے ھیں اور پراکرت میں آسان ۔ پراکرت ملک کے ھر حصے کی مختلف تھی ارر سنسکرت سے قریب تھی یہ زبانیں بھی قواعدوضوابط کی زنجیر میں بندھی ھوئی تھیں ۔ پرکرات جب بگڑی تو اسے «اپ بھرنش» کہنے لگے یہ موجودہ دیسی زبانوں کے پیدا ھونے سے پہلے کی بات ھے ۔ ھندی، پنجابی، مرھٹی، بھی اپ بھرنش سے نکلی ھیں ان زبانوں کی تاریخ الگ بھگ ۱۰۰۰ع سے شروع ھوتی ھے حالانکہ زبان کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی جاسکتی ۔

ھندی

ھندی کا مفہوم سمجھنے میں لوگ اکثر غلطی کرتے ھیں، گریرسن صاحب نے ناحق مشرقی ھندی اور مغربی ھندی کی تقسیم کی ھے اور اس پر بھی راجستھانی اور بھاری کے لیے الگ جگہ قائم کی ھے ۔ ان کے خیال میں بنگالی اور بھاری ایک ھی نسل سے ھیں اس طرح مغربی ھندی کا پنجابی سے گہرا تعلق ھے ۔ اب ھندی سے مراد وہ زبان ھے جو اردو سے مختلف ھے، لیکن ھندی، اردو دونوں مغربی ھندی

کی تربیت کردہ ہیں۔ جو زبان ہندستانی کہی جاتی ہے وہ کوئی الگ زبان نہیں ہے موجودہ زبانوں میں جو تمام ملک میں بولی اور سمجھی جائے وہی ہندستانی ہے۔ اردو، ہندی، دونوں اسی ہندستانی کی تربیت یافتہ صورتیں ہیں۔

اس مبحث میں راجستھانی مغربی، ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری سب کو ہندی مان کر ان کا ذکر کیا جائےگا، ان کا لٹریچر مختلف ضرور ہے، لیکن جن منزلوں سے یہ زبانیں گزری ہیں وہ سب ایک ہی ہیں، آج کل کھڑی بولی کے رواج نے ان سب زبانوں کو ایک کردیا ہے برج بھاشا، شورسینی، اودھی، اب بھی زندہ ہیں، لیکن ان میں نظم ہی لکھی جاتی ہے، نثر کا رواج نہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پراکرتوں کا دور اب ختم ہوگیا ہے۔ پہلے بھی پراکرتوں میں اس قدر میل جول تھا کہ وہ مل کر ایک ہونے لگی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک پراکرت میں بھی شدبد ہوجانے کے بعد دوسری پراکرتوں کے سیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

پھر بھی ان زبانوں کو مختلف سمجھتے ہوئے انھیں ایک ہی لڑی میں پرونے کے لیے ضروری ہے، کہ گریرسن صاحب کی طرح ان سب زبانوں کو ملاکر «ہندستان کی موجودہ زبان» کہا جائے۔ کے صاحب اس اصطلاح کو مختصر کرکے ہندی زبان کہنا ہی زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ راجستھانی زبان کی چند تاریخی نظموں مثلاً، پرتھوی‌راج راسا، وغیرہ اور بہاری یا میتھل زبان میں ودیاپتی کا کلام اس مضمون سے خارج کردیجیے تو سراسر ہندی ہی کا ذکر رہ جائےگا۔ اردو کا ذکر ہم یہاں اس لیے نہیں کرتے، کہ نظم و نثر دونوں میں من‌حیث‌الموضوع وہ ہندی سے مختلف ہے۔ اردو نظم فارسی بحروں میں لکھی جاتی ہے جو زیادہ پختہ اور منجھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہندی میں عروض و قافیہ کی سختی سے پابندی نہیں ہوتی۔ اردو نظم پر ایرانی ماحول کا گہرا اثر پڑا ہے اور اس میں گل و بلبل، شیریں، فرہاد، جیحوں، سیحوں اور رستم و نریمان وغیرہ الفاظ آگئے ہیں۔

بول‌چال کی زبانیں

راجستھانی زبانوں میں خاص خاص بولیاں میواتی، مارواڑی، جےپوری اور مالوی ہیں۔ ان میں مارواڑی بولی کو ادبی حیثیت حاصل ہے بعض لوگ مارواڑی کو «ڈنگل» بھی کہتے ہیں۔ راج‌پوتانے میں برج‌بھاشا کو «پنگل» کہتے ہیں اس لیے ڈنگل اور پنگل کا فرق ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

مغربی ھندی کی خاص بولی « بانگڑی » ھے جو گنگا کے پار جنوبی مشرقی پنجاب میں بولی جاتی ھے۔ برج بھاشا متھرا اور اس کے نواح کی زبان ھے مغربی ھندی کا سرمایۂ شاعری زیادہ تر برج بھاشا ھی میں ھے - برج بھاشا سے قدرے ملتی جلتی « قنوجی » بولی ھے۔ یہ « دوآبہ گنجم » کے نشیبی علاقوں میں بولی جاتی ھے۔ « بندیلی » بندیل کھنڈ اور نربدا کی وادی میں بولی جاتی ھے۔ دلی اور میرٹھ کے اطراف میں ایک اور زبان بولی جاتی تھی جسے « شورسینی » کہتے ھیں۔ دلی ھی میں باھر سے آنے والے لوگ قیام کرتے تھے لہذا یہیں سے زبانوں کا میل جول بھی شروع ھوا۔ اس میل جول سے جو زبان بنی اسے « اردو » کہتے ھیں اس میں فارسی، عربی نیز پنجابی اور راجستھانی کے بہت سے الفاظ شامل ھوگئے۔ یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ پہلے یہ لشکر یا چھاؤنی کی بولی تھی۔ مسلمان جوں جوں اس ملک میں پھیلے یہ زبان بھی پھیلتی گئی، بتدریج اسے لٹریچر کا مرتبہ نصیب ھوگیا۔ موجودہ ھندی اور اردو میں فرق صرف اسی قدر ھے کہ اردو سے عربی، فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت الفاظ کی بھرتی کردی گئی اور وہ ھندی بن گئی۔ [۱]

مشرقی ھندی سے « اودھی »، « بگھیلی » اور « چھتیس گڑھی » وغیرہ بولیاں نکلیں ان میں سب سے زیادہ اودھی کو رواج ھوا۔ یہ اجودھیا یا اودھ کی زبان ھے اور اسی میں تلسی داس جی کی راماین لکھی گئی ھے۔ اودھی کو « سبیواری » بھی کہتے ھیں۔ « بہاری » زبان کی تین خاص بولیاں ھیں « میتھلی »۔ « بھوجپوری » اور « مگاھی »۔ میتھلی ادبی زبان کی حیثیت رکھتی ھے۔ بہاری میں جو کچھ بھی ھے، وہ اسی زبان کا عطیہ ھے۔ یہ زبان پرانی متھلا ریاست میں بولی جاتی تھی۔

ھندی حروف ھجا اور رسم الخط ھندی اور اس کی بہنوں نے رسم الخط اور حروف تہجی سنسکرت سے لیے۔ ان کی گریمر اور صوتیات بھی سنسکرت ھی کی رھین منت ھیں۔[۲] رسم الخط کی کچھ اور شکلیں بھی ھیں مثلاً « مہاجنی »۔ « صرافی » یا « بنیوئی » لیکن یہ ادب کے کسی کام کی نہیں۔

---

۱ اس رائے سے بعض اختلاف کریں گے لیکن میرے خیال میں اتفاق کرنے والوں کی تعداد زیادہ ھے۔

۲ ھندستان کے فاضل ادیب پنڈت برج موھن دتاتریہ کیفی کی رائے ھے کہ پراکرتیں سنسکرت سے قدیم ھیں، لیکن انھیں یاد رکھنا چاھیے کہ تامل، تلگو، کناری اور ملیالم، یعنی، دکنی پراکرتیں سنسکرت سے پہلے کی ھیں نہ کہ پالی، اودھی، پنجابی وغیرہ جن سے موجودہ زبانیں نکلی ھیں۔

ان سے صرف لین دین کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ «کایتھی» کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ کایتھی خود دیوناگری سے پیدا ہوئی۔ ناگری کا پھر بھی کایتھی سے زیادہ رواج ہے۔

لغات یا الفاظ مذکورۂ بالا زبانوں میں زیادہ تر وہی الفاظ برتے جاتے ہیں جو ہندآریائی زبانوں سے صدیوں کٹھن منزلیں طے کر کے پیدا ہوئے ہیں۔ اب جو جدید ہندی رائج کی جارہی ہے اس میں بہت سے الفاظ براہ راست سنسکرت سے مستعار لے لیے گئے ہیں۔ ان کی «تتسم» صورت قائم رکھی گئی ہے۔ انھی کی آسان شکل کو «تدبھو» کہتے ہیں۔ بعض الفاظ تتسم اور تدبھو دونوں صورتوں میں رائج ہیں مثلاً اصل سنسکرت لفظ 'یوگ' ہے۔ ہندی میں اسے 'جوگ' بنا لیا گیا۔ اسی طرح فارسی کا لفظ «غریب نواز» ہندی میں «گریب نواز» ہو گیا۔ تلسی داس اور سور داس نے اس طرح کے بےشمار عربی، فارسی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ عربی فارسی کے بغیر کام نہیں چل سکتا، یہی وجہ ہے، کہ موجودہ زمانے کے دقت‌پسند انشاپرداز مثلاً شیام سندر داس، رام کمار ورما، رام چندر شکل اور نگیندر بھی ان سے بےنیاز نہ رہ سکے، حتیٰ کہ سمپورنانند اور پرشوتم داس ٹنڈن کی تحریروں میں بھی ایرانیت کی ہلکی سی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ اسی طرح «پرتگیزی» «ڈچ» «فرانسیسی» اور «انگریزی» الفاظ بھی ہماری زبان میں اس طرح کھپ کر رائج ہوگئے ہیں، کہ ان کا بدل پیش کرنا زبان کی مٹی پلید کرنا ہے۔

ہندی علم عروض یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ ہندی میں جس قدر علم عروض نے ترقی کی اس کی مثال کسی زبان میں نہیں مل سکتی[1] یہ چیز ہندی والوں نے سنسکرت کے «پنگل» یعنی علم عروض سے لی ہے۔ انگریزی میں وزن کا معیار الفاظ کی آواز ہے۔ لیکن لاطینی اور یونانی السنۂ قدیم میں الفاظ کی وسعت سے بحر کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ ہندی میں بھی یہی صورت مستعمل ہے۔ ہندی میں فارسی کی طرح قافیے کا استعمال تو ہوتا ہے لیکن ردیف کا استعمال نہیں ہوتا[2]۔

---

۱ اس مضمون کی ایک قسط میں ان تمام مصنفین اور ان کی کتابوں کا حوالہ دیا جاچکا ہے جنھوں نے علم عروض پر معیاری کتابیں لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو رسالہ «اردو» بابت اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

۲ ملاحظہ ہو عرب کی ادبی تاریخ مصنفہ پروفیسر نکولسن۔

انہیں جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ بےسر الاپتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے بحروں کا استعمال مناسب طور پر کیا ہے۔ ان کے کلام میں اس قدر حسن تناسب اور شایستگئ الفاظ ہے کہ ہندی اس پر فخر کرسکتی ہے ۔ تلسی داس، بہاری لال، بھوشن اور ہریش چندر کی عظمت کا یہی راز ہے۔ یوں تو ہندی میں بےشمار بحریں مستعمل ہیں، لیکن ان میں زیادہ‌تر دوھا، ماترا، چوپائی، سورٹھا، کنڈلیا، چھپئی، کویا، سویا، اور کوت، بہت رائج ہیں۔ گیتوں کی بحریں ان سے الگ ہوتی ہیں۔ فارسی میں جو رجز، رمل اور طویل وغیرہ بحریں رائج ہیں یہ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ رباعی کی چوبیس بحروں میں سے بعض ہندی کے مصرف کی بھی ہیں۔ یہاں اس مبحث کو طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔[1]

ایک امیرخسرو کا زمانہ چندبردائی سے لگ بھگ نصف صدی بعد کا ہے پھر بھی اتنے تھوڑے عرصے میں ان دونوں شاعروں کی زبان میں اس قدر فرق ہونا، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یاتو جو پہیلیاں، مکرنیاں اور دوسخنے امیرخسرو کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں ان کے نہیں یا "پرتھی راج راسو" چندبردائی کی تصنیف نہیں۔[2] میری ذاتی رائے یہ ہے کہ چند بر دائی کی زبان دلی کی زبان نہ ہونے کی وجہ سے خسرو سے اس قدر مختلف ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ صوفیاے کرام کے بعض فقرات جو قلمبند کرلیے گئے ہیں، خسرو کی زبان سے ملتے جلتے ہوں[3] ۔ خسرو اور چندبردائی دونوں کا کلام ایسا ہے، جسے ہندی اردو کی تاریخوں میں آنا چاہیے[4]

زبان کی ارتقا کہتے ہیں کہ زبان اہل‌علم کی وراثت نہیں ۔ یہ عوام کی چیز ہے اس کا کوئی مذہب نہیں اسے کسی طرح کی تفریق سے غرض نہیں[5] ۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ آیندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ ابتدائی زمانے

۱ دیکھیے گوڈین گریر مصنفہ هرنل صاحب
۲ لکچر گوری شنکر هیرا چند اوجھا صاحب
۳ اردو میں صوفیاء کرام کا حصہ مولفہ مولوی عبدالحق صاحب
۴ ہندی کا اتہاس مصنفہ پنڈت رام چندر شکل
۵ ہندی ساهتیہ و مرش مصنفہ پدم لال پنا لال بخشی

میں زبان سہل ممتنع تھی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس میں نقش و نگار بنتے گئے یہاں تک کہ زبان پڑھےلکھے لوگوں کی چیز ہوگئی لیکن پھر جب عوام سے ربط‌ضبط پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہر جگہ کے دیہاتی گیت اور بولیوں کے نمونے زبان میں کھپائے جانے لگے۔ «فرہنگ آصفیہ» میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو ساون گانے والی عورتوں کی زبان سے نکلتے ہیں یا کھیت کاٹنے والے کسان اور باربرداری کرنے والے مزدور بولتے ہیں۔ یہی حال شاعری کا بھی ہے۔ ولی کی زبان کتنی آسان ہے۔ میر کی زبان بھی آسان ہے لیکن ناسخ کے دور میں اس کی ہئیت ہی بدل گئی[1]۔ انگلستان میں ملٹن کا زمانہ لاطینی کا زمانہ تھا۔ پوپ اور اس کے معاصرین نے فصاحت و بلاغت کی دھن میں جذبات کا خون کردیا، لیکن جب ورڈسورتھ شیلی، اور بائرن کا زمانہ آیا تو انسانی جذبات سیدھے سادھے پر ترنم الفاظ میں ادا کیے جانے لگے، اور اب تو فرینچ کی شیرینی نے سارے براعظم کو مسخر کرلیا ہے، ہندی بھی اس کلیے سے بری نہیں ہے۔ خسرو، کبیر، سورداس اور تلسی داس کے بعد جو فن پرستی کا دور شروع ہوا تو چنتامنی، بھوشن اور دیوکوی نے الفاظ کی طومار مچادی۔ آخر زمانے نے پلٹا کھایا اور ہریش‌چند نے سیدھی سادی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ آج بھی ہندی میں وہی رنگ زیادہ مقبول ہے۔

ہندی ادب پر ایک سرسری نظر

ہرش نے شمالی ہند میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہرش کے مرتےہی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔ پھر چار صدیوں تک بدامنی رہی۔ مسلمان آئے تو اس ملک کے بھاگ جاگے۔ ادھر بہت سی راجپوتی حکومتیں قائم ہوگئیں تھیں۔ گو سیاسی اعتبار سے انھیں کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن انھی کی بدولت ہندی کے قدیم ادب میں بہت ساقیمتی اضافہ ہوا۔ یہ ریاستیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں، لیکن جب مسلمانوں نے ان کی «پوتر بھومی» پر حملہ کیا تو وہ مل جل کر ایک ہوگئیں اور بڑی بہادری سے باہر والوں کا مقابلہ کیا۔ یوں تو مسلمان محمد بن قاسم ہی کے زمانے سے گاہے ماہے اس ملک میں آجاتے تھے، لیکن محمد غوری

[1] «مقدمہ شعر و شاعری» مصنفہ مولانا حالی مرحوم

سے پیش‌تر کسی نے یہاں حکومت نہیں کی۔ ہندوؤں نے پرتھوی‌راج کی رہنمائی میں محمد غوری کا مقابلہ کیا۔ پہلے مسلمان تراین کے مقام پر پسپا ہوئے، لیکن دوسرے ہی سال راجپوتوں نے شکست کھائی۔ پرتھوی راج مارا گیا۔ دلی مسلمانوں کی ہوگئی رفتہ رفتہ مسلمانوں کی حکومت پھیلی اور ڈیڑھ سو برس کے اندر یعنی محمد تغلق کے زمانے تک یہ سارے ہندستان میں پھیل گئے، لیکن راجپوتوں کی تہذیب و تمدن پر آنچ نہیں آنے پائی۔ مسلمان جب ان کو نہ مٹاسکے تو لامحالہ ان کے دوست بن گئے۔

ان سب واقعات کا اثر لٹریچر پر بہت گہرا پڑا۔ اس سے موجودہ ہندستانی زبانوں کا ہیولیٰ تیار ہوا[1] بہت سی تاریخی نظمیں لکھی گئیں جنھیں ہندی کے شہ پارے کہنا مناسب ہوگا۔ ان نظموں کے مصنف وہ لوگ تھے جو راج درباروں میں رہتے تھے اور بھاٹ یا کوی کہلاتے تھے۔ چوں‌کہ یہ درباری شاعر تھے اس وجہ سے قصیدہ‌گوئی ان کی فطرت ثانی بن چکی تھی، ایسی‌حالت میں واقعہ نگاری کا حق یہ کیسے ادا کرسکتے۔ ایک چیز ان کی نظموں میں ایسی ملتی ہے جو قدیم زمانے کی نظموں یعنی راماین، مہابھارت، ایلیڈ، اوڈیسی، اور ای‌نیڈ، ہی میں مل سکتی ہے۔ وہ ہے بہادرانہ جذبات کی امنگ۔ یہ رزمیہ نظمیں جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ انھیں پڑھ‌کر راجپوتی شجاعت کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان رزم گو شاعروں میں سب سے اونچی کرسی چندبردائی مصنف 'پرتھی‌راج راسا' کی ہے۔ چند، پرتھی راج کا درباری شاعر تھا۔ اسے اپنے آقا سے بڑی محبت تھی۔ اسی لیے جب وہ اس کے صفات بیان کرنے لگتا ہے تو اس کو ملائک سے بڑی بڑھا دیتا ہے۔ اسی کا ہم‌عصر جگ نایک ہوا ہے۔ چند کے بہت بعد سارنگ دھر ہوا جس نے رن تھم بھور کے ہمیر بادشاہوں کی شجاعت کا آلھا گایا ہے۔ اس کی مشہور نظم ہمیر راسو چھپ چکی ہے۔[2]

شجاعت کی آگ دھیرے دھیرے بجھنے لگی اور بھگتی کے لطیف جذبات دلوں میں گھر کرنے لگے۔ ہندو مسلمانوں کے میل جول نے ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا

---

۱ اس مضمون کی یہ قسط ساق اکتوبر ۱۹۳۹ء میں طبع ہو چکی ہے۔

۲ ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے راسو لٹریچر جہاں تک دستیاب ہو سکا چھپوا یا ہے۔ یہ نظمیں بہت طویل ہیں۔ ان کی زبان اس قدر غیر مانوس ہے کہ بغیر کسی مستند شرح کے ان کا مطالعہ آسان نہیں۔

جو رسم و رسومات کعبہ اور سومنات میں اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ وہ «ہمہ اوست» اور «ہمہ ازوست» کا قائل تھا۔ اگرچہ یہ تھے تو صوفی، لیکن رام اور کرشن کو ماننے کی وجہ سے انھیں «ویشنو» کہتے ہیں۔ بت پرستی کے خلاف تحریک شروع ہوئی۔ مہاتما بدھ کے بعد جس طرح برہمنوں کا وقار کم ہونے لگا تھا اسی طرح پھر ان کی باتیں جاذب توجہ نہ رہیں۔ غریب اچھوتوں کو اپنایا جانے لگا۔ چنانچہ اس دور میں ریداس ایسے بھگت پیدا ہوئے جو ذات کے چمار تھے لیکن اہل دل میں ان کی جگہ بہت بڑی ہے۔ اس عالمگیر مذہبی بیداری کے زمانے میں مذہب کی اشاعت کے لیے ہندی ہی سے کام لیا گیا۔ یہی وجہ ہے، کہ ہندی کا ابتدائی یا بنیادی ادب مذہبی لوازمات سے بھرپور ہے۔ ہندی کے شاعر زیادہ‌تر ویشنو تھے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو، مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا۔ صرف مردوں ہی نے نہیں بلکہ عورتوں نے بھی بھگتی کا راگ سنا، دلوں میں امنگ پیدا کی۔ شاعری کی زبان اب وہ نہیں رہی جو پراکرت‌آمیز ہوتی تھی۔ اب تو بول‌چال کی زبان بھی وہی تھی جس میں اس دور کی شاعری کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ کبیر کی زبان میں «پنجابیت» بھی ہے، لیکن وہ اصل میں اودھی ہے۔ اسی طرح برج بھاشا کی شاعری لسانی حیثیت سے پوربی سے مختلف ہے۔ پھر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان تمام زبانوں کے مصادر ایک ہی ہوتے تھے۔ صرف مشتقات میں فرق ہوتا تھا۔

پھر بھی شاعروں کی تعداد دیکھیے تو شاعری کا دائرہ محدود نظر آتا ہے۔ بات یہ ہے سنسکرت کو چھوڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ فضیلت کی علامت تھی اس لیے ہر شاعر سنسکرت میں شعر کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ دیسی زبان میں شعر کہنا بدعت سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ چناں‌چہ ہندی ابھی اپنے بچپن کے دور سے گزر رہی تھی۔

ہندستان کی دیسی زبانوں کا سنہرا دور تقریباً سولھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ اکبر کی تخت نشینی ہندی کے لیے ایک مژدۂ جانفزا تھی۔ مغلوں نے نہ صرف ایک پائدار حکومت کی بنیاد ڈالی بلکہ ادب اور فنون لطیفہ کو بھی ترقی دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور شاہ‌جہاں کے زمانے میں ہندی ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔ ادب میں لطافت اور نزاکت پیداہونے لگی۔ شاعری کی زبان منجھتی

جارہی تھی۔ دوسری مبارک کوشش یہ تھی کہ کیشوداس اور دوسرے مشہور شاعروں نے شاعری کو فن کی حیثیت دی۔ ہندی کے بےمثل شاعر تلسی داس، سورداس، بہاری‌لال، ترپاٹھی، دیودت اور سیناپتی، اسی عہد زرین کی یادگار ہیں[۱] اسی زمانے میں سکھوں کا "گرنتھ صاحب" مرتب ہوا، اور بہت سے مختلف فرقے پیدا ہوئے، جیسے "دادو پنتھی" اور "کبیر پنتھی"۔ ان مذہبوں کے ماننے والوں نے شعر اور بھجن کا بےمثل ذخیرہ پیدا کر دیا۔ جب تک مغل حکومت کو عروج رہا ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا، جب مغلوں کی طاقت کو لونی لگنے لگی تو ادب بھی بے دست و پا ہوگیا پھر مدتوں تک اچھے ادیب اور شاعر پیدا نہیں ہوئے۔

انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے یورپ کا اثر ہندی پر پڑنے لگا۔ ادھر انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ہندستان کی حکومت کے لیے بہت مارکٹائی ہوئی۔ آخر انگریزوں کا بول بالا رہا۔ ان کی خوش قسمتی سے مرہٹوں کی طاقت کو بھی گھن لگ گیا اور مغلیہ حکومت کے پرچخے اڑ گئے۔ پھر تو انگریزی حکومت کا ہر طرف ڈنکا بجنے لگا۔ انگریزوں کے آنے سے ہندستانی معاشرت میں انگریزیت سمانے لگی۔ ادھر جو امن و امان قائم ہوا تو ہندستانیوں کو پھر سے اپنی فطری ذہانت دکھانے کا موقعہ مل گیا۔ اس کا ادب پر بھی اثر ہوا۔ اسی وقت سے فورٹ ولیم میں ہندستانی ادب کا "نشاۃالثانیہ" شروع ہوگیا۔ یہیں للوجی‌لال نے جدید ہندی نثر کی بنیاد ڈالی۔ موجودہ کھڑی بولی جسے ہندی کہتے ہیں، اس کے باوا آدم یہی ہیں۔ چھاپے خانے کھل جانے اور اخبارات کو آزادی حاصل ہو جانے کی وجہ سے ادب کے نشرواشاعت میں بڑی مدد ملی۔ ایک مدت کے بعد ہریش‌چند نے برج بھاشا کی شاعری کو زندہ کیا اور کھڑی بولی میں بھی شعر کہے۔ ہندی ڈرامہ بھی انھی کے قلم کی پیداوار ہے۔

یہ ہندی ادب کے ارتقا کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ ہم نے سب سے پہلے ہندی کے عہد طفولیت کا حال لکھا ہے۔ اس دور میں تاریخی نظموں کی بھر مار تھی دوسرے دور میں ویشنو مذہب کی تحریک شروع ہوئی رام اور کرشن کی بھگتی کے متعلق اشعار لکھے گئے۔ تیسرے دور میں ادب‌لطیف کی کثرت تھی اور اس پر مغل

۱ رسالہ "اردو" میں ہم اس دور کا مفصل ذکر کرچکے ہیں۔

حکمرانوں کی خاص توجہ تھی، چوتھے دور میں جدید خیالات نے ادب کا جامہ پہنا۔ ہر دور کی یہ خصوصیت ہے، کہ اس میں زمانے کا رنگ صاف کھل جاتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ ہندی شاعر کبھی رفتارِ زمانہ سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ ایسا نہ ہوتا تو تلسی داس اور میتھلی سرن گپت کے خیالات میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔ شاعر سارے زمانے کی آنکھ ہے۔ وہ دیکھتا ہے دوسرے لوگ نہیں دیکھتے اس لیے بقول والٹروٹ مین "اس کے لیے کوئی مضمون تنگ نہیں ہوتا"۔

ہمیں اس قول سے اتفاق نہیں ہے، کہ شاعری سیاسی انحطاط کے دور میں ترقی کرتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال غالب، مومن، ذوق کے زمانے میں ضرور ملتی ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یونان میں شاعری کی ترقی پریکلیس کے زمانے میں، روم میں آرامسٹس کے عہد میں، انگلستان میں ایلزبتھ کی حکومت میں، فرانس میں چودھویں لوئی کے دور میں، اور ہندستان میں گپت خاندان کے زریں دور میں ہوئی۔ اسی طرح ہندی شاعری بھی مغلوں کے عہد میں عروج کو پہنچی۔ آج جب ہندستانی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، تو ان کی قوت شاعری بھی بڑھ گئی ہے۔

ابتدائی منظوم تاریخیں

جس زمانے میں مسلمانوں اور راجپوتوں کی جنگ ہو رہی تھی اس وقت راج درباروں میں بھاٹ یا کوی ہوتے تھے جو اپنے سرپرست اور اپنی قوم کی بہادری کے نغمے سناتے تھے۔ یہ شاعر ہر قوم میں موجود تھے۔ چارن، بھاٹ، سیوا اور پنچولی وغیرہ کے نام ان میں زیادہ مشہور ہیں چارن اور بھاٹ دونوں برہمن تھے۔ یہ مقامی پراکرت میں شاعری کرتے تھے۔ لگ بھگ ساڑھے چارسو برس تک ان بھاٹوں کا دور رہا۔ اس طویل عرصے میں پنڈ، کیدار، انیہ داس، مسعود، قطب علی اور اکرام فیض وغیرہ مشہور شاعر گزرے۔ ان کی نظمیں اب نایاب ہیں اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی زبان کیسی رہی ہوگی۔ میواڑ کا شاہی خاندان کھمان راسا تھا۔ اس خاندان کی ایک منظوم تاریخ ملتی ہے، لیکن یہ سولھویں صدی کی لکھی ہوئی ہے۔ جس تاریخ کے بل پر یہ تاریخ لکھی گئی وہ نویں صدی کی لکھی ہوئی ہے، لیکن افسوس، کہ یہ کتاب اب نہیں ملتی۔

۱۱۴۳ء میں کمار پال گجرات کا راجا ہوا، اس کا دارالحکومت انہلواڑہ تھا۔ مشہور عالم اور شاعر ہیم چندر سوری کے اثر سے وہ جین ہوگیا تھا۔ اس کے بہت دنوں بعد ہیم چندر نے پراکرت میں ایک نظم لکھی جس کا عنوان ' کمار پال چتر ' تھا۔ اس اس تاریخی نظم کے سہارے سے ایک تاریخ نثر میں لکھی گئی جو غالباً اس سے ایک صدی بعد کی تصنیف ہے۔ جب محمود غزنوی نے ہندستان پر پہلا حملہ کیا تو بیل دیو اجمیر کا راجا تھا۔ یہ راجا ' بیل دیو راسو ' نامی نظم کا ہیرو ہے، جس کی تاریخ تصنیف معلوم نہیں۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ نظمیں کب لکھی گئیں، ان کی زبان پر کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔

ایک گتھی اور بھی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔ وہ یہ کہ جدید ہندی یعنی کھڑی بولی پراکرت سے کب علاحدہ ہوئی۔ ' پرتھی راج راسو ' کی نسبت جو ۱۱۹۱ع کے لگ بھگ کی تصنیف ہے، گریرسن صاحب ایسے عالم متبحر کی رائے ہے، کہ « اس میں خالص اپ بھرنش شورسینی پراکرت کا رنگ ہے » جب یہ حال ہو تو کوئی کیسے کہہ سکتا ہے، کہ ہندستان کی موجودہ زبانیں بارھویں صدی سے پہلے کی ہوسکتی ہیں؟ اس مسئلے پر تھوڑی سی روشنی ہم پہلے بھی ڈال چکے ہیں۔

چند بردائی

پرتھوی راج جسے رائے پتھورا بھی کہتے ہیں ۱۱۵۹ع میں پیدا ہوا تھا اور ۱۱۹۲ع میں مارا گیا۔ اس کی حکومت اجمیر اور دلی میں تھی۔ وہ شاعروں کا بڑا دلدادہ تھا۔ اننیہ داس اس کا مصاحب تھا، لیکن چند بردائی نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ چند خاندانی شاعر تھا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ مشہور شاعر سور داس اسی کی اولاد میں سے تھا۔ چند نے دربار میں بہت جلد رسوخ پیدا کر لیا اور پرتھوی راج کا وزیر ہوگیا۔ اس کا کلام سترھویں صدی میں میواڑ کے رانا امرسنگھ نے جمع کیا۔ ایسا پایا جاتا ہے، کہ چند کی تصنیف پر نظر ثانی کی گئی اور مشکل الفاظ اور ترکیبیں خارج کردی گئیں۔ باوجود اس کے ' راسا ' کی زبان نہایت پیچیدہ اور غیر مانوس ہے۔ ' راسا ' کے اونہتر باب ہیں جن میں کل ایک لاکھ بند ہیں۔ اس میں نہ صرف پرتھوی راج کے سوانحی حالات بیان کیے گئے ہیں، بلکہ اس زمانے کی تہذیب و تمدن کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے۔ ۱۱۹۲ع میں چند اپنے آقائے نعمت کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا۔

'راسا' میں افسانے اور روایات اس قدر کثرت سے ہیں، کہ صحیح تاریخی واقعات کا پتا نہیں چلتا، یہ جو اس نے لکھا ہے، کہ "پرتھوی راج شکست کھانے کے بعد پھر محمد غوری سے لڑا" سراسر غلط ہے[1] یہ بھی شبہہ کیا جاتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب ایک ہی شخص کی تصنیف ہو سکتی ہے یا ایک ہی شخص کی مختصر سی زندگی میں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ شبہہ یورپ والوں ہی کی طرف سے نہیں ہوتا، بلکہ ہندستان کے فاضل مورخوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے[2]۔ خیر جو کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں، کہ اس نظم کی زبان بہت پرانی ہے۔ اس کے اکثر لغات متروک ہوچکے ہیں، اس لیے یہ خیال کرنا مناسب ہے کہ کم از کم اس کے ابتدائی صفحات چند، ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا شمار ہندی کی قدیم ترین نظموں میں ہے۔ اس کی زبان عام فہم نہیں ہے۔ ماہرین لغات بھی اس کے سمجھنے میں اکثر دقت محسوس کرتے ہیں۔ پھر بھی اس کے ادبی اور لسانی محاسن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

چند بردائی کا لڑکا جلہان، بھی شاعر تھا۔ غالباً 'راسا' کا کچھ حصہ اسی کی تصنیف ہے۔

جگ نایک

'جگ نایک' یا 'جاگ نک' چند بردائی کا ہم‌عصر تھا۔ وہ مہوبہ کے پرمال راجا کا درباری شاعر تھا۔ یہ راجا پرتھوی راج کا دشمن تھا۔ جاگ نک کا کلام نہیں ملتا، البتہ ہندی میں جو 'آلھا' ایک صنف نظم مروج ہے اسی کی ایجاد ہے۔ بعضوں کی رائے ہے کہ 'آلھا' کا موجد چند بردائی ہے۔ شروع میں یہ چیز کاغذ پر لکھی نہیں گئی، بلکہ پشت در پشت زبانوں پر رواں رہی اس وجہ سے جب لکھنے کی نوبت آئی تو ہر طرح کا تصرف ہونے لگا۔ 'آلھا' سے متعلق کوئی دو کتابوں کا مقابلہ کیجیے، تو معلوم ہوگا، کہ نہ صرف ان کی زبان مختلف ہے، بلکہ نظم کے افراد بھی مختلف ہیں۔ بھاٹ لوگ اب بھی 'آلھا' گاتے ہیں، لیکن اس کی زبان بدل کر تاکہ سننے والے اس سے محظوظ ہوسکیں۔ اس نظم کے ہیرو آلھا اور اودل ہیں جنھوں نے جنگ میں مسلمان حملہ آوروں کا دلیری سے مقابلہ کیا

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ہندوستان مصنفہ ونسنٹ اسمتھ۔
[2] تاریخ ہند قدیم مصنفہ آر۔ سی۔ دت

تھا۔ مسٹر واٹرفیلڈ ایک مستشرق نے اس نظم کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ھے۔

سارنگ دھر

'سارنگ دھر' چودھویں صدی کے وسط میں ہوا ھے۔ بعض مورخوں کی رائے ھے کہ وہ چندبردائی کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی دو رزمیہ نظمیں 'ھمیر راسو' اور 'ھمیرکاویہ' پائی جاتی ھیں ان میں 'رن تھم بھور' کے شاھی خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ھے۔ ھمیر، علاالدین بادشاہ سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اس لڑائی میں اس نے مردانگی کی خوب داد دی تھی۔ اس واقعہ کا 'ھمیر راسو' میں تفصیل سے ذکر ھے۔ سارنگ نے سنسکرت کے اشعار کا ایک گل‌دستہ بھی جمع کیا تھا جسے سارنگ دھر پتی کہتے ھیں۔ یہ ۱۳۶۳ع کا کارنامہ ھے۔

ان شاعروں کی اولاد میں بھی بہت سے مشہور شاعر ہوئے۔ ان کی منظوم تاریخیں نہ صرف ادب کی جان ھیں، بلکہ ان میں اس زمانے کی روح کارفرما نظر آتی ھے۔ یونان قدیم اور روما کی تاریخی نظموں کی طرح ان میں بہت کچھ افسانہ گوئی اور شاعری کے عناصر ھیں، لیکن جو کچھ بھی تاریخی مواد ان میں مل جاتا ھے اسے غنیمت سمجھنا چاھیے[1]۔

اس عہد کے دیگر شاعر

اس عہد کے چند اور شاعر بھی قابل ذکر ھیں۔ ان میں بھوپتی، نالا سنگھ، ملا داؤد، اور امیر خسرو کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ امیر خسرو فارسی کے سب سے بڑے ھندستانی شاعر ہوئے ھیں۔ ان کی ھندی شاعری بھی اعلیٰ درجے کی ھے۔ ان کی بدیہہ گوئی کے سب قائل تھے۔ انھوں نے کئی راگ راگنیاں ایجاد کیں جو اب تک موسیقی کی مجلسوں میں برتی جاتی ھیں۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ گورکھ ناتھ ہو گزرے ھیں جو ریاضت (جوگ) کے موجد ھیں۔ انھوں نے سنسکرت اور ھندی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھی ھیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ھیں کہ وہ کبھی اس دنیا میں تھے ھی نہیں، لیکن یہ غلط ھے۔ وہ بارھویں صدی کے آخری قرن میں تھے[2]۔ سنسکرت کی جو

---

۱ چوں‌کہ یہ نظمیں نہایت ثقیل الفاظ سے بھری ہوئی ھیں اس لیے ان کا اقتباس پیش کرنے سے احتراز کیا گیا ھے۔

۲ گورو گورکھ ناتھ، مچھندر ناتھ کے مرید تھے۔ ان کا مٹھ ابھی تک ضلع گورکھ پور میں موجود ھے۔ ان کے بعض گیت ابھی تک زبانوں پر رواں ھیں۔ پروفیسر سرکار نے اپنی کتاب India Through The Ages میں ان کا ذکر کیا ھے۔

کتابیں ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں انھی کی تصنیف ہیں البتہ ہندی کا کچھ کلام ان کے مریدوں کا اضافہ کیا ہوا ہے۔ ان کتابوں کی تاریخ تصنیف ابھی تک معلوم نہ ہوسکی۔ اس عہد کے دیگر شعرا مثلاً دل پت، نرپت نال، کیدار مصنف، جے چند پرکاش، اور مدھوکر مصنف، جس چندرکا، کا محض نام ہی یہاں لیا جاسکتا ہے۔ آخرالذکر دو شاعر پرتھی راج کے حریف جے چندراٹھور کے دربار میں تھے۔

امیر خسرو اپنی زبان اور طرز تحریر دونوں لحاظ سے اس دور کے شعرا میں ممتاز ہیں۔ انھوں نے اس وقت کی بول چال میں شاعری کی ہے۔ بول چال کی زبان ادبی زبان سے الگ تھی، امیر خسرو کی زبان موجودہ کھڑی بولی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ان کی ایک پہیلی نمونۃ پیش کی جاتی ہے، جو اردو زبان کی تاریخوں میں نہیں ملتی[1] -

آدمی کہیے تو سب کو پیارے مدھیہ کہیے تو سب کو مارے
انت کہیے تو سب کو میٹھا کہ کھسرو میں آنکھوں دیٹھا

خسرو ہی کی طرح کے ایک اور شاعر ودیاپتی ہوئے ہیں جن کا اسلوب بیان اپنے زمانے کے تمام شعرا سے نرالا ہے۔ خسرو کی زبان مغربی ہندی کا نمونہ ہے ودیاپتی کی زبان پوربی ہندی یا میتھلی کا نمونہ ہے بنگالی لوگ انھیں بنگالی شاعر مانتے ہیں اور ہندی والے اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔ ان کی شاعری عشقیہ ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ رزم کا زمانہ اب ختم ہو چکا تھا، اس لیے ودیاپتی کی شاعری بدلتے ہوئے زمانے کی آئینہ دار ہے۔

'راسا' پر ایک تنقیدی نظر — شاعروں پر چوں کہ راجا مہاراجوں کی خاص عنایت تھی اس وجہ سے وہ ان کی تعریف ہی میں اپنی ساری قوت نظم صرف کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس طویل دور میں بہت کم اچھے شاعر ہوئے۔ چاند، باگ نک اور دوسرے شعرا کے یہاں شاعرانہ محاسن بہت کم ملتے ہیں۔ یہ ضروری ہے، کہ انھوں نے واقعات میں نمک مرچ لگا کر انھیں جاذب توجہ بنا دیا ہے ۔ پھر بھی ان کی رزمیہ نظم فردوسی اور والمیکی کی نظموں سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ فردوسی جس واقعہ کا بیان کرتا ہے اس کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں

۱ امیر خسرو کی کویتا مرتبہ ناگری پر چارنی سبھا بنارس۔

کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ اس نے اپنے زندہ ممدوح (سلطان محمود غزنوی) کی تعریف نہیں کی ہے، بلکہ ایک قومی ہیرو (رستم) کی۔ چند نے اپنے زندہ ممدوح پرتھوی راج کی مدح کی ہے جس سے کم از کم اس زمانے میں لوگوں کو دلچسپی تھی، یہی وجہ ہے، کہ تراین کی لڑائی کو ابھی ربع صدی بھی نہیں گزری تھی کہ لوگ 'راسا' کو بھول گئے اور خسرو کے طرز کلام کی داد دینے لگے۔ 'راسا' ان تمام صفات کی حامل نہیں ہے، جو ایک قومی نظم میں ہونی چاہییں[1] ۔ اس میں نہ کسی خاص لڑائی کا ذکر ہے، اور نہ اس کا کوئی نتیجہ ہی دکھایا گیا ہے۔ کہیں کہیں حسن و عشق کے واقعات بھی جا بیجا ٹھونس دیے گئے ہیں۔ غالباً شاعر واقعات میں رنگینی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح کے واقعات 'شاہنامہ' میں بھی درج کیے گئے ہیں۔ باوجود تمام خرابیوں کے 'راسا' اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ یہ رنگ دوسری کسی کتاب میں نہیں ہے ایک بات یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان اتنا شاندار ہے کہ سن کر دل میں ولولہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ 'راسا' نے ایسی اچھی مثال قائم کردی، کہ اس کے بعد صدیوں تک کئی 'راسا' لکھے گئے۔

'راسا' اور 'آلھا' میں ایک خاص فرق ہے۔ 'راسا' کی کوئی بحر معین نہیں ہوتی یا کم از کم اس میں عروض کی سختی سے پابندی نہیں ہوتی، لیکن 'آلھا' کی بحریں مقرر ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ 'آلھا' میں 'راسا' کی طرح زیادہ مار کاٹ کا ذکر نہیں ہوتا، بلکہ ہر ایک بات پریم یعنی محبت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر 'آلھا' کا انداز بیان بزمیہ ہوتا ہے۔ اور 'راسا' کا انداز رزمیہ۔ صوبۂ متحدہ کے بعض اضلاع میں جو 'آلھا' اس قدر مقبول ہے اس کی یہی وجہ ہے۔ 'آلھا' کا آخری باب بہت درد ناک ہے۔ تمام بہادر جنگ میں مارے جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں ستی ہو جاتی ہیں۔ صرف آلھا اور اس کا بیٹا اودل بچ رہتا ہے یہ دونوں کسی کجلی بن میں چلے جاتے ہیں اور پھر ان کی خبر نہیں ملتی۔ جس طرح 'پرتھوی راج راسا' کی زبان میں ترمیم و تصرف کا عمل ہوا ہے، اسی طرح 'آلھا' کی زبان میں بھی قطع و برید کی گئی ہے۔ یہ بعض اشعار میں لسانی تفاوت ہونے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے[1] ۔

---

۱ ہندی بھاشا اور ساہتیہ مصنفہ بابو شیام سندر داس

۱ راسا اور آلھا دونوں اصناف میں اور بہت سی نظمیں لکھی گئی ہوں گی، لیکن ان کا کسی کو پتا نہیں۔ ریاست جے پور کے کتب خانے میں اب بھی بہت سے غیر مطبوعہ نسخے ہیں۔

لسانی اتحاد

جب مسلمانوں کی حکومت ہندستان پر قائم ہوگئی تو ہندوؤں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا، اور انھوں نے تسلیم و رضا کا دامن پکڑا۔ ان کی مسلمانوں سے سیاسی کشیدگی رہی ہو، لیکن تمدنی معاملات میں وہ ان کے شریک تھے ۔ خسرو نے ہندو مسلمانوں کی زبان ایک کردی جس سے دونوں قوموں میں میل جول پیدا ہوا[1] ۔ اسی طرح کبیر نے دونوں قوموں کے مذہبی خیالات میں یکسانیت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ خسرو کی زبان صاف اور منجھی ہوئی ہے ۔ اب بھی اگر اس زبان کو ہم اپنائیں تو اردو ہندی کی کشمکش دور ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے، کہ خسرو کے یہاں عوام کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے پھر بھی خسرو کی زبان عوام کی زبان ہو سکتی ہے۔

نثر

محمد حسین آزاد مرحوم کا قول ہے کہ " ہر زبان میں نظم کی ابتدا نثر سے بہت پہلے ہوتی ہے"[2] یہ بالکل درست ہے۔ صدیوں تک نظم ہی کا دور رہتا ہے، نثر کی کوئی کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ ہندی لٹریچر اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ 'راسا' اور 'آلھا' کے پرآشوب زمانوں میں تو کوئی نثر کاہے کو لکھتا۔ ہاں جب امن و سکون قائم ہوا تو گورکھ ناتھ جی نے کچھ کتابیں نثر میں لکھیں۔ ان میں زیادہ تر پندو نصائح ہیں۔ ان کا موازنہ دکن کی ان قدیم کتابوں سے کیا جا سکتا ہے، جو صوفیاء اور واعظین حضرات کی تصانیف ہیں۔ ان کتابوں کی زبان کیا ہے؟ یہ ہی بتانا بہت مشکل ہے ۔ کیونکہ جیسا ہم نے پیشتر لکھا ہے، کہ اپ بھرنش ارر پرانی ہندی میں امتیاز کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ڈاکٹر کاشی پرشاد جیسوال کی رائے ہے، کہ پرانی ہندی دسویں صدی میں لکھی جانے لگی تھی جس کی مثال بدھ سین کی شاعری ہے۔ اس لیے ہم تسلیم کرلیتے ہیں، کہ یہ کتابیں پرانی ہندی میں ہیں۔ جس طرح شور سینی، ماگدھی، مہاراشٹری اور پشاچی وغیرہ زبانیں ملک کے مختلف حصوں میں رائج تھیں، اسی طرح پرانی ہندی بھی کسی ایک صورت میں سارے ملک میں رائج نہیں رہی ہوگی۔ آب و ہوا کے اثر سے اس کی صورت جگہ جگہ مختلف رہی ہوگی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ادبی زبان کا نام 'پنگل'

[1] اس میل جول کا اثر تھا کہ مہارانہ پرتاب کی تحریک کامیاب نہ ہوئی۔ اور نہ کسی شاعر نے ان کی سچی بہادری کا ترانہ گایا۔

[2] آب حیات

تھا اور بول چال کی زبان کا نام 'ڈنگل' - اس فرق نے اس تقسیم کو اور آگے بڑھا دیا۔ 'پنگل زبان' کی بہترین تصنیف 'پرتھوی‌راج راسو' ہے اور 'ڈنگل' کی بہترین تصنیف 'بیل دیو راسو' خسرو نے جو کھڑی بولی رائج کی وہ 'شور سینی' سے نکلی ہے۔[1]

ایک اہم خصوصیت

چند بردائی سے لے کر امیر خسرو تک جن شاعروں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ وہ جو کچھ بھی کہتے تھے وہ ان کے دل کی نکلی ہوئی بات ہوتی تھی۔ یہ رنگ خسرو کے بعد بھی عرصے تک قائم رہا، لیکن جب فن اور زبان کی شاعری نے فروغ پایا تو شاعری میں تصنع کا رنگ جھلکنے لگا۔ وہی پرانی باتیں نئے اسلوب سے بیان کی جانے لگیں۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن دقت یہ تھی، کہ اپنے دل کی کوئی بات نہیں کہی جاتی تھی۔ اکبری دور کے کسی شاعر کے یہاں رانا پرتاب کا ذکر بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ادب کا قالب تو سلامت تھا، لیکن اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ شیوا جی کے زمانے میں بھوشن، متی رام اور چنتا منی ایسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے واقعات زمانہ کا بیان اپنا شعار شاعری سمجھا۔ جب سکھوں نے زور پکڑا تو شاعروں نے پھر رزمیہ نظمیں کہنی شروع کردیں، لیکن چوں‌کہ مجموعی حیثیت سے شاعری کا مذاق کم ہو گیا تھا اس لیے یہ تحریک بارور نہ ہو سکی۔

بھگتی تحریک کے شاعر (سنہ ۱۴۰۰ء — ۱۵۵۰ء)

علم ادب کا احیاء

خسرو کے بعد کچھ عرصے تک ادب کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زمانہ شعر و شاعری کے لیے سازگار نہ تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس دور میں مذہب کا بہت زور رہا۔ مذہب کی تبلیغ کے معاملے میں شاعری کو ایک ناکارہ سی چیز سمجھا جاتا ہے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے نظم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آخر جس مذہبی تحریک نے ہندی شاعری کو دیس نکالا دیا تھا وہ ہی ڈیڑھ دو سو برس کے بعد اس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ شمالی ہندستان میں ویشنو مذہب کا پھیلنا تھا کہ ہندی ادب میں جان

---

[1] بعض علمائے ادب کا خیال ہے کہ کھڑی بولی پنجاب کی پشاچی زبان سے نکلی ہے، لیکن یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو « دکن میں اردو » مولفہ سید نصیر الدین ہاشمی۔

پڑ گئی ۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد هندوؤں میں ایک بھاگ دوڑ سی مچ گئی، یہی حال ۱۲۵۳ع میں قسطنطنیہ کا هوا تھا جسے ترکوں نے فتح کیا وهاں کے یونانی عالم ادهر ادهر بھاگنے لگے۔ بختیار کے بیٹے محمد خلجی نے جب بہار فتح کیا، تو سارا هندستان سہم گیا، بڑے بڑے گنی پنڈت ادهر ادهر بھاگ نکلے۔ پھر بھی وشنو دهرم نے زور پکڑا۔ اس تحریک کو تین شاخوں میں تقسیم کر سکتے هیں (۱) رام کی بھکتی (۲) کرشن کی بھکتی اور (۳) خدا کی بندگی۔

یہ ضروری نہیں هے کہ ان تحریکوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھا جائے، کیوں‌کہ ان میں بہت سی باتیں عام هیں۔ یہ هر ویشنو مانتا هے چاهے وہ کسی فرقے کا هو، کہ خدا انسان کی صورت میں جلوہ‌گر هوتا هے یعنی اوتار لیتا هے اس کے آگے لوگ سر اطاعت خم کرتے هیں۔ یہی مکتی حاصل کرنے کا واحد راستہ هے۔ یہ فلسفہ بہت دل‌کش تھا اس کے مقابلے میں برهمنوں کا فلسفہ وحدانیت جس کے مصنف شنکر آچاریہ تھے بہت خشک تھا۔ لوگوں نے ویشنو دهرم کی زیادہ سے زیادہ پیروی کی۔ برهمنی مذهب کو خیر باد کہتے گئے۔ اس لیے کہا جا سکتا هے، کہ ویشنو تحریک برهمنوں کی مخالفت میں پیدا هوئی تھی ۔ ویشنو مذهب کا مقابلہ موجودہ زمانے کی تھیاسوفی Theosophy سے کیا جاسکتا هے جس میں محض رسم و رواج کی پابندی هی نہیں، بلکہ یہ سکھایا جاتا هے کہ «محبت خدا هے اور خدا محبت هے» پھر ویشنو مذهب کیوں نہ مقبول عام هوتا۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی هے۔ وہ یہ کہ اس نے سنسکرت کو چھوڑ کر عام بول‌چال کی زبان میں دهرم کا پرچار شروع کیا۔ اس لیے مذهب کے دائرے میں اس نے جو کچھ کیا وہ تو الگ ایک چیز هے۔ لٹریچر پر اس کے احسانات بہت زیادہ هیں۔ قدیم هندی نظم کا سب سے خوش‌گوار حصہ وهی هے جو رام اور کرشن کے بھکتوں نے لکھا هے۔

بھکتی کا آغاز

یہ مانی هوئی بات هے کہ بھکتی تحریک کی ابتدا رامانند سے هوئی، لیکن ان سے پہلے بھی بعض بزرگ گزرے هیں جنھوں نے رامانند کے لیے راستہ تیار کیا تھا۔ سکھوں کی مقدس کتاب ، آدی گرنتھ صاحب[۱] هے

۱ ، گرنتھ صاحب ، کسی ایک کی تصنیف نہیں۔ اس میں بہت سے شاعروں کا کلام پایا جاتا هے۔ کبیر کا بہت سا کلام ، گرنتھ ، میں هے۔ قدیم ترین بھگتی شاعروں کے اشعار بھی اس میں پائے جاتے هیں ؛ اس لحاظ سے یہ ایک نادر کتاب هے۔

جسے ۱۶۰۴ع میں گرو ارجن نے مرتب کیا تھا۔ اس میں بھگتی کے اشعار نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان سے بہت پہلے سدن اور نام دیو دو شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں بہت زیادہ حسن اور شیرینی ہے۔ عہد قدیم کا ایک اور شاعر ہے، جس کا نام جے دیو ہے، یہ 'گیتا گوبندا نامی' مشہور کتاب کا مصنف بھی کہا جاتا ہے، لیکن جس جے دیو کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ اور ہی شخص تھا۔ اس کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ اس کا کلام ہی دستیاب ہو سکا۔

سدن پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس کی پیدایش سندھ میں کسی قصاب کے گھر ہوئی تھی، لیکن اس نے اپنا آبائی پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا اور ساری زندگی یاد اللہ میں گزار دی۔ 'گرنتھ صاحب' میں اس کے دو بند ملتے ہیں۔

نام دیو، مرہٹہ دیس کا رہنے والا تھا۔ اور پورندر پور کے وٹھوبا کا چیلا تھا۔ وہ غالباً پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ ذات کا درزی تھا۔ پہلے اس نے پیشے کی طرف بہت توجہ دی، لیکن جب اس میں طبیعت نہ لگی تو ڈکیتوں کی ٹولی میں شامل ہوگیا، آخرکار اس نے اس مکروہ پیشے سے توبہ کی اور سادھو ہوگیا[1] اس کی شاعری کا زمانہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نام دیو نے اپنی مادری زبان مرہٹی میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ہندی میں بھی اس کا کلام بہت کافی ہے۔ نہ صرف بحیثیت مذہبی رہنما کے، بلکہ بحیثیت شاعری کے بھی اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کے بہت سے اشعار 'گرنتھ صاحب' میں موجود ہیں۔ نام دیو کی مختلف الحیثیات شخصیت بہت دلچسپ ہے۔ مذہبی تحریک ہو یا ادبی کارنامے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کے پائے کے کہے جاسکتے ہیں۔

راماننند

راماننند شاید سنہ ۱۴۰۰ع سے ۱۴۷۰ع تک زندہ رہے۔ انھوں نے رام‌چندر کو خدا کا اوتار مانا ہے اور اس کی تعلیم شروع ہی سے دیتے رہے۔ ان کے خیال میں رام کی بھگتی سعادت اکبر ہے۔ جس سے انسان آواگون کی کی زنجیروں سے نجات پاجاتا ہے۔ راماننند اس تخیل کے بانی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے نام دیو اور سدن یہی درس دے گئے تھے، لیکن ان کی تعلیم کسی باقاعدہ تحریک

---

[1] والمیکی مصنف راماین کے بارے میں بھی اسی طرح کا قصہ مشہور ہے۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر کی نسبت بھی ایسی ہی روایت ہے۔

کی صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آئی۔ راما نند کو زمین تیار ملی لہذا انھیں اپنی تحریک میں بڑی شان‌دار کامیابی نصیب ہوئی۔ انھوں نے مقدس بنارس کو اپنی تعلیم کا مرکز بنایا اور خود بھی یہیں رہنے لگے۔ راما نند ہندستان کے عظیم‌ترین مذہبی رہنماؤں میں سے ہیں۔ ان کا مت اس قدر پھیلا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندستان کا مذہب ہی ایک ہو گیا۔ وہ نہ صرف اپنے پیروکاروں میں قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے، بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی انھیں اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

لیکن اس پرعظمت زندگی سے ادب کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ بحیثیت شاعر کے راما نند کا مرتبہ بلند نہیں ہے۔ 'گرنتھ صاحب' اور بعض دیگر مجموعوں میں ان کا ہندی کلام موجود ہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ خدا انسان کے دل میں ہے۔ اس کا نور ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے۔ پھر ہم کیوں اسے مندر یا مسجد میں ڈھونڈھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ راما نند بت پرستی کے خلاف تھے گو انھوں نے اس طرز عبادت پر حرف ضرور رکھا ہے۔ وہ رام کے بھگت تھے، لیکن بت‌پرستی کو روا سمجھتے تھے۔ تثلیث کے مسئلے کے بھی وہ قائل تھے۔ اور ہندو دیومالا کی بڑی قدر کرتے تھے۔

بھکتی دھرم کا خاص اصول یہ ہے، کہ سچی لگن سے انسان کیا پرمیشر بھی مل جاتا ہے۔ کون انسان ہے جسے پرمیشر کی تلاش نہ ہو؟ اس وجہ سے راماانند کے مریدوں میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقے اور طبقے کے لوگ شامل ہوگئے۔ ہندو مسلمان شودر، اچھوت، مرد، عورت سب نے ان کے مذہب کو لبیک کہا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس مساوات اور رواداری کے باوجود بھی ذات پات کی بندھن نہیں ٹوٹی، بلکہ دن بدن مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے، کہ در پردہ برھمنوں کا اب بھی زور تھا اور مذہب اسلام کے سامنے ذات پات کی مضبوط دیوار قائم کرنے کا جذبہ دن بدن دلوں میں موج‌زن ہوتا جا رہا تھا۔ راما نند اور ان کے چیلوں نے سنسکرت کو دور ہی سے سلام کیا اور ہندی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ ٹھیرایا۔ ہندی کی تحریک اس طرح ایک مخصوص طبقے سے نکل کر عوام تک پہنچی۔

راماانند کے شاگردوں میں بارہ زیادہ مشہور ہیں، جن کا کلام ابھی تک محفوظ چلا آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر راجا پیپا ہیں، جو گگردن‌گڑھ کے راجا تھے ان

کی ولادت سنہ ۱۴۲۵ع میں ہوئی تھی۔ راما نند کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد انھوں نے راج پاٹ چھوڑ دیا اور فقیر ہوگئے۔ دوسرے 'دھن جاٹ' تھے جو ان سے دس سال پہلے پیدا ہوئے تھے ان کی نسبت مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ سین، راجا ریواں کا نائی تھا اس کے بعض دوہرے 'گرنتھ صاحب' میں موجود ہیں۔ بھاؤنند 'امرت دھار' نامی کتاب کے مصنف تھے' اس کا موضوع 'ویدانت' ہے۔ یہ کتاب چودہ فصلوں میں ہے۔ ریے داس چمار تھے' لیکن ان سے زیادہ سچا بھگت شاید بھکتی کی تاریخ میں کبھی نہ پیدا ہوا ہوگا۔ ریے داس جیتے تھے تو رام کے لیے اور مرتے تھے تو رام کے لیے۔ میرا بائی انھی کی چیلی تھی۔ ریے داس کے تیس حمد 'گرنتھ صاحب' میں درج ہیں[1]۔

کبیر داس

مذہبی تحریک میں بھی اور شاعری میں بھی دونوں حیثیتوں سے کبیر داس راما نند کے شاگرد رشید کہے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ کہ وہ کسی بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے اپنی لاج رکھنے کے لیے بچے کو بنارس کے قریب کسی تالاب میں پھیک دیا۔ ایک جولاہے نے جس کا نام نیرو تھا یہ دل‌خراش منظر دیکھا اور تالاب میں کود کر بچے کو نکال لایا۔ اس کی بیوی کا نام سخیہ تھا۔ یہ بیچارے اولاد کو ترس گئے تھے اس لیے انھوں نے اس بچے کو پالا اور اس کا نام کبیر رکھا۔ کبیر کی نسبت ایک روایت اور ہے۔ جب وہ بچے تھے تو ان سے ہندو مسلمان دونوں ناراض ہوگئے 'ہندو اس وجہ سے برہم تھے' کہ کبیر نے اچھوتوں کو زنار پہننے کی اجازت دے دی تھی۔ مسلمان اس باعث خفا تھے' کہ انھوں نے رام کو خدا کا اوتار مانا تھا۔ لوگ انھیں طعنے دیتے تھے' کہ تمھارا تو کوئی گرو ہی نہیں۔ کبیر کے لیے یہ کلنک کا ٹیکا تھا۔ اسے مٹانے کے لیے انھوں نے رامانند سے بیعت کی۔ پہلے اس میں کلام تھا کہ گرو انھیں اپنے مریدوں میں شامل کریں گے یا نہیں؟ اس لیے انھوں نے یہ سوانگ رچا کہ بھور کے وقت گھاٹ کی سیڑھی پر لیٹ گئے۔ ادھر ہی سے گروجی کا گزر ہوتا تھا۔ جب وہ سیڑھی کے سہارے نیچے اترنے لگے تو ان کے پیر کبیر کے بدن سے لگ کر لڑکھڑا گئے اس پر انھوں نے «رام رام» کہا۔ یہ کہنا تھا کہ کبیر کی مریدی پوری ہوگئی۔ کبیر

[1] ان شاعروں کا نمونہ کلام ہم رسالہ اردو کی صفحات میں پیش کر چکے ہیں، یہاں ان کا اندراج طوالت سے خالی نہیں، اس لیے جہاں تک ہوسکا ہے ان کی خصوصیات بتانے پر اکتفا کی گئی ہے۔

راما نند کے نقش قدم پر چلنے لگے ۔ بعد میں وہ اپنے گرو سے بہت آگے نکل گئے
ان کا مذہب کبیر پنتھ کہلاتا ہے جس کے ماننے والے اب بھی شمالی ہندستان میں
کثرت سے ہیں۔ کبیر مسلمان تھے اس وجہ سے ان کی تعلیم میں اسلامی رنگ بھی
پایا جاتا ہے۔ انھوں نے خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیا ہے۔ خدا کے لیے وہ رام،
ہری، گوبند اور اللہ وغیرہ ہر طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کبیر کو اوتاروں پر
اعتقاد نہ تھا۔ بت پرستی اور دیگر ہندوانی طریقوں سے انھیں سخت کد تھا۔ چوں کہ
لوگ برہمنوں کی زیادتیوں سے تنگ آگئے تھے اس وجہ سے انھیں کبیر کی تعلیم
بہت پسند آئی۔ کبیر کو ہندستان میں وہی کامیابی نصیب ہوئی جو ان سے تقریباً
دو ہزار برس پہلے گوتم بدھ کو ہوئی تھی۔ ہندستان میں جو مذہب اس قدر
ہردل عزیز ہے۔ وہ انھی مہاتماؤں کی تعلیم کا اثر ہے[1] ۔

کبیر پنتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف کبیر کے چیلے ہی نہیں، بلکہ
اور متوں کے ماننے والے بھی ان کے اصولوں سے بہت فیض اٹھاتے ہیں۔ ان فرقوں
کے پھیل جانے سے شاعری کا رواج بہت زیادہ ہوگیا اور ادب کا ذخیرہ وسیع ہو گیا۔
کبیر کی نسبت سینکڑوں روایات مشہور ہیں لیکن ان میں بہت کم صداقت کی کسوٹی
پر پوری اترتی ہیں ۔ کبیر نے اپنے مذہبی خیالات کی دھن میں کبھی کبھی اپنے
کنبے والوں کو ناراض بھی کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ساری قوم ہندو مسلمان بھی
ان سے ناراض تھے یہ چیز ہر گھڑی ان کے لیے سوہان روح رہی۔ لوگ سمجھتے تھے
کہ کبیر ان کے دھرم کا ستیاناس کر رہے ہیں ۔ سکندر لودھی جو اس زمانے میں
بادشاہ تھا کبیر پر بہت برہم ہوا، اور انھیں قید کردیا۔ رہائی کے بعد انھیں حکم
دیا کہ بنارس سے نکل جائیں۔ آخر انھیں بنارس چھوڑنا پڑا اور مگھر ضلع گورکھ پور
میں قیام کرنا پڑا۔ یہیں پیرانہ سالی میں ان کا انتقال ہوا۔

کبیر کی نظمیں بے شمار ہیں جس کا ایک نادر مجموعہ بابو شیام سندر داس
نے شائع کرایا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے بھگتی تحریک پر سیرحاصل
روشنی ڈالی ہے۔ کبیر نے جو عورت کی مذمت کی ہے اس کی تردید بھی بابو صاحب
نے کر دی ہے (دیکھو، کبیر گرنتھاولی،) کبیر کے مذہب، ان کے گرو کا نام ان کے

[1] کبیر کے پیر شیخ تقی نامی ایک بزرگ تھے۔ کبیر کے دو چیلے دھرم داس اور گوپال بہت مشہور
ہیں۔ کبیر کی بیوی کا نام لوئی اور بیٹے کا نام کمال تھا۔ شیام سندر داس

شاگردوں کی تعداد اور ان کے سنہ وفات کی نسبت سخت اختلاف ہے، لیکن ڈاکٹر میورو کی سند پر ہم نے جو حالات کبیر کے درج کیے ہیں وہی تحقیق سے صحیح معلوم ہوتے ہیں[۱] ۔

کبیر کا مذہب صوفیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ یہاں تک کہ کبیر پر بھی بادشاہ وقت کا قہر اسی طرح نازل ہوا جس طرح ایران میں منصور حلاج پر اناالحق کہنے کے باعث نازل ہوا تھا۔ کبیر کی آزادہ روی ان کے ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ وہ دنیا کو مایا جال سمجھتے تھے اس لیے اس کی ترغیبات میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مذہب انسان کا مذہب تھا۔ ہندو مسلمان کا مذہب نہیں تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے اپنے کلام کو خود تحریر کا جامہ نہیں پہنایا۔ یہ ان کے شاگردوں نے کیا ہوگا۔ کبیر کے بہت سے مجموعے موجود ہیں، لیکن ان میں بہت سا حصہ ایسا ہے جس کے وہ مصنف نہیں تھے۔ 'گرنتھ صاحب' میں ان کا کلام سب سے زیادہ ہے ایک مجموعہ «بیجک» (مخفی خزانہ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ یہ کتاب کبیر پنتھیوں کی مذہبی اور مقدس کتاب ہے۔ اس کے مولف بھارگوداس تھے جو کبیر کے بڑے معتقد تھے یہ کوئی مسلسل نظم نہیں ہے۔ اس میں بہت سی نظمیں ہیں جن میں اکثر کی بحریں مختلف ہیں۔ 'راماینی' نامی مجموعۂ کلام میں ان کے تمام مذہبی اصول اکھٹے کر دیے گئے ہیں۔ 'سبدہ' نامی اسی طرح کی نظم ہے، لیکن اس کی بحر 'رامانی' سے مختلف ہے۔ 'چوں تیا' میں ناگری رسم الخط کی مذہبی اہمیت کا ذکر ہے۔ 'وپرستیسی' میں برھمنوں کی قدامت پرستی پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ کہرا، بسنتا، بیلی، چانچری، برھولی اور ہندولابھی، مذہبی، رنگ کی نظمیں ہیں۔ جن طرحوں میں یہ نظمیں لکھی گئیں ہیں ان کے بھی یہی نام ہیں۔ ان نظموں میں لگ بھگ چارسو ساکھی (بند) ہیں۔ 'گرنتھ' کا وہ حصہ جو کبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، سب کا سب انھی کی تصنیف نہیں، اسی طرح 'بیجک' جو کبیر کی تصنیف سمجھی جاتی ہے اس میں آدھے سے زیادہ اشعار دوسروں کے کہے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ ہزار سے زیادہ دوھے کبیر کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ 'کبیر چورا' بنارس میں کبیر کی ایک کتاب ملی ہے اس میں کبیر کے کلام کا بیش تر حصہ ملتا ہے۔

۱۔ Antiques of the North Western Provinces by Firehrer.

اس میں بیس ابواب ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر حصے شاگردوں کے لکھے ہوئے ہیں، لیکن یہ شائع نہیں ہوئے ہیں۔ بیجک اودھی زبان میں ہے۔ کبیر کی شاعری عام زبان میں ہے، جس میں اکثر اوقات صوفیت بہت کھٹکتی ہے[۱]۔ زبان تو گنوارو ہے ہی، اسلوب بیان بھی سخت عامیانہ ہے۔ الفاظ ایک دوسرے میں زبردستی گونتھ دیے گئے ہیں[۲]۔ صرفی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ جملے ادبی حیثیت نہیں رکھتے۔ گنواروں کی بول چال کے کام آسکتے ہیں۔ صنعت ایہام اور صنائع بدائع کی اس قدر بھر مار ہے کہ مطلب گم ہوجاتا ہے۔ باوجود ان سب خامیوں کے کبیر کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔ پاکھنڈ یعنی ظاہر پرستی کے انھوں نے پرچخے اڑا دیے خدا پرستی کا صحیح اور سب سے آسان راستہ بتایا۔ یہی ان کی شاعری کی جان ہے ان کے اشعار دل میں چبھنے والے اور جذبات کو ابھارنے والے ہوتے ہیں۔ ہندی شاعری کا انھیں باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ہندی شاعری میں جو ایک صنف حمدوثنا کی بہت مقبول ہے اس کے بانی یہی ہیں۔ ان سے پیش تر جو شعرا گزرے ہیں ان کی تعلیم اس قدر عام نہ ہو سکی تھی۔ کبیر نے مختلف مذاہب اور اعتقادات کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ کبیر کے بعد جو لوگ ہوئے وہ انھی کے نقش قدم پر چلے[۳]

ایک خاص بات جو کبیر اور ان کے عصر کے تمام ممتاز شعرا میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ایک خاص پیغام کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری شاعری میں آج یہ نقص بتایا جاتا ہے، کہ "ہم خود نہیں جانتے کہ ہم کیا کہ رہے ہیں" یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ ہندی اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی جمع پونجی وہی چند عشقیہ باتیں، ہجر و فراق اور زارو نالی کے مضامین ہیں۔ ہم اس بدنما داغ کو دھونے کے لیے اس سے بہتر کام اور کیا کرسکتے ہیں کہ کبیر، نانک، اور چیتنیہ کی طرح اپنی شاعری کا ایک خاص مقصد بنالیں؟ دنیا کے تمام

---

۱ کبیر نے خود لکھا ہے "میری بولی پوربی"۔ لیکن ان کی زبان اودھی۔ راجستھانی اور پوربی کا معجون مرکب ہے ــ شیام سندر داس

۲ کبیر کے اشعار کھردرے ہیں ان میں ادبیت کی چاشنی نہیں ہے ــ شیام سندر داس

۳ کبیر کے خیالات ہندستان میں اس قدر مقبول ہیں کہ طوطئی ہند ٹیگور مرحوم نے ان کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور انھی کے خیالات سے مستفید ہوکر خود بھی "گیتان جلی" لکھی ہے۔ "کبیر کی سو نظمیں" مؤلفہ رابندر ناتھ ٹیگور۔

مہذب ملکوں میں یہی ہو رہا ہے۔ ہندستان میں بھی اس کی بنیاد پڑ رہی ہے، لیکن ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

کبیر کے ایک بیٹے کمال نامی تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کی تمام تعلیم کو مٹی میں ملا دیا اور اس کی سخت تردید کی۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ:-

ڈوبا بنس کبیر کا اپجا پوت کمال

نانک کبیر کی تعلیم سے جتنے مذاہب پیدا ہوئے ان میں نانک کے مذہب نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ نانک کا زمانۂ حیات سنہ ۱۴۶۹-۱۵۳۸ء تک کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نانک جب ۲۷ برس کے تھے، تو ان کی ملاقات کبیر سے ہوئی۔ ان کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ نانک کے خیالات کبیر کی شاعری میں جھلکنے لگے۔ کبیر نے بھی «گرنتھ صاحب» تصنیف کی لیکن نانک ہندو مذہب سے بہ نسبت کبیر کے زیادہ قریب ہیں نانک اپنے شاگرد مردان کے ساتھ ادھر ادھر پھرتے رہے[1]۔ مردان کو ساز بجانے میں بڑی مہارت تھی۔ اس کے گانے ملتے ہیں۔ ان میں پنجابی اور ہندی کی کھچڑی ہوتی ہے۔ اگرچہ بہ‌حیثیت شاعر اس کا مقابلہ کبیر سے نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی اس کے اشعار میں شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ نانک کے بہت سے چیلے تھے۔ وہ اپنے گرو کے بھجن عبادت کے وقت گاتے تھے۔ «گرنتھ صاحب» میں نانک کا کلام کثرت سے ملتا ہے[2]۔

کرشن مت راماننده، کبیر اور نانک کے پیروکاروں نے اپنا معبود رام چندر کو مانا، انھیں یہ خدا کا اوتار سمجھتے تھے۔ راما نند نے بت پرستی پر اعتراض نہیں کیا، لیکن کبیر اور نانک نے اس کے خلاف سخت جہاد کیا۔ وہ رام کو خدا کا اوتار بھی نہیں مانتے تھے۔ رام کو اوتار ماننےوالوں کے علاوہ ایک اور فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو کرشن جی کو ایشور کا اوتار مانتا تھا۔ کرشن‌مت کا سنگ بنیاد بہت پہلے ہی پڑچکا تھا، لیکن اب جو دیسی زبانوں میں اس مت کا پرچار ہونے لگا تو ہر خاص و عام کی توجہ ادھر ہونے لگی۔ شاعروں کو بھی یہ چیز بھا گئی۔ کرشن جی کی ‹بال‌لیلا› ایک دل‌چسپ داستان ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ دل‌چسپ رادھا کرشن کا پریم ہے۔ «رادھا کرشن» ہندی میں ایک عشقیہ موضوع ہے اسے وہی حیثیت

---

۱ نانک صاحب اولاد بھی تھے، لیکن بعد میں انھوں نے ترک و تجرید اختیار کرلی تھی۔

۲ نانک کی بعض فارسی غزلیں بزرگوں کی زبانی سنی ہیں، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔

حاصل ہے جو فارسی میں «شیریں فرہاد» کو اور عربی میں «لیلیٰ مجنوں» کو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی حیثیت مذہبی ہے اور اسے زیادہ تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تھوڑی سی عریانی بھی اس کے لیے مناسب نہیں۔ کرشن کو شاعری کا اوتار مانا جاتا ہے، اسی وجہ سے جس قدر شاعری کرشن پر کی گئی ہے اتنی شاید ہندو دنیا کی کسی ہستی پر نہ کی گئی ہوگی۔ پہلے پہل یہ مضمون قدیم سنسکرت شاعر جےدیو کو سوجھا تھا یہ وہی جےدیو ہے جس کی تصنیف «گیتا گوبندا» مشہور ہے۔ چودھویں صدی میں ودیاپتی نے بنگالی شاعری میں اسے رواج دیا۔ پندرھویں صدی میں گجراتی شاعر نرسنگھ مہتا نے اپنا سارا زور قلم اسی موضوع پر صرف کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی نے ہندی میں یہ طرز ایجاد کی۔

ودیا پتی ٹھاکر جو ضلع در بھنگہ صوبۂ بہار کے رہنے والے تھے، ایک مشہور ویشنو شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں سے مشرقی ہندستان کو نغمہ‌زار بنا دیا۔ ان نغموں کی گونج صدیوں تک رہی۔ افسوس کہ ان کی زندگی کے حالات اچھی طرح معلوم نہ ہو سکے۔ سنا ہے کہ وہ سنسکرت میں بھی شاعری کرتے تھے، لیکن ان کی شہرت کا مدار ان کے وہ گیت ہیں جو انھوں نے میتھلی (بہاری) زبان میں لکھے تھے۔ وہ رادھا کرشن کی محبت کو اس کے مادی معنوں میں نہیں لیتے، بلکہ اس سے روح اور خدا کے باہمی تعلقات کی تشریح کرتے ہیں۔ ان کی بعض نظموں کا بنگالی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سری چیتنیہ جو بنگالی میں ایک بڑے مہاتما گزرے ہیں ان کی شاعری بھی اسی رنگ میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوجائے گا، کہ ودیاپتی کی شاعری ادبی حیثیت سے کس قدر بلند ہے۔ ان کے کوئی ہم عصر اما پتی تھے، جنھوں نے میتھلی اور بنگالی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔

میرا بائی | اسی زمانے میں میرا بائی کے کلام کی بھی بڑی شہرت ہوئی۔ جو بھگتی ودیا پتی نے اپنے نغموں سے مشرقی ہند میں پھیلائی، وہی میرا نے اپنے گیتوں سے مغربی ہند میں پھیلائی۔ میرا کے واقعات زندگی کی نسبت مورخوں میں بہت سخت اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ وہ میواڑ کی رانی تھی۔ بھوج راج ولی عہد سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ بھوج راج تخت نشین ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اس کا قاتل خود اسی کا چھوٹا بھائی تھا جس نے اپنے باپ کنبھ کو بھی مروا ڈالا۔ اس شہزادے کا نام اودے کرن تھا۔ اس خوں ریزی کے بعد وہ تاج و تخت کا مالک ہوا۔

میرا، کرشن کی بھگتنی تھی۔ وہ ہندوؤں کی رسم رسومات کی قائل نہ تھی۔ اس لیے گھر والے اس سے خوش نہ رہتے تھے۔ اودے کرن نے اسے اس قدر ستایا کہ بےچاری تنگ آکر چتور سے بھاگ نکلی اور متھرا جاکر رےداس کی چیلی بن گئی، میرا کو بھگوان کرشن سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کہتے ہیں کہ بعض اوقات اس پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ رےداس چوں‌کہ راما نند کے مرید تھے، اس لیے رام جی کے بھگت تھے پھر معلوم نہیں کہ میرا نے جو کرشن جی کی بھگت تھی کیوں‌کر انھیں گرو کے لیے انتخاب کیا۔ ممکن ہے کہ گرو اور چیلی کے خیالات میں تھوڑا تھوڑا تغیر پیدا ہوکر بالاخر یکسانیت ہو گئی ہو۔ میرا کی بعضی نظموں میں رےداس کا نام آیا ہے۔ کہیں کہیں کرشن کی جگہ رام کا نام لیا ہے۔ میرا کی زبان برج بھاشا ہے جو بہت صاف شستہ اور شیریں ہے۔ بہت سی گجراتی نظمیں بھی میرا بائی کی تصنیف کہی جاتی ہیں۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے؟

ولبھ آچاریہ کرشن بھگتی ولبھ آچاریہ کی وجہ سے بہت پھیلی۔ وہ سنہ ۱۴۷۹ء میں بمقام بنارس پیدا ہوئے تھے۔ برج میں ایک مقام 'گوبردھن' ہے یہاں انھوں نے کرشن کا مندر بنایا۔ یہیں سے ان کی تعلیم سارے ملک میں پھیلی۔ ولبھ نے سنسکرت میں کئی کتابیں لکھی ہیں، لیکن ہندی میں ان کی کوئی تصنیف یادگار نہیں۔ باوجود اس کے ان کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے شاعروں نے بھگتی کے گیت گائے۔ سنہ ۱۵۳۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وٹھل ناتھ جو ان کے بیٹے تھے ان کے جانشین ہوئے، وٹھل نے ہندی میں نظم لکھی ہے، لیکن بعض مستند تاریخ نویسوں کی رائے ہے کہ یہ ان کی تصنیف نہیں ہے[1]۔ نظم کے علاوہ نثر میں ایک کتاب ''منڈن'' نامی ان سے یادگار ہے۔ یہ ہندی نثر کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس کی زبان برج بھاشا ہے۔ ولبھ اور وٹھل کے چار چار شاگرد تھے۔ ان سب کو ملاکر ''اشٹ چھاپ'' کہا جاتا ہے۔

بھگتی تحریک تین اجزا پر منقسم ہے۔ اول وہ شاعر جو رام کو اوتار مانتے تھے اور بت پرستی کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو رام کو اوتار تو مانتے تھے، لیکن بت پرستی سے نفرت کرتے تھے اور تیسرے وہ جو کرشن کی پوجا کرتے تھے۔ ان سب

۱ F. E. Keey

تحریکوں میں پرچار کا کام ہندی زبان میں ہی ہوتا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوا کہ ان تحریکوں کا اثر عام لوگوں تک پہنچا بلکہ عام لوگوں کی زبان سے ہندی مالا مال ہوگئی۔ مدتوں تک ہندی شاعری بھگتی کے خیالات سے مالا مال رہی

ملک محمد جائسی

قدیم تاریخی نظموں کا رواج بہ نسبت مذہبی نظموں کے عوام میں زیادہ ہوا۔ ابھی تک تاریخی اور مذہبی نظمیں ایک دوسرے سے الگ تھیں لیکن ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' ایسی نظم ہے جو نہ صرف تاریخی حیثیت رکھتی ہے بلکہ مذہبی خیالات کی بھی حامل ہے۔ جائسی مسلمان تھا، لیکن کبیر کی تعلیم نے اسے ہندو کلچر کا شیدائی بنا دیا تھا۔ امیٹھی کے راجا نے اس کی بہت قدر کی۔ جائسی نے امیٹھی ہی میں انتقال کیا۔ وہاں اب تک اس کی قبر موجود ہے۔ 'پدماوت' کے علاوہ ایک مذہبی نظم 'اکھراوٹ' بھی جائسی سے یادگار ہے۔

'پدماوت' میں راجا رتن سین کا قصہ ہے۔ اس نے پدماونی کی خوب‌صورتی کا حال ایک توتے کی زبانی سنا۔ اور لنکا جا کر اسے بیاہا۔ دلی کے سلطان علاالدین تک یہ بات پہنچی تو وہ پدماوتی کا نادیدہ عاشق ہوگیا۔ اس نے چتوڑ پر حملہ کرنے کی ٹھانی پدمنی اس کے ہاتھ نہ آسکی، لیکن رتن‌سین کو وہ گرفتار کر لایا، اس نے یہ شرط رکھی کہ اگر پدمنی اس کے حوالے کر دی جائے تو رتن سین رہا کردیا جائے گا۔ خدا خدا کرکے رتن‌سین کے دو بہادر سپاہیوں نے اسے علا الدین کی قید سے چھڑایا۔ اس دوران میں دیو پال نے پدمنی سے شادی کرنے کی تجویز پیش کی تھی، رتن سین یہ توہین کب برداشت کر سکتا تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے دیو پال پر حملہ کیا دیوپال مارا گیا، لیکن رتن سین بھی سخت زخمی ہوا۔ چند دنوں کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ پدمنی اور اس کی سوت دونوں اس کی چتا پر ستی ہوگئیں۔ اس کے بعد علاالدین نے چتوڑ فتح کر لیا[۱]۔

جائسی نے اس نظم کے آخری باب میں لکھا ہے، کہ یہ در اصل ایک تمثیلی قصہ ہے۔ چتوڑ جسم ہے۔ رتن سین روح۔ پدمنی عقل۔ علاالدین دھوکہ اور توتا گرو ہے۔ غرض اس طرح اس قصے پر مذہبی رنگ چڑھا یا گیا ہے۔ جو کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ علا الدین نے سنہ ۱۳۰۳ع میں چتوڑ پر چڑھائی کی تھی۔ بڑی

---

۱ ملاحظہ ہو « پدماوت » مرتبہ مولوی احتشام‌الدین صاحب دہلوی

گھمسان کی لڑائی، ہوئی دونوں طرف سے بے شمار جاں‌باز سپاہی کھیت رہے۔ جائسی کی نظم اسی واقعہ کا ایک رنگین بیان ہے۔ جائسی شاعر تھا اس لیے اس نے بہت کچھ نمک مرچ اپنی طرف سے لگایا ہے۔ اور دوسروں کے دسترخوان کی نعمت سے اپنا دسترخوان سجایا ہے۔ جائسی نے بول چال کی زبان نظم کی ہے۔ کہیں کہیں فارسی کے الفاظ اور محاورے بھی آگئے ہیں۔ پہلے یہ مثنوی اردو رسم الخط میں لکھی گئی تھی، بعد میں اسے دیوناگری کا جامہ پہنایا گیا۔ 'پدماوت' ہندی کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اس میں جدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور شاعرانہ محاسن کی بھرمار ہے۔ پدماوت کا انگریزی ترجمہ 'سرجارج گریرسن' نے کیا ہے جس کی بدولت یہ نظم یورپ تک پہنچ سکی ہے۔

جائسی محاکات کے استعمال میں بےمثل ہے، باغ، کنویں، آبشار، باولی، پنچھی، نگر، ہاٹ بازار، گڑھ، راج دوار، ہاتھی گھوڑے غرض ہر چیز کا ذکر بہت خوبی سے کیا ہے۔ اس لیے اس کی جزئیات نگاری اپنی الگ حیثیت رکھتی ہے۔ پدماوتی کے اشنان کا منظر بہت دلچسپ ہے۔ فوج کس طرح چتوڑ سے کلنگ تک گئی اور راستے میں ندی، نالے، پیڑ، پودے اور پہاڑ دکھائی دیتے تھے ان کا بیان زرا پھیکا ہے پھر بھی برا نہیں۔ ہندی شاعروں میں صرف جائسی نے سمندر کا حال لکھا ہے۔ اس نے غالباً اپنا مواد پرانوں سے جمع کیا ہوگا۔ شادی بیاہ کا ذکر اس نے اسی خوش اسلوبی سے کیا ہے جس طرح میرحسن نے اپنی مثنوی میں 'بدر منیر' کے بیاہ کا حال لکھا ہے۔ میدان جنگ کی ہیبت‌ناک تصویر بھی بہت کام‌یابی سے کھینچی ہے۔ گو اس کا مقابلہ فردوسی کے رزمیہ ٹکڑوں سے نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی نظامی کے سکندرنامے سے کم اسے کام‌یابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ بادشاہ کے باورچی خانے کا حال لکھا ہے۔ اس لحاظ سے وہ سودا کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ بارہ ماسہ بھی شامل ہے۔ بعد کے شاعروں نے اس طرح کی نظم بہت لکھی ہے لیکن جائسی کی گرد کو بھی کوئی نہیں پہنچتا۔ حسن‌صورت جائسی کی آنکھوں کو بہت مرغوب معلوم ہوتا ہے، اس نے پدمنی کی خوب‌صورتی کا ذکر اس والہانہ انداز میں کیا ہے کہ وہ اس دنیائے آب و گل کی مخلوق نہیں معلوم ہوتی، راجا اندر کے اکھاڑے کی پری معلوم ہوتی ہے۔ جائسی کے یہاں صوفیانہ خیالات کی بہتات ہے۔ رزم ہو یا بزم وہ سب کچھ اپنے صوفیانہ رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جائسی کے

یہاں فارسی عربی کے الفاظ بہت کم آئے ہیں۔ « نکھار بھا کھا » کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔
جائسی کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ پنڈت رام چندر شکل نے شائع کیا ہے
جس کی ابتدا میں انھوں نے تین سو صفحات کا ضخیم مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں
جائسی کے سوانح حیات اور کلام سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام
جائسی گرنتھاولی، ہے۔

اس عہد کے اور شاعر

اس زمانے کے دو اور شاعروں کا نام گنا دینا یہاں ضروری
معلوم ہوتا ہے۔ ایک نروتم داس جنھوں نے 'سداما چرتر'
اور 'دھرو چرتر' لکھی۔ ان طویل نظموں کے علاوہ انھوں نے متفرق چھوٹی چھوٹی
نظمیں بھی لکھی ہیں۔ دوسرے شاعر کرپا رام ہیں جو مشہور برج بھاشا نظم
'ھت ترنگنی' کے مصنف ہیں۔ اب تک ھندی کی جتنی قدیم منظومات ملی ہیں، ان میں
یہ بہت بڑے وقار کی مستحق ہے۔ اس نظم میں فن شاعری پر بھی بحث کی گئی
ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کیشو داس نے جو فن اور زبان کی شاعری کو
رواج دیا اس کی بنیاد ڈالنے میں اس نظم کا کس قدر حصہ تھا۔ کیشو داس سے ایک
نیا دور شروع ہوتا ہے یہ مغل بادشاہوں کی سر پرستی میں پھولا پھلا اس کا ذکر
ہم آیندہ کریں گے۔

سخن ھائے گفتنی

گرو گورکھ ناتھ نے جس رنگ کی بنیاد ڈالی، وہ خالص
صوفیانہ رنگ تھا۔ اس کا رواج ان کے بعد صدیوں تک
رہا اور آج کل بھی کچھ شاعر ایسے ہیں جو یہ رنگ پسند کرتے ہیں اور اسی میں
شعر کہتے ہیں۔ گورکھ ناتھ نے ھندستان کے مختلف صوبوں کو کھنگالا تھا اس لیے نہ
صرف وہ ہر جگہ کی معاشرت سے واقف تھے بلکہ ہر جگہ کی زبان کا بھی انھیں علم
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ھندی پنجابی مرہٹی اور گجراتی وغیرہ کا میل
نظر آتا ہے۔ ان کے بے شمار شاگرد تھے جن میں سے کسی کا ذکر کرنا اس تحریر کو
طول دینا ہوگا۔ کروری، چرپٹ، بال ناتھ، گھوں کھلی مل اور پرتھوی ناتھ وغیرہ چند
مشہور شاگردوں کا نام جان لینا ہی کافی ہوگا[1]۔

---

[1] یہاں دادو دیال اور ان کے دو مرید ملوک داس اور سندر داس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ممکن
ہے ان کا تفصیلی ذکر دوسرے مقالے میں کیا جائےگا۔

مہاتماؤں کا اثر

گورکھ ناتھ کی تعلیم ایک محدود طبقے میں پھیلی، لیکن کبیر کی تعلیم عوام میں سرایت کر گئی[1] ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھگتی کی تحریک ایک قومی تحریک بن گئی۔ اگر کبیر نے عوام میں بیداری نہ پیدا کی ہوتی تو تلسی‌داس، رام کی بھگتی اور سورداس؛ کرشن کی بھگتی اتنی آسانی سے نہ پھیلا سکتے۔ راماین جو اب تک اس قدر مقبول ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو دور بیداری کبیر کی تعلیم سے شروع ہوا تھا وہ راماین کی وجہ سے اب تک قائم ہے۔ برہمنوں نے شودروں کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی، اب ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مسلمان ہو جاتے، اس درمیان کبیر کا پیدا ہوجانا ان کے لیے پیام بقا سے کم نہ تھا اس لیے انھوں نے ہندو مذہب کی ظاہر پرستیوں کو ٹھکرا کر بھگتی میں رس بس جانا ہی پسند کیا۔ تعجب ہے کہ ان مہاتماؤں نے صنف نازک کی بہت ہجو کی ہے۔ کبیر نے تو عورت کو انسانیت کے دائرے سے خارج کردیا ہے اور تلسی داس ایسے سنجیدہ شاعر نے بھی عورت پر ایک نفرت انگیز قہقہہ لگایا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ باوجود بھگتی اور محبت پرستی کے بربریت کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا، لیکن اس سے کبیر کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ انھی کے نقش قدم پر چل کر نانک، دادودیال، شیونراین اور جگ‌جیون‌داس نے اپنا اپنا مت چلایا۔ ان میں نانک ہی کا مت ایسا تھا جس میں ذات پات کا بھید نہیں آنے پایا۔ یہی نہیں جن جن چیزوں کے خلاف ان بزرگوں نے آواز اٹھائی تھی انھی کا پرچار آگے چل کر ان کے ماننے والوں نے کیا۔

صوفی تحریک

بھگتی تحریک کی جان صوفی تحریک ہے۔ صوفیوں کا اعتقاد ہے کہ خدا ہی سب کچھ ہے (ہمہ اوست) اور خدا ہی سے سب کچھ ہے۔ (ہمہ ازوست) اس لیے وہ ذرے ذرے میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس خدا کو حاصل کرنے کے لیے حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹی طاقت پیدا کرنی چاہیے جو ریاضت اور یاد الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ تصوف کی

[1] کبیر کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے دیسی زبان میں پرچار کیا۔ ان سے پہلے رامانند اور ولبھ آچاریہ سنسکرت میں پرچار کرتے تھے، اس وجہ سے ان کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اب سے سو برس قبل سوامی دیانند نے جب سنسکرت میں ویدک دھرم کا پیغام سنایا تو اسے کوئی نہ سمجھا لیکن جب وہ ہندی کی طرف مائل ہوئے تو ان کا مذہب خوب پھیلا۔

کئی سیڑھیاں ہوتی ہیں جن میں جذب کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے اور وہ «موتوا قبل ان تموتو» (مرو اس سے قبل کہ موت آئے) یعنی سخت ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔

ہندستان میں صوفی تحریک کے ماننے والے زیادہ تر مسلمان لوگ تھے۔ ہندی شاعروں میں کئی مسلمان بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان میں قطبن کا نام سب سے پہلے آتا ہے یہ شیخ بہارن کے مرید تھے۔ ان کی ایک نظم «مرگاوتی»[1] بہت اچھی ہے۔ جائسی کے بعد عثمان، شیخ نبی، نورمحمد وغیرہ مشہور شاعر ہوئے۔ نورمحمد کی «اندراوتی» بہت خوب ہے۔ ان شاعروں کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ فارسی نظموں کی سی ترتیب اپنی نظموں میں پسند کرتے ہیں یعنی پہلے حمد و نعت پھر ذاتی حالات اور آخیر میں نفس مضمون۔ کتاب کے اخیر میں تاریخ تصنیف، تمت بالخیر وغیرہ ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں جو روح کار فرما نظر آتی ہے وہ ہندستان کی ہے۔ ان صوفیوں نے زبان کی جو اصلاح کی وہ ان سے پیش‌تر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ اودھی زبان میں کہتے تھے جو اس وقت کی اور زبانوں سے زیادہ صاف ستھری ہوتی تھی اور اس میں کھڑی بولی کی آمیزش کر دیتے تھے اس لیے ان کی زبان اس وقت کی مہذب زبان سے بہت قریب ہے۔

کبیر کی تعلیم سے مسلمانوں نے زیادہ فائدہ اٹھایا کیوں‌کہ اس میں بت پرستی کی مخالفت پر بہت زور دیا گیا تھا۔ کبیر کی تعلیم سے جائسی کی تعلیم مختلف تھی اس میں نزاکت اور لطافت کی چاشنی زیادہ ہے اور مذہبیت یا کٹرپن کا نام و نشان نہیں۔ جائسی کے بعد عثمان[2] اور شیخ نبی ہوئے ان کے خیالات بھی بہت سلجھے ہوئے ہیں، یہ زریں دور نورمحمد پر ختم ہو گیا۔ نورمحمد کے معاصرین میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہے۔ اس میل جول نے زبان پر بہت خوش‌گوار اثر کیا۔ کاغذ پتر، شادی بیاہ، وغیرہ مرکب الفاظ اسی عہد کی یادگار ہیں، اگرچہ سیاست اور مذہب میں ہندو مسلمانوں کا تھوڑا بہت اختلاف تھا بھی، لیکن زبان کے معاملے میں دونوں ایک تھے اور جب زبان ایک ہو تو کلچر کیوں نہ ایک ہوتا۔

---

۱ «مرگاوتی» کا ذکر جائسی نے اپنی «پدماوت» میں بھی کیا ہے۔

۲ «چتر والی» مصنفہ عثمان قلمی نسخہ جہاں‌گیر بادشاہ کے عہد کا لکھا ہوا۔

نابھ داس اور ان کے معاصرین

تلسی داس کا ذکر ہم نے ابھی نہیں کیا، لیکن ان کے معاصر نابھ داس اور دوسرے شعرا کا نام لے لینا ضروری ہے۔ نابھ داس کا «بھگت مال» ادب کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے ۔ اسی وقت پران چند چوھان اور ہردے رام ہوئے۔ ان دونوں شاعروں نے ناٹک کے انداز میں رام بھکتی کی نظمیں لکھی ہیں پران چند نے سنہ ۱۶۱۰ع میں «راماین مہا ناٹک» لکھا اور ہردے رام نے سنہ ۱۶۲۳ع میں «ہنومان ناٹک» لکھا۔ آخرالذکر کا انداز بیان زیادہ پختہ اور سلیس ہے۔ مہراج وشو ناتھ سنگھ اور مہراج رگھو راج سنگھ کا نام بھی رام کے بھکتوں میں لیا جاتا ہے۔ رگھو راج سنگھ کی «رام سویمبر» بہت مشہور ہے، لیکن اس میں شعریت کا فقدان ہے۔ البتہ دربار کی شان و شوکت کا ذکر بہت خوبی سے کیا ہے۔

اس سلسلے میں نند داس، ہت ہری بنس، ہری داس اور رس خان کا ذکر نہ کرنا ایک ادبی فروگزاشت ہوگی۔ ان کی شاعری میں کرشن کی بھکتی سمائی ہوئی ہے۔ رحیم، گنگ، نرہری، بیربل، ٹوڈر مل اور سیناپتی کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ ان شاعروں کا بہت سا کلام گم ہو چکا ہے اور ان کے حالات بھی ابھی تک اچھی طرح معلوم نہ ہو سکے۔ ان کا کلام «کویتا کومدی» مولفہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی میں ملتا ہے۔

ایک ادبی

یہ ضروری نہیں ہے کہ بھکتی کے زمانے میں صرف رام اور کرشن کی بھکتی سے لبریز اشعار ہی کہے جاتے ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے رنگ میں بھی شاعری کی جاتی تھی۔ اکبر کے دربار میں نرہری، گنگ، رحیم، ٹوڈرمل، بیربل اور منوہر ایسے شاعر بھی تھے، جنہیں انعام اور خلعت ملتا تھا۔ اسی طرح «اورچھا» کے دربار میں بل بھدر مصر اور کیشو داس ایسے عالم اور شاعر موجود تھے۔ کرپا رام نامی ایک شاعر نے «ہت ترنگنی» لکھی جو فن شاعری پر بے مثل کتاب ہے۔ نروتم داس نے «سداما چرتر» لکھی جو شعریت سے شرابور ہے۔ قادر بخش، مبارک اور بنارسی داس وغیرہ بھکتی سے الگ عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ان کی شاعری «زلف و عارض» کی شاعری سے بہت قریب آجاتی ہے۔ اب بھکتی کی تحریک دم توڑ رہی تھی اور ہندی دنیا میں حسن و عشق کی جلوہ گری تھی۔

خاتمہ

ہم نے پراکرتوں کی پیدایش کے سلسلے میں یہ بتایا تھا کہ برہمنوں نے سنسکرت کو دیوبانی سمجھ کر شودروں اور دوسری ذات کے لوگوں کو اس سے محروم رکھا اس لیے پراکرتیں پیدا ہوگئیں۔ پراکرتیں کئی تھیں لیکن چوں کہ ہندی کا دامن بہت وسیع ہے اس لیے شورسینی، بہاری، راجستھانی اور برج بھاشا کو ہم نے ہندی کی تاریخ میں شامل کرلیا۔ ابتدا کی تاریخی نظمیں زیادہ تر راجستھانی زبان میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پرتھوی راج کے زمانے سے برابر اجمیر اور دلی میں میل ملاپ رہا۔ اور اجمیر کی زبان دلی میں سمجھی جاتی تھی۔ رام کی بھگتی کے لیے زیادہ تر اودھی یا پوربی زبان استعمال کی جاتی تھی کرشن کی بھگتی کے لیے عموماً برج بھاشا ہی کو اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اسی درمیان میں مسلمانوں کی آمد سے کھڑی بولی کا رواج ہونے لگا تھا، لیکن خسرو کے بعد عرصۂ دراز تک کھڑی بولی کی شاعری کے نمونے نہیں ملتے۔ پھر یکایک کبیر کے یہاں کچھ دوہے سیدھے سادے مل جاتے ہیں لیکن کھڑی بولی دراصل انیسویں صدی سے پہلے ادبی زبان نہ بن سکی۔ اور اگر بنی بھی تو اردو کی صورت میں۔ جسے کھڑی بولی یا ہندی نثر کہتے ہیں وہ تو ابھی حال کی پیداوار ہے۔

ہم نے اس مبحث میں راجپوتی زمانے اور بھگتی کے زمانے کے ادب کا مختصر سا حال لکھ دیا ہے۔ یہ چارسو برس کے لگ بھگ کا دور ہے۔ اس عرصے میں اور بہت سے شاعر ہوئے ہیں جن کا ذکر ہم نہ کرسکے۔ شعرا کے کلام کے نمونے دینے سے بھی ہم قاصر رہے، ورنہ بیجا کھکھیڑ اٹھانی پڑتی۔ آیندہ اشاعت میں ہم مغل دربار کی شاعری اور فن و زبان کی شاعری کا ذکر کریں گے۔

ہم نے حسب ذیل کتابوں سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے:-

۱۔ A Short History of Hindi Literature by F. E. Keey.

۲۔ Languistic Survey of India by Sir George A. Grierson.

۳۔ The Modern Vernacular Languages of Hindustan by G. A. Grierson.

۴۔ هندی بھاشا اور ساهتیہ مرتبہ: بابو شیام سندر داس

۵۔ «ہندی» — مضمون: پنڈی بدری ناتھ بھٹ
۶۔ ہندی بھاشا کا اتہاس — مصنفہ: پنڈت رام چندر شکل
۷۔ ہندی کا آلوچنا تمک اتہاس (جلد اول) مصنفہ: پروفیسر رام کمار ورما
۸۔ جائسی گرنتھاولی — مولفہ: پنڈت رام چندر شکل
۹۔ کبیر گرنتھالی — مولفہ: بابو شیام سندر داس
۱۰۔ ناگری پرچارنی پترکا — متفرق نمبر

یہ مصنفین شکریے کے مستحق ہیں۔

جاھلی ادب نئی روشنی میں

ڈاکٹر طه حسین المصری

(ترجمه جناب محمد رضا صاحب انصاری)

تمہید زمانۂ جاھلیت کے شعراء، ان کے ادب، ان کی زبان اور ان کی تاریخ کی ایک نئی تحقیق ھے جو پیش کی جارھی ھے، جہاں تک انداز کی جدت اور موضوع کی ندرت کا سوال ھے، آج سے پہلے کبھی یه راسته لوگوں نے اختیار نہیں کیا، اور جہاں تک «نتائج» کا تعلق ھے مجھے کامل یقین ھے که میری اس کوشش اور پیش کش پر بہت سے لوگ ناک بھوں چڑھائیں گے اور بہت سے بزرگ میری اس جرات پر غیظ و غضب کا اظہار فرمائیں گے مگر یه چیزیں میرے لیے نه کبھی سدراہ بن سکی ھیں اور نه آج بن سکتی ھیں، لوگوں کے غیظ و غضب اور ناک بھوں چڑھانے کے باوجود، میں نے طے کر لیا ھے که اس موضوع اور طریقۂ تلاش و تحقیق کو عام کروں۔ مجھے تو یه کہنا چاھیے که «اس موضوع اور اس سے متعلق بحث کو کاغذ اور قلم کے حدود میں محصور کروں» یہی الفاظ زیادہ صحیح ھوں گے، کیوں که جہاں تک «موضوع کو عام کرنے کا سوال ھے، زمانه ھوگیا جب میں نے قاھرہ یونیورسٹی میں طلبه کے سامنے اپنا یه خیال ظاھر کیا تھا، اور یه کوئی راز کی بات نہیں که تقریباً دوسو طالبان علم میرے کلاس میں روزانه لکچر سننے کے لیے حاضر رھتے تھے، تو یه بحث اسی وقت عام ھوچکی تھی۔

مجھے اپنے اس طریقۂ تحقیق پر پورا پورا اعتماد ھے۔ میں اس تحقیق کے نتائج کو اس حد تک یقینی سمجھتا ھوں اور اس حد تک ان سے مطمئن ھوں که پوری عربی ادب کی تاریخ کے مطالعے اور اس کے مشکل مقامات کو عبور کرنے کے دوران میں، ایسا اطمینان اور یقینی حالت میں نے، اپنے اندر کبھی نہیں محسوس کی تھی، حالاں که متعدد مقامات، عربی ادب کی تاریخ میں، ایسے بھی آئے جہاں مجھے مدتوں ٹھہرنا پڑا۔

اسی یقین کی طاقت نے، اس بحث کو احاطۂ تحریر میں لانے اور ابواب و فصول میں تقسیم کرنے پر، مجھے آمادہ کردیا۔ نہ غصہ کرنے والوں کا غصہ اور نہ ناپسند کرنے والوں کی ناپسندیدگی کا ڈر، مجھے ارادے سے باز رکھ سکا۔

اس موضوع کو قلمبند کر کے، آپ کے سامنے پیش کرتے وقت، اور اپنی طویل محنت کا ثمرہ، منظر عام پر لاتے ہوئے، میں اپنی جگہ، بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ کچھ لوگ غصہ، اور کچھ لوگ ناگواری کا اظہار کریں گے، مگر روشن خیالوں کا وہ مختصر گروہ، جو دراصل مستقبل کا سرمایہ، حیات نو کا پیغامبر اور نئےادب کا عرفانی خزانہ ہے، اس پر ضرور مسرت کا اظہار کرے گا۔

جدید اور قدیم کی بحث

میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ ہر جگہ لوگ «جدید اور قدیم» کی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں روز بروز شدت بڑھتی جارہی ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کا امکان، کم ہوتا جارہا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس حقیقت پر مصر ہیں کہ فریقین کے درمیان سمجھوتہ بہت آسانی سے ممکن ہے۔ مگر میرا عقیدہ اس جھگڑے میں یہ ہے کہ دونوں فریق، خود ہی اس مسئلے کے تمام پہلوؤں تک، ہنوز پہنچ نہیں سکے ہیں، سمجھوتے کا سوال تو بہت دور ہے۔ ابھی تک ظاہری وسطحی حدود سے ان

رخ اور ہے، جس کا تعلق، شاعری یا مضمون نگاری کی کسی صنف سے نہیں، مسئلے کا یہ پہلو، دراصل ادب اور تاریخ اصناف ادب کی علمی تحقیق پر مشتمل ہے۔

دو راستے

ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، جن میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑے گا۔ درحقیقت اسی لمحے جب کہ ہم اپنے لیے دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرچکتے ہیں، ہماری قدامت پرستی اور ترقی پسندی کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔

پہلا راستہ یا طریقۂ کار یہ ہے کہ ادب اور تاریخ ادب کے بارے میں جو کچھ متقدمین نے کہا ہے اسے بجنسہ مان لیا جائے۔ جانچنے اور پرکھنے کی وسیع

ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کرلیا جائے۔ صرف اسی قدر «جانچ پڑتال» سے کام لیا جائے جہاں تک ہر بحث میں ضرورت ہوا کرتی ہے، جس کے بغیر کوئی بحث بحث نہیں کہی جاسکتی، یعنی ہماری جانچ پرتال کا دائرہ صرف اس حد تک ہوگا کہ محل اختلاف میں کسی ایک رائے کو ترجیح دے سکیں۔ گویا ہمارا کام اس قسم کے محدود الفاظ میں چل جائے گا «اصمعی نے غلط رائے قائم کی ہے»۔ «اس خاص معاملے میں ابو عبیدہ کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے» یا مثلاً «کسائی کا راستہ غلط ہے»۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ متقدمین کا پورا علمی ذخیرہ تحقیق اور بحث کے لیے منظر عام پر پیش کر دیا جائے ــــ مجھ سے چوک ہوگئی، مجھے یہ کہنا ہے کہ «سارا قدیم علمی سرمایہ شک اور شبے کی شاہراہ عام پر رکھ دیا جائے» میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متقدمین کی کوئی بات اس وقت تک نہ تسلیم کی جائے جب تک بحث اور جستجو سے ثابت نہ ہوجائے، جس کے بعد اگر یقین نہیں تو ظن غالب ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے دونوں راستوں میں بون بعید اور اختلاف عظیم ہے، تحقیق کے بارے میں دونوں میں اس قدر فرق ہے جتنا «ایمان» ــــ جو موجب سکون قلب و راحت بال ہے ــــ اور «شک» ــــ جو محرک اضطراب و اصل الحاد و انکار ہے ــــ کے درمیان ہو سکتا ہے۔

پہلا طریقۂ کار متقدمین کے متروکہ سرمایۂ علمی کو بعینہ برقرار رکھتا ہے، کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا اور مفصل یا قابل تفصیل مقامات کو ہاتھ لگانا اس کی شریعت میں حرام ہے۔ ہاں لطافت و نزاکت کے ساتھ آپ اگر چاہیں تو اسے ہلکا ہلکا چھوسکتے ہیں۔

مگر دوسرے طریقۂ کار میں اس قسم کی رو رعایت کی گنجایش نہیں۔ وہ قدیم علمی سرمایے کو باطل الٹ پلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سب کو نہیں تو اس سرمائیے کے بیشتر حصے کو ناقابل قبول قرار دے کر مٹا دیتا ہے۔

علم الفاظ میں گفتگو کے بعد اسی موضوع کو مثالوں سے واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اس وقت ایام جاہلیت کے ادب کا مسئلہ درپیش ہے۔ فرض کیجیے اسی ادب کی حقیقت اور ماہیت ہم جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں تو ــــ

جہاں تک پہلے طریقۂ کار کا تعلق ہے بات بالکل صاف ہے، اس طریقے پر عقیدہ رکھنے والوں کا راستہ نہ صرف ہموار اور روشن ہے بلکہ جانا بوجھا بھی ہے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

قدیم علمائے عراق و شام و فارس و مصر و اندلس نے حسب ذیل باتیں کیا طے نہیں کردی ہیں؟

الف۔ شعراء کا فلاں گروہ اسلام سے پہلے کا ہے۔

ب۔ شعراء کے پورے پورے نام یہ ہیں۔

ج۔ شعرا کے کلام کی مقدار، قصیدوں اور قطعوں کا مجموعہ یہ ہے جو راویوں نے نقل کیا ہے اور برابر لوگ انہیں روایت کرتے رہے، یہاں تک تصنیف و تالیف کا دور آیا اور ان مرویات کو کتابوں میں درج کر لیا گیا۔

د۔ اب بھی بہت کچھ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

تو جب علمائے قدیم نے اتنی سب باتیں طے کردیں۔ شعرا کے اسمائے گرامی روایت کر دیے، کلام نقل کردیا اور اس کی شرح بھی کردی تو پھر ہمارے لیے بس ایک ہی صورت ہے کہ جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اسے برضاورغبت تسلیم کرلیں، اور بفرض محال اگر ہم میں سے کسی کو بغیر "جانچ پرتال" کے چین نہ پڑتا ہو تو وہ اپنی راہ بدلے بغیر بھی یہ ہوس پوری کر سکتا ہے۔

آخر علمائے قدیم نے بھی روایت کے بارے میں کچھ نہ کچھ اختلاف کیا ہی ہے! ایک کی ترتیب دوسرے کی ترتیب سے تھوڑی بہت مختلف بھی ہے، تو بس اسی جگہ جانچ پرتال کی پیاس بجھائی جاسکتی ہے۔ آپس میں موازنہ کر کے ایک روایت کو دوسری پر اور ایک ترتیب کو دوسری ترتیب پر وہ ترجیح دے سکتا ہے، گویا وہ اس طرح داد تحقیق دے سکتا ہے:-

"بصرے کے علما کی رائے مناسب ہے" "کوفے والے غلط کہ رہے ہیں"۔

"مبرد کا قول درست ہے"۔ "ثعلب کی رائے صحیح نہیں"

گویا لغت اور اصناف ادب میں بھی، ہم کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جو

فقہا نے ، اجتہاد کا دروازہ بند کر لینے کے بعد ، فقہ میں اختیار کر رکھا ہے ، یہ بھی پرانے لوگوں کا طریقۂ کار اور ان کا مسلک ۔

مصر میں عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے ۔ وہاں کا « رواجی مسلک » یہی ہے ۔ ہرکاری مدارس ، درسی کتب ، اور طریقۂ درس و تدریس سب جگہ ، ضمنی تغیر کے ساتھ یہی اصول کار فرما ہے ۔

ایک مغالطہ

نئے نئے الفاظ جو جدید مصری ادب میں آئے دن جگہ پانے جارہے ہیں ۔ نئے انداز کی تالیفات جس میں ادب کی تاریخ مختلف دوروں میں تقسیم کر کے مرتب کی جارہی ہے اور جدید اصطلاحات ، جو دوسری زبانوں سے لے کر اپنائی جارہی ہیں ـــــــ ان سب باتوں سے آپ کو مصر کے نئے دور کے متعلق دھوکا ہوسکتا ہے یعنی آپ کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہاں ترقی پسند ادب پیدا ہو رہا ہے ، حالاں کہ یہ سب فریب ہے ۔ موجودہ جتنی کاوشیں کی جارہی ہیں ، ان کی حد چھلکے اور بیرونی شکل و صورت تک محدود ہے ، گودے یا اصل موضوع تک کسی کی رسائی نہیں ۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ آج تک اسی فخر اور شان و شوکت کے ساتھ کتابوں میں لکھا جارہا ہے ...... « کلام عرب کی دو قسمیں ہیں نثر ۔ نظم ...... نثر دو طرح کی ہوتی ہے ۔ مسجع اور سادی » ۔ وغیرہ وغیرہ ، کتابوں میں تحریر فرماکر اور اپنے شاگردوں کے سامنے اظہار فرما کر یہ پرانے خیال کے لوگ اپنے کو بری الذمہ سمجھ بیٹھے ہیں

یہ ہے وہ سطحی مذاق اور پست معیار جو مصر میں دراصل رائج ہے ، جس پر جدید اصطلاحات اور نئے الفاظ کا کوئی اثر نہیں ۔

غرض پرانے خیال کے ماننے والے کسی قسم کی « جدت » کے قائل نہیں اور پرانے علمی ذخیروں میں کوئی تغیر اور تبدل جائز نہیں سمجھتے ہیں ۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو « نئی بات » پیدا کرنے کا حق بھی تو نہیں ہے ، جبکہ متقدمین کے ارشادات کو وہ برضا و رغبت تسلیم کر چکے ہیں ، اور اسی طرح اپنے اوپر « اجتہاد » کا دروازہ بند کر چکے ہیں جس طرح فقہا اور متکلمین نے فقہ اور کلام میں ہمیشہ کے لیے یہ راہ مسدود کردی ہے ۔

دوسرا راستہ بیشک پیچیدہ اور ناہموار ہے ، یہاں لاتعداد گھاٹیاں ہیں ، بے اندازہ نشیب و فراز ہیں ۔ اس میدان میں سرپٹ دوڑنے کا بالکل امکان نہیں ۔

پھونک پھونک کر قدم اٹھانا اور سنبھل سنبھل کر پانو جمانے پڑتے ہیں اور قدرتاً یہ رفتار، تیز رفتاری سے دور، اور آہستہ روی سے قریب ہوتی ہے۔

مگر لطف یہ ہے کہ یہ ساری دقتیں اور تمام مشکلیں، محض اس لیے عذاب جان بن جاتی ہیں کہ اس راہ کے اختیار کرنے والوں نے اپنی طبیعتوں کو اطمینان اور ایمان بالغیب، پر راضی نہیں کرلیا۔ یا یوں کہیے کہ اطمینان اور ایمان بالغیب کی سعادت ان کے حصے میں نہیں آئی۔ مبدء فیاض کی طرف سے انھیں وہ عقلیں عطا کی گئی ہیں جو "شک" میں لطف اور "اضطراب" میں آرام محسوس کرتی ہیں۔ شاہراہ ادب کے یہ مسافر، ایک قدم بھی اس وقت تک نہیں اٹھاتے ہیں، جب تک اس کی جگہ نمایاں طور پر محسوس نہ ہو جائے۔ اس معاملے میں چاہے متقدمین اور ان کے اعوان و انصار موافقت کریں یا نہ کریں، ان کے لیے یہ دونوں چیزیں برابر حیثیت رکھتی ہیں۔

متقدمین کے محض فرما دینے سے ان لوگوں کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ ہاں! ایک تردد اور شبہے، کے ساتھ ان فرمودات کو محفوظ کر لیتے ہیں، نہ سرے سے انکار ہی کرتے ہیں اور نہ کلی اقرار بلکہ تحقیق کے لیے ان کو علحدہ انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ اور شاید ان لوگوں کے "تردد اور شبہے" میں اس وقت سب سے زیادہ اضافہ ہو جاتا ہوگا جس وقت متقدمین کے اقوال اور ارشادات میں سب سے زیادہ اطمینان اور اعتماد کی جھلک نظر آتی ہوگی۔

اگر جاہلیت کا ادب مثلاً، معرض بحث میں ہو تو ان لوگوں کا طریقۂ کار قریب قریب یہ ہوتا ہے کہ متقدمین کے تمام مسلمات سے خالی الذہن ہوکر، بنیادی سوالات کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں بالکل ابتدائی سوالات کرید کرید کر سامنے لاتے ہیں اور ان کا صحیح حل تلاش کرتے ہیں مثلاً:—

۱۔ آیا درحقیقت جاہلی ادب کا تاریخی وجود ہے؟
۲۔ اگر ہے تو اس تک پہنچنے کے ذرائع کیا ہو سکتے ہیں؟
۳۔ جاہلی ادب کی ماہیت کیا ہے؟
۴۔ اس کی مقدار کیا ہوگی؟
۵۔ اور کن خصوصیتوں کی بنا پر، جاہلی ادب کو دوسرے ادبی شاہکاروں سے جدا کیا جا سکتا ہے؟

ان کے سامنے سوالات کا ایک سمندر امنڈ تا چلا آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسے سوالات اٹھنے لگتے ہیں، جن کا صحیح حل تلاش کرنے کے لیے کوشش، تعمق، اور انفرادی «جد و جہد» کے بجائے علمی حلقوں کی اجتماعی مساعدت درکار ہوتی ہے۔

وہ یہ نہیں جانتے ہیں کہ عرب کی تقسیم، عرب باقیہ اور عرب بائدہ، پھر عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی طرف ہوتی ہے یا فلاں جرہم کی اولاد میں ہے اور اور فلاں اسماعیل کی اولاد میں، یا امرءالقیس، طرفہ، ابن کلثوم اور لبید وغیرہ مثلاً یہ قصیدے کہہ چکے ہیں، اس لیے کہ یہ باتیں ایسی ہیں جو صرف دعویٰ کہی جا سکتی ہیں۔

ہاں! وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ متقدمین کے فرمودات ہیں، اور یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ دعوی کہاں تک صحیح اور قرین قیاس ہیں اور کہاں صورت حال مشتبہ ہے۔

جدت پسندوں نے جو راہ پکڑی ہے اس پر گامزن ہونے کے نتائج لازمی طور پر اہم اور خطرناک ہیں اور تو اور، یہی بات کیا کم ہے کہ اس کی ابتداہی، «ادبی بغاوت» کی شکل میں ہوتی ہے، وہ تمام باتیں جنھیں دنیا آج تک بےچون و چرا تسلیم کرتی چلی آئی ہے، دفعتہً شک و شبہ سے دیکھی جانے لگتی ہیں، وہ تمام مسلمات جو ناقابل تردید سمجھے جاتے تھے، اس راہ میں ناقابل یقین ٹھہرائے جاتے ہیں۔

اصل بحث | موضوع سے متعلق سب سے پہلی بات جو میں بے دھڑک کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے جاہلی ادب کا مطالعہ شروع کیا، برابر اس کی صحت کے متعلق مجھے تردد رہا اور مطالعے کے ساتھ ساتھ تردد بھی بڑھتا رہا، یہاں تک کہ میں نے تفکر شروع کیا اور ایک عرصے کے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد جو نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے وہ ہی سب سے پہلے لکھ دینا چاہتا ہوں جو اگر یقینی نہیں تو یقین کی سرحد تک ضرور پہنچ گیا ہے۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ......

«آج تک جس کو ہم جاہلی ادب سمجھتے چلے آئے ہیں اس کا اکثر و بیشتر حصہ الحاقی ہے۔ یعنی وہ جاہلیت کا ادب نہیں ہے۔ ظہور اسلام کے بعد بعض

سیاسی اغراض کے ماتحت یہ حصہ جاہلی ادب کہکر پیش کیا گیا ہے یہ درأصل اسلامی ادب ہے جس میں زمانۂ جاہلیت کے میلانات اور خواہشات سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی معاشرت ان کے میلانات اور ان کے خواہشات کی جھلک نظر آتی ہے“

اسی بنا پر میں یہ بھی کہتا ہوں کہ:—

”وہ مختصر حصہ جسے ہم صحیح طور پر جاہلی ادب کہ سکتے ہیں، الحاقی ادب کے انبار میں اس طرح دب گیا ہے کہ اس کو علیٰحدہ کرنا، اس کے بعد اس کی روشنی میں ایام جاہلیت کی معاشرتی، سیاسی، اور معاشی زندگی کا خاکہ کھینچنا ناممکن ہے“

اس لیے کہ اگر صحیح جاہلی ادب کو کسی طرح نقلی ادب سے الگ بھی کرلیا جائے تب بھی وہ بچا کھچا سرمایہ اتنا مختصر اور ناقص ہوگا جو نہ کسی طرف رہنمائی کرسکتا ہے اور نہ کسی خاص رخ کو پیش کرسکتا ہے۔

”دور جاہلیت کی عام زندگی کی تصویر کھینچنے میں جاہلی ادب پر — مختصر ہونے کی وجہ سے اور الحاقی ادب پر — نقلی ہونے کی وجہ سے — کوئی بھروسا نہ کرنا چاہیے“

اس نظریے کے خطرناک نتائج ظاہر ہیں اور میں ان سے خوب واقف ہوں اس کے باوجود مجھے نہ اس بارے میں کوئی تردد ہے اور نہ اس کے اظہار میں کوئی پس وپیش۔

اس بات کو علی الاعلان کہنے میں میرے لیے کمزوری دکھانے کی کوئی وجہ نہیں کہ:—

”آج کل شعرائے جاہلیت امرءالقیس، طرفہ اور ابن کلثوم وغیرہ کے نام سے جو کچھ ہم کو پڑھایا جاتا ہے وہ راویوں کا اضافہ، اہل عرب کی ایجاد اور محدثین و مفسرین، نحویین و صرفیین اور داستان گویوں کی محض جدّت پسندی ہے“

ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ زمانۂ جاہلیت کا وہ دور جو زمانۂ اسلام سے متصل ہے اس میں کوئی تصرف اور تغیر نہیں ہوا ہے اور اس دور کی ایک واضح

اور صحیح تصویر پیش کی جاسکتی ہے — بہ شرطے کہ اس سلسلے میں اس زمانے کے اشعار کے بجائے قرآن ایک طرف ہمارا ماخذ ہو اور پرانی کہاوتیں اور دیومالا قسم کی روایتیں دوسری طرف۔

ایک سوال اور اس کا جواب

آپ پوچھیں گے کہ "جب اس راہ میں دشواریوں اور دقتوں کا یہ عالم ہے تو ایسے نظریے تک رسائی کیسے ممکن ہوئی؟

مجھے اس سوال سے زرا بھی پریشانی نہ ہوگی بلکہ موضوع کے سلسلے میں جو کچھ میں لکھوں گا وہ دراصل اسی سوال کا ایک مفصل جواب ہے۔

لیکن یہ بات کہ دینا ضروری ہے کہ سوال مذکور کا ایک تشفی بخش جواب دینے کے لیے متعدد مختلف النوع مباحث کا ذکر ناگزیر ہے اور ان مختلف النوع مسائل کے ذکر سے آپ کو خود اندازہ ہوجائےگا کہ وہ خیال جو جاہلی ادب کے متعلق اوپر پیش کیا گیا ہے، کس قدر صحیح بنیادوں پر قائم ہے۔

مباحث مذکورہ سے بہ طور نتیجہ آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ وہی رائے زیادہ صحیح اور قرین قیاس ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔

مثلاً جاہلی ادب کی صحت معلوم کرنے کے لیے عربوں کی اس اندرونی سیاسی پالیسی کا ذکر جو ظہور اسلام کے بعد اور پھر فتوحات اسلامیہ کے رک جانے کے بعد عام ہوگئی تھی اور اس سیاسی ماحول اور اس زمانے کے ادب کے درمیان جو ربط ہونا چاہیے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔

اور اس بحث کے دوران میں ان لوگوں کی ذاتی زندگی کو معرض بحث میں لائے بغیر چارہ نہیں جن کی شخصیتیں اشاعت اسلام کے بعد فتوحات کے سیلاب میں مغلوب ہوکر رہ گئی تھیں اور ان کی اس مغلوبانہ ذہنیت سے عربی ادب میں جو ایک خاص قسم کا اثر بڑھتا رہا اس کے ذکر سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی۔

اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ مذہبی علوم اور لغوی مباحث کے دروازے کھل جانے سے ادب اور لغت کا متاثر ہونا فطری تھا، اس دور میں جس حد تک عربی ادب میں تبدیلی ہوئی اس کے حدود معلوم کرنا ضروری ہے۔

عرب کے شہروں میں اسلام کے پہلے اور اسلام کے بعد یہودیوں کے اصول زندگی، حالات معاشرت اور ان چیزوں سے اس زمانے کے ادب کے باہمی تعلق کی داستان بھی بیان کرنا ضروری ہے۔

جزیرة العرب میں مسیحیت کا پھیلنا، عربوں کا اپنی ذهنی، اجتماعی، اقتصادی اور ادبی زندگی میں اس سے اثر لینا اور ان تمام باتوں کے ساتھ اس دور کے ادب اور شعر و شاعری کی وابستگی، ان سب کا ذکر لابدی ہے اور پھر جاهلیت کی عربی زندگی میں جو خارجی، سیاسی اثرات کام کررهے تھے اور جن کا اصلی جاهلی ادب اور نقلی الحاقی ادب دونوں پر کافی وزن اور اثر تھا، یہ کیسے ممکن ہے کہ اس اہم تذکرے سے باز رہا جائے۔

مذکورۂ بالا مباحث اسی نتیجے تک پہنچاتے هیں جس کا تذکرہ شروع میں ہوا ہے یعنی:—

«یہ بے اندازہ ذخیرہ جس کو ہم نے «جاهلی ادب» کا نام دے رکھا ہے اس کا زمانۂ جاهلیت سے کوئی تعلق نہیں»

معاملہ یہیں پر ختم نہیں هوجاتا ہے، اور اس وقت بھی یہ بات یہاں آکر نہیں ختم هوئی تھی جب کہ میں ازخود ان مسائل میں الجھا ہوا تھا اور صرف اپنے اور اپنے ضمیر کے درمیان اس معاملے کو طے کر رہا تھا۔ مجھے آگے بڑھنا ضروری معلوم ہوا تھا، اور اب بھی آپ کو اپنے همراہ لےکر دوسری سمت مڑنا چاهتا هوں اور ایک اور دلیل جو اوپر ذکر کی هوئی تمام دلیلوں سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے پیش کرکے مزید تائید اپنی رائے کی چاهتا هوں۔ یعنی زبان اور فن کی بحث چھیڑکر آپ کو اس نتیجے تک لانا چاهتا هوں کہ یہ جاهلی ادب جو مثلاً امرالقیس یا اعشیٰ کی طرف منسوب ہے زبان اور فن کے لحاظ سے بھی ان لوگوں کا نہیں هوسکتا ہے، اور نہ یہ هوسکتا ہے کہ قرآن کے نازل هونے سے پہلے گڑھا یا پیش کیا گیا هو۔

اس بحث سے ایک اور، عجیب و غریب نتیجہ برآمد هوتا ہے، وہ یہ کہ:—

«قرآن کی تفسیر کے دوران میں، مفسرین، اکثر اپنی تحقیق کی تائید میں زمانۂ جاهلیت کے اشعار و اقوال پیش کیا کرتے هیں یہ بیکار ہے۔ اس لیے کہ مذکورہ بحثوں سے یہ ثابت هوتا ہے کہ یہ اشعار دراصل اپنی من مانی تفسیر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے گڑھ گڑھ کر تائید میں پیش کیے گئے هیں اس لیے قرآن اور حدیث کی تشریح، میں اس حقیقت کے واضح هو جانے کے بعد، ایسے اشعار پیش کرنا بیکار ہے، هاں ان اشعار و اقوال کی تشریح میں قرآن اور حدیث کے الفاظ سے ثبوت فراهم کیے جاسکتے هیں»

بلکہ مجھے یہاں تک کہنے دیجیے کہ یہ اشعار سرے سے اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ثبوت میں پیش کیے جائیں، یا کسی اور کام آسکیں یا قرآن اور حدیث کو ان کے سمجھنے کا آلہ کار بنایا جائے۔ یہ سب اختراع ہے، اور علماء نے اپنی رائے کا جواز ثابت کرنے کے لیے زمانۂ جاہلیت کے مشہور شعرا کی طرف یہ خرافات منسوب کردیے ہیں۔

اس طرح اگر مذکورہ بالا مسائل اور مباحث کے پس منظر میں موجودہ جاہلی ادب کا جائزہ لیجیے گا تو آخر کار اسی نتیجے تک آنا ہوگا جس کا ذکر کرچکا ہوں۔

اس کے بعد ہم کو ایک دوسری کوشش یہ کرنی ہوگی کہ اصلی جاہلی ادب کا سراغ لگائیں، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بیحد دشوار معاملہ ہے، اور یقینی طور پر یہ مشتبہ ہے کہ خاطر خواہ نتیجے تک ہم پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں؟

طریقۂ کار | میں اپنا مطلب بالکل صاف لفظوں میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ اس طرح کہنا چاہتا ہوں کہ میرے مقصد کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ رہے اور اس کی تاویل اور تشریح میں بعد والے لوگ ادھر ادھر نہ بھکیں۔ اس طور پر پڑھنے والوں کو بھی زحمت سے بچانا چاہتا ہوں اور خود بھی اس مصیبت سے بچنا چاہتا ہوں کہ جہاں جھگڑے کی کوئی گنجایش نہ ہو وہاں بھی سوال جواب کا دروازہ کھل جائے۔

جاہلی ادب کی حقیقت دریافت کرنے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنے کے لیے میں وہی مسلک اختیار کروں گا جو فلسفہ اور دیگر علوم میں روشن خیال طبقے نے اختیار کیا ہے، یعنی ادبی بحث میں بھی وہی طرز ہوگا جو زمانۂ جدید کے ابتدائی دور میں چیزوں کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے دیکارٹ (Descartes) نے اختیار کیا تھا ایسی بحث کا بنیادی اصول عام، طور پر ہر ایک جانتا ہے، یہی ہے کہ تحقیقات کرنے والا ان تمام خیالات سے اپنے کو اس طرح خالی الذہن کرلے جو موضوع سے متعلق اس کے دماغ میں تھے جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ صرف یہی طریقۂ کار ہے جو باوجود اس کے کہ اول روز

سے قدامت پرستوں کا گروہ اس طرزعمل سے نالاں ہے، سب سے زیادہ مفید و موثر ثابت ہوا اسی سے ایک طرف پرانے علوم پرانے فلسفے کی تجدید ہوئی اور دوسری طرف اس طریقۂ کار نے ادیبوں اور فن کاروں کا راستہ صاف کیا۔

اب جس وقت جاہلی ادب اور اس کی تاریخ کی تلاش و جستجو میں اس نئے راستے پر ہم کو چلنا ہے، تو سب سے پہلے ان تمام اقوال اور ارشادات سے اپنے دل کو اچھی طرح پاک صاف کر لینا چاہیے جو اس سلسلے میں مشہور ہیں اور ان تمام بھاری بھاری زنجیروں سے اپنے کو آزاد کر لینا چاہیے جو ہاتھوں، پیروں اور ہمارے ذہنوں کو جکڑے ہوئے ہیں، تا کہ ہماری جسمانی حرکت بھی آزاد ہو اور ذہنی رفتار بھی۔

جذبات اور میلانات وغیرہ ہاں! اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جاہلی ادب اور اس کی تاریخ سے بحث کرتے وقت اپنے تمام قومی جذبات اور ذاتی میلانات کو قطعاً نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مذہبی محرکات یا لا مذہبی مزعومات بین الاقوامی مصالح یا بین الملی خواہشیں، ان میں سے ایک چیز کو بھی ہماری جستجو اکی راہ میں حائل نہ ہونا چاہیے، نہ تو کسی بات کو آنکھ بند کرکے مان لینا چاہیے ور نہ کسی خاص رائے اور قول کی طرف جھکنا چاہیے سوائے اس صورت کے کہ علمی طریقۂ کار ہمیں مجبور کردے۔ ورنہ قومی جذبات، مذہبی محرکات، ذاتی میلانات اور مذہبی مزعومات ہمیں زیادتی کرنے، راہ حق سے تجاوز کرنے اور نامناسب پابندیوں میں گرفتار ہونے پر مجبور کر دیں گے۔

متقدمین بھی اسی جہالت کا شکار ہوگئے تھے۔ اور اسی چیز نے ان کے علمی ذخیروں کو بے وقعت بنا دیا ہے۔ قومی اعتبار سے وہ لوگ اگر عجمی النسل تھے تو مخالفانہ جذبات کے ساتھ عربوں کے کار ناموں کو دیکھتے تھے اور اگر عربی النسل تھے تو ان کارناموں پر فخر کرنا ضروری سمجھتے تھے اسی بے راہ روی سے ان کا علمی سرمائہ نقائص سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مذہبی اعتبار سے اگر وہ علماء، مسلمان اور اسلام کی محبت میں پر خلوص تھے تو ان کے تمام اعمال اسلام کی جا و بیجا فضیلت ثابت کرنے میں ہوتے تھے۔ ان کے اس ناجائز طریقے نے کوئی علمی بحث کا موقعہ آنے ہی نہ دیا۔ اگر کسی ادبی تحقیق، علمی بحث اور فنی موشگافی کی طرف بڑھے بھی تو اس کا مقصد یہی رہا کہ اسلام کی برتری ثابت ہو یا کم از کم مذہب اسلام کی تائید

ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے موافق چیزیں لے کر خوب حاشیہ آرائی کی گئی اور جہاں زرا بھی تصادم کا امکان معلوم ہوا وہاں سرے سے انکار کر دیا گیا۔

اور اگر ادبی بحث کرنے والے غیر مسلم ہوئے، یہودی، عیسائی، مجوسی، لامذہب اور منافق ــــ ظاہر میں مسلمان اور باطن میں مسلمانوں کے جانی دشمن ــــ تو ان لوگوں کا بھی مذہبی محرکات کے ہاتھوں وہی حال ہوا جو بگے مسلمانوں کا ہوا تھا۔ اسلام کو نقصان پہنچانے، اس کی شان گھٹانے اور اس کو زک دینے کی پوری کوشش کی گئی۔ وہی بحثیں چھانٹ چھانٹ کر اٹھائی گئیں۔ جن سے مذہبی منافرت اور دینی تعصب زیادہ سے زیادہ پھیل سکے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہ صرف اپنے ساتھ ظلم کیا بلکہ مذہب اسلام پر بھی کاری ضربیں لگائیں۔ علم کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا چاہا اور آنے والی نسلوں پر زیادتیاں کرتے چلے گئے۔

علمائے قدیم کا یہ گروہ اگر علم اور نفس کے درمیان فرق کر سکتا۔ علوم کی چھان بین موجودہ طرز پر کرتا اور قومی حمیت اور مذہبی تعصب کو دخل نہ دیتا تو یقیناً وہ دشواریاں پیش نہ آتیں جن سے ہر ہر قدم پر آج سابقہ پڑتا ہے۔ اور ہمارے ہاتھوں میں ادب کا ایک ایسا معقول سرمایہ آجاتا، جو موجودہ نقلی ادب سے بہت مختلف ہوتا۔ اور آج جن بحثوں میں مجبوراً الجھنا پڑ رہا ہے ان سے نجات مل جاتی ــــ مگر یہی انسان کی اصلی کمزوری ہے۔ اس کی فطرت اسی طرح واقع ہوئی ہے جس سے نجات ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ جاہلی ادب اور اس کی تاریخ کا مطالعہ ہم کو اس طرح کرنا چاہیے کہ نہ تو اس کی جائز اور ناجائز برتری ثابت کرنے کی دھن ہو اور نہ اس کی طرف سے نفرت یا بغض کا کوئی تصور دماغ میں ہو۔ چاہے اس سلسلے میں کتنے ہی تلخ گھونٹ حلق کے نیچے اتارنا پڑیں اگر اس حد تک ہم نے اپنے کو آزاد کر لیا اور حقیقی علمی بحث چھیڑی تو اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے کہ ہمارے سامنے ایسے نتائج ظہور پزیر ہوں گے جو متقدمین کی دسترس سے قطعی دور تھے۔ کیونکہ علمی میدان میں اختلاف رائے سے نفرت کبھی نہیں پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ جذبات اور خواہشات ہوتے ہیں جو بالآخر لوگوں میں نفرت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ دیکارٹ کا طریقۂ بحث، نہ صرف فلسفہ اور حقیقت اشیاء کی تحقیق میں ضروری ہے بلکہ ادبی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں

بھی کارآمد ہے، اور جس طرح ادیبوں اور فن‌کاروں نے اس سے فائدہ حاصل کیا ہے اسی طرح پڑھنے والے اور مطالعہ کرنے والے بھی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اسی لیے میں اس درخواست کرنے میں حق بجانب ہوں کہ میری آیندہ تحریر کو وہی حضرات مطالعہ کریں جو کچھ نہ کچھ آزادی کی تڑپ اپنے دل میں رکھتے ہوں! وہ لوگ جو کسی طرح بھی قدامت کی قیادت سے اپنا رشتہ نہیں توڑسکتے اور جذبات و خواہشات کی قید و بند سے آزادی نہیں حاصل کرسکتے ہیں ان سے میں بکمال ادب عرض کروں گا کہ وہ سطور ذیل کو مطالعہ فرمانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔

” ایام جاہلیت کا اصلی نقشہ قرآن میں تلاش کرنا چاہیے ، موجودہ جاہلی ادب میں نہیں “

جو لوگ جاہلی ادب پر محنت اور وقت صرف کیا کرتے ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ واقعی جاہلی ادب کا سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، جس سے اسلام سے پہلے کی عربی زندگی کا صحیح تصور قائم کیا جاسکتا ہے، ان لوگوں کے اطمینان کے لیے میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد، ان کے معتقدات کی تردید کرنا یا اس عربی زندگی تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا نہیں ہے، جس میں ان لوگوں کو ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آسان، مختصر اور واضح راستہ اس عربی زندگی تک پہنچنے کا دریافت کروں، یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ «اس عربی زندگی تک جو اب تک پوشیدہ تھی» رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں—وہ عربی زندگی جو زیادہ قیمتی، زیادہ روشن، زیادہ مفید اور اس زندگی کے بالکل مخالف ہے جو شعرائے جاہلیت کے اشعار سے ماخوذ ہے—یہ سمجھ لینا کہ میں ایام جاہلیت کی اجتماعی یا انفرادی یا ادبی زندگی کا منکر ہوں، غلط ہے، میرا انکار تو صرف اس حد تک ہے کہ جاہلی ادب سے جو زندگی کا نقشہ مرتب کیا جاتا ہے وہ اس زمانے کی اصلی زندگی سے قطعی مختلف ہے۔

مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے زیادہ قابل وثوق طریقے سے جب ہم زمانۂ جاہلیت کا نقشہ کھینچنے بیٹھتے ہیں تو ہمیں وہ تمام باتیں غلط معلوم ہوتی ہیں

جو اب تک جاہلی ادب کی روشنی میں کہی گئی ہیں ۔ اس لیئے جاہلی ادب بھی مشتبہ ہو جاتا ہے اور وہ نقشہ بھی جو اس سے اتارا گیا ہے۔

اگر میں زمانۂ جاہلیت کی زندگی کا پتا لگانے بیٹھوں تو بجائے امرءالقیس نابغہ، اعشی وغیرہ کی متاع شاعری پر ہاتھ ڈالنے کے اور یہ مشتبہ راستہ اختیار کرنے کے دوسرا یقینی راستہ اختیار کروں گا اور ایسی عبارتیں تلاش کروں گا جس کی صحت اور سچائی میں زرا بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے قرآن کی ورق گردانی کروں گا اس لیے کہ اس سے زیادہ عہد جاہلیت کا سچا نقشہ اور کوئی نہیں پیش کر سکتا اور اس کا ایک لفظ بھی مشتبہ نہیں ہے۔

ایک طرف قرآن کی ورق گردانی کروں گا، دوسری طرف ان شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کروں گا جو رسول عربی کے معاصر اور مخالف تھے، یا بعد کو آنے والے ان شعرا کا کلام دیکھوں گا جنھوں نے اپنے آباؤاجداد کے تصورحیات سے روگردانی نہیں کی، اسی زندگی کو طرۂ امتیاز بنائے رہے جو قبل اسلام ان کے بزرگوں کا سرمایۂ افتخار تھی اور اس کے بعد دور بنی امیہ کے شعرا کا کلام پڑھوں گا، اس لیے کہ میرا خیال ہے کسی قوم نے اپنی ادبی روایتوں کی اس طرح حفاظت نہیں کی ہوگی جس طرح عربی قوم نے دور بنی عباس تک جب کہ عجمی تصور عربی ماحول میں سرایت کرنے لگا تھا۔ اور بنی امیہ کے زمانے میں جو اضافہ ہوا بھی وہ اس قدر مختصر ہے کہ بآسانی نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

اسی بنا پر مجھے خیال ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت کی اصلی تصویر فرزدق، جریر، زوالرمہ اور اخطل (دور بنی امیہ کے شعرا) کی شاعری میں جس قدر جھلکتی ہے، اس کا شمہ برابر بھی ان اشعار میں نظر نہیں آتی جو شعرائے جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔

ابھی اوپر میں نے کہا تھا کہ "قرآن ہی عہد جاہلیت کا سچا نقشہ پیش کر سکتا ہے"، یہ سن کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی، اور ان کو یہ دعوی عجیب و غریب نظر آئے گا۔ مگر معمولی تفکر کے بعد اس دعوے کی بداہت تسلیم کرنا پڑے گی۔

مثلاً زرا سوچیے! یہ بات کسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اہل عرب قرآن کی آیتوں کو سن سن کر مبہوت اور از خود رفتہ تو ہو جاتے ہوں مگر ان کی ادبی قدر

و قیمت سے نا واقف ہوں اور ان باریکیوں کو نہ سمجھتے ہوں جو سننے والوں اور پڑھنے والوں کو حیران کر دیتی ہیں۔ یا عرب کی فصاحت اور بلاغت کی تمام طاقتیں قرآن کے مقابلے کی تیاری میں تو لگی ہوں مگر خود اہل عرب کی نظروں سے وہ حقائق اور رموز پوشیدہ ہوں جو قرآن پیش کر رہا تھا۔

کم از کم اتنی بات تو عقل کبھی قبول ہی نہیں کرسکتی ہے کہ قرآن پورا کا پورا عربوں کے لیے نئی چیز ہو۔ اگر قرآن ان کے لیے بالکل نیا ہوتا تو نہ وہ لوگ اس کو یاد رکھتے، نہ اس کا مقابلہ کرتے اور نہ اس پر ایمان لاتے۔ اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عربوں کے لیے نیا تھا تو صرف اپنے اسلوب بیان، دعوت عمل، اصول، قانون اور مسلک کی حد تک، مگر تھی وہ عربی زبان ہی کی ایک کتاب، اس کی زبان رائج اور مانوس زبان تھی یعنی وہی زبان جس کو ہم دور جاہلیت کی زبان کہہ سکتے ہیں، قرآن کے مخاطب اصلی بھی عرب ہی کے باشندے تھے۔ اسی لیے اس میں بت پرستی کے ان عقائد کی بہت زیادہ تردید ہے جو جزیرۃالعرب میں عام تھے، یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور دہریوں کے عقیدوں کی تردید ہے جن سے ملک عرب کو سابقہ رہتا تھا۔ یعنی ایسے باطل عقیدوں کی تردید ہے جس کے ماننے والے عرب کی فضا میں سانس لیتے تھے۔ اسی لیے آپ دیکھ لیجیے فلسطین کے یہودیوں، روم کے عیسائیوں، یا فارس کے آتش پرستوں کی ویسی تردید قرآن میں نہیں ملے گی۔

قرآن سب سے پہلے اپنا پیغام عربوں کو سنانا چاہتا تھا اس لیے بار بار وہی کمزوریاں دہرائی گئیں جن کا عرب کے رہنے والے شکار تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضمناً تمام فاسد عقیدوں کی تردید ہوجاتی ہو۔
قرآن اگر کوئی دوسری راہ اختیار کرتا تو قطعاً وہ نہ تو ایسی توجہ کرتے اور نہ تائید اور مخالفت میں جان و مال کی بازی لگا دیتے۔

ایک مثال | آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر بودھ مت، یا ایسے ہی دوسرے مذہبوں کی میں مخالفت شروع کروں جن کا ایک بھی ماننے والا پورے مصر میں نہیں مل سکتا ہے تو کوئی میری بات سنے گا؟

اس کے برعکس اگر یہودیت، عیسائیت یا اسلام کے خلاف کوئی بات موتھ سے نکل جائے تو؟ بات پوری طرح موتھ سے نکلنے بھی نہیں پائے گی کہ سب سے پہلے عام

قرآن کہتا ہے کہ ان کا مذہبی تعصب اور دینی جذبہ اپنے ساتھیوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ "آؤ! ہمارے ساتھ اسلام کے خلاف جنگ میں شریک ہوجاؤ" اور لوگ اس صدا پر لبیک کہتے ہوئے اسلام کے خلاف آمادہ بہ عناد ہوجاتے ہیں اور جب جنگ اور نبرد آزمائی مفید نتائج پیدا نہیں کرتی تو مذہبی تعصب رکھنے والے مکر و فریب پر اتر آتے ہیں، پھر ظلم کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور آخر میں اپنی پوری منتشر طاقت کو سمیٹ کر کھلم کھلا اپنے دینی اور مذہبی احساس کا مظاہرہ کرتے ہیں جہاں ناکامی انہیں آ دبوچتی ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو قریش مکہ اپنے بھائی بندوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہوں، طرح طرح کے عذاب دے رہے ہوں، انہیں گھر سے بے گھر بنا رہے ہوں اور پھر سالہا سال تک دولت، عزت اور اجتماعی زندگی کی بازی لگا کر سر و تن کا کھیل کھیلتے رہے ہوں مگر ان کا مذہبی جذبہ اسی سطح پر ہو جو جاهلی ادب سے جھلکتا ہے۔

ناممکن ہے۔قریش مکہ قطعی طور پر پکے مذہبی تھے، ان کا دینی جذبہ اور مذہبی احساس قطعی بیدار تھا۔ اور ان کی راسخ الاعتقادی ہی کے یہ سب کرشمے تھے کہ اسلام کی مخالفت میں وہ کچھ کر دکھایا اور وہ عظیم الشان قربانیاں کیں، جس کا پاسنگ بھی نہ یہودیوں سے ہو سکا اور نہ ان لوگوں سے جو اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے تھے۔

اب بتائیے جاهلی ادب اور قرآن میں کیسا اختلاف ہے! اور قرآن کس حد تک صحیح ترجمانی کرتا ہے!!

۲ عقلی قوتیں

قرآن عربوں کی صرف مذہبی زندگی کا صحیح صحیح حال نہیں بتاتا بلکہ اس دور کی اجتماعی زندگی کے بہت سے رخ قرآن ہی کی وجہ سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جہاں پر تجاهلیت کا موجودہ الحاق ادب خاموش ہے، عربوں کی ذہنی صلاحیت اور سوجھ بوجھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے ان کے قوت استدلال، بیان اور بحث مباحثے میں ان کی ذہنی جولانیوں کو تسلیم کر کے ان کی عقل اور ذہنی زندگی کی بھی تصدیق کی ہے۔

قرآن نے جگہ جگہ قریش مکہ کی عقلی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ رسول عربی سے پر زور مباحثے کرتے، غالب آنے اور بات چیت میں زیر کرنے کی کوشش

کرتے رہتے تھے، کیوں بحث کرتے تھے؟ کس بارے میں بحث کرتے تھے؟ اور کس معاملے میں زیر کرنے اور غالب آنے کی کوشش کرتے رہتے تھے؟

یہ مباحث، صرف مذہب اور متعلقات مذہب سے متعلق ہوتے تھے!

ان اہم مسائل پر مقابلہ ہوتا تھا جن کے حل کرنے میں فلاسفۂ قدیم نے اپنی اپنی زندگیاں تج دی تھیں مگر اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حشر و نشر، کائنات کی تخلیق، خدا اور انسان میں رابطہ، اور معجزے کی حقیقت" یہی وہ مسائل تھے جن کو سادہ لوح عرب سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش میں پیغمبر اسلام سے مباحثہ کرتے تھے۔

وہ قوم جو ان مباحث پر ایسی مہارت اور قوت سے طبع آزمائی کرتی ہو، کہ قرآن — فریق مخالف — کو ان کی طاقت کا اعتراف کرنا پڑا ہو، کیا کسی طرح ممکن ہے کہ جہالت، پست خیالی، ذہنی بے مائیگی، اور کج بحثی میں وہ قوم ٹھیک اسی منزل میں ہو جس کا نقشہ موجودہ جاہلی ادب پیش کرتا ہے؟

ناممکن ہے! وہ لوگ جاہل، غبی، پست خیال اور کج بحث ہوہی نہیں سکتے!!

قرآن کے اس اعتراف کے بعد بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا یہ مخالف گروہ سمجھ دار ذی علم، صاحب نظر، اور معاملہ فہم واقع ہوا تھا۔

اسی ضمن میں یہ بات ظاہر کر دینا لازمی ہے کہ سمجھ داری اور روشن خیالی کا یہ حکم تمام اہل عرب پر نہیں لگایا جا سکتا اور نہ قرآن ہی نے اتنا عام دعویٰ کیا ہے۔ یہاں بھی دوسری اور قوموں کی طرح دو طبقے تھے:—

۱ - روشن خیالوں کا طبقہ جو اپنے مرتبے، دولت اور علم کی وجہ سے سربرآوردہ سمجھا جاتا تھا۔

۲ - عوام الناس کا گروہ جو دولت اور علم سے محروم ہونے کے باعث روشن خیالی سے بھی محروم تھا۔

یہ بات بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ کفار کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ پر ان کمزور قسم کے لوگوں کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے جو صرف سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں کی پیروی میں، کفر پر قائم تھے جس میں ذاتی رائے یا جذبۂ حق پسندی کا

کوئی دخل نہ تھا۔ اسی لیے جب اسلام پر کفر کو ترجیح دینے کی وجہ ان سے پوچھی جائے گی تو قرآن کے الفاظ میں وہ یہ جواب دیں گے۔

«اے پروردگار! ہم نے تو اپنے سے بڑوں اور سرداروں کی اطاعت کو اختیار کر لیا تھا، انھی لوگوں نے ہمیں گمراہ کر ڈالا» دوسری جگہ دیہاتی عربوں (گنواروں) کی درشتی، سخت مزاجی، کفر اور نفاق پر ثبات قدمی اور ان نرم جذبات سے محرومی کا جو ایمان اور یقین کے معاون ہوتے ہیں، قرآن نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:-

«گنوار، کفر و نفاق میں بہت سخت واقع ہوئے ہیں، خدا کے نازل کردہ آئین وحدود سے لا علمی ہی ان کے مناسب حال ہے»

اس کے علاوہ آپ کی نظر سے قرآن کے وہ حصے ضرور گزرے ہوں گے، جن میں پیغمبر اسلام کو بعض لوگوں کو رام کرنے کے لیے روپیہ خرچ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس سے بھی، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کی طرح، عربوں میں بھی طبقے اور امتیازات تھے ان میں وہ لوگ بھی تھے جو سر بر آوردہ اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے مباحثہ اور مقابلہ کر سکتے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو اس نعمت سے محروم تھے، اور کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتے تھے جن کا کام صرف تقلید تھا۔ دراصل انھی لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے قریش اور رسول میں کشاکش رہتی تھی اور ان ہی میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کی تالیف قلب کے لیے روپے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔

۳ بیرونی دنیا سے رشتہ

صرف یہی نہیں - قرآن سے عربوں کی زندگی کا ایک رخ اور نمایاں ہوتا ہے، جس سے ان لوگوں کو ضرور اچنبھا ہوگا۔ جو زمانۂ جاہلیت کی زندگی کی حقیقت معلوم کرنے میں الحاقی جاہلی ادب پر اعتماد کرنے کے عادی ہیں۔ ان بیچاروں کا یہ عقیدہ ہے — اور اس میں ان لوگوں کا قصور بالکل نہیں — کہ اسلام سے پہلے قوم عرب ایک خانہ بدوش اور دنیا سے بے تعلق قوم تھی، اور میدانوں میں اپنی زندگی کے دن گزار تی تھی۔ نہ وہ بیرونی دنیا کو جانتی تھی اور نہ بیرونی دنیا ان سے واقف تھی۔

اسی عقیدے پر یہ لوگ اپنے نظریوں اور عقیدوں کی بنیاد رکھتے ہیں، چناں چہ ان کا کہنا ہے کہ «جاہلی ادب ان خارجی موثرات سے محفوظ رہا، جو اسلام

کے بعد عربی شاعری پر اثر انداز هوئے، مثلاً روم اور ایران کے تمدن کا کوئی اثر جاهلی ادب پر نهیں پڑا "—اور یه ممکن بهی کیسے تها؟ جب که بقول ان لوگوں کے یه ادب صحراؤں اور ریگستانوں میں جہاں متمدن قوموں سے کوئی علاقه قائم نهیں هو سکتا، پیدا هوا، وهیں پروان چڑها اور اسی دنیا میں محدود رها۔

مگر قرآن کا دعویٰ اس کے بالکل برعکس هے۔ وه جهاں کهیں عربوں کی زندگی پر روشنی ڈالتا هے وهاں اور باتوں کے ساته یه بهی کهتا هے که "عرب قوم اپنے گردو پیش کی قوموں سے میل جول رکهتی تهی" اور یه میل جول اس حد تک بڑها هوا تها، که اس نے تعصب کی شکل اختیار کرلی تهی، جس نے عربوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تها۔

آپ نے قرآن کا مطالعه صحیح روشنی میں کیا هے تو کیا آپ یه کهه سکتے هیں که قرآن نے جهاں روم کا اور اس لڑائی کا جو روم اور ایران کے درمیان هوئی تهی، ذکر کیا هے وهاں یه نهیں کها هے که اس لڑائی نے عربوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا تها؟ ایک روم کی خیرخواهی کا دمبهرتا تها دوسرا ایران کی طرف داری کا —اور کیا آپ قرآن کی اس سورت کا انکار کر سکتے هیں جو سورهٔ روم کے نام سے قرآن میں موجود هے؟ جس کی ابتدائی آیتیں یه هیں:—

الم غلبت الروم فی ادنی الارض وهم من بعد غلبهم سیغلبون فی بضع سنین لله الامر من قبل ومن بعد ویومئذ یفرح المومنون بنصر الله ینصر من یشاء	روم پاس والی سر زمین میں مغلوب هوگئے وه لوگ شکست کهانے کے بعد غالب هوں گے، چند هی سالوں میں، الله کے هاته میں تمام پچهلے اور اگلے کام هیں۔ اس دن ایمان والے خوش هوں گے، الله تعالی کی مدد سے، وه جس کی چاهتا هے مدد کرتا هے۔

اس سے صاف طور پر پتا چلتا هے که اسلام سے قبل بهی عربوں کے تعلقات بیرونی دنیا سے تهے، موجوده جاهلی ادب کے ماننے والوں کا یه گمان بالکل غلط هے که پوری عرب قوم دنیا سے بے تعلق تهی۔ آپ نے دیکه لیا که قرآن ان لوگوں کی روم اور ایران کی سیاست میں دلچسپی لینے کا کس طرح تذکره کرتا هے—ایک

دوسری جگہ بیرونی دنیا سے ان کے اقتصادی تعلقات کو سورۂ قریش میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:—

لایلاف قریش ایلافہم رحلۃالشتاء والصیف — قریش۔اهل مکہ۔کو متحرک رکھنے کے لیے ان کی جاڑے اور گرمی کے سفروں پر روانگی ہے۔

یہ دونوں سفر بیرونی دنیا هی کی طرف هونے تھے۔ ایک شام کی طرف، دوسرا یمن—ایران اور حبشہ— کی طرف اور—رسول عربی کی واضح سیرت سے بھی یہ علم هوتا ہے کہ عرب قوم آبنائے باب المندب سے هوکر ملک حبش کی طرف هجرت کر کے گئی تھی اور دوسرے موقع پر حیرہ هوتی هوئی، ایران تک اور شام و فلسطین هوتی هوئی مصر تک پہنچ گئی تھی—کیا اس کے بعد بھی بیرونی دنیا سے ان کی بے تعلقی کا الزام صحیح هوسکتا ہے؟

اوپر ذکر کی هوئی باتوں سے عربوں کے لیے ثابت هوتا ہے کہ:—

الف۔ پڑوسی قوموں—ایران، روم، حبشہ اور هندستان کے رهنے والوں—کے اثر سے محفوظ نہیں تھے۔

ب۔ سب کے سب جاهل اور سخت مزاج نہیں تھے۔

ج۔ بے دین اور لا مذهب نہیں تھے—اور

د۔ دوسری قوموں کے اعتبار سے، سیاسی اور اقتصادی طور پر بیرونی دنیا سے بے تعلقی کا الزام ان کے لیے صحیح نہیں هوسکتا۔ قرآن نے زندگی کا یہی نقشہ کھینچا ہے۔

عرب کی زندگی کا اقتصادی پہلو

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے ‹‹قوموں کی زندگی›› کا کھوج لگانے والے اپنی توجہ کا بیشتر حصہ اس پہلو کو جاننے میں صرف کر دیتے هیں۔ اس سے واقفیت کے بعد هی اجتماعی زندگی کی صحیح تصویر نظر آسکتی ہے۔

عربوں کی داخلی اقتصادی زندگی هی کے ذریعے وہ تعلقات معلوم کیے جاسکتے هیں، جو عرب قوم میں ایک طبقے کے دوسرے طبقے کے ساتھ اور ایک گروہ کے دوسرے گروہ کے ساتھ تھے۔

امرءالقیس کا کلام پڑھیے یا کسی اور شاعر کا ـــ آپ پورا جاہلی ادب کا انبار الٹ ڈالیے اس خاص، موضوع ـــ اقتصادی زندگی ـــ پر ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملے گا جو ان کے اقتصادی تعلقات کی طرف رہنمائی کر سکے۔

یہ الحاقی ادب اور منسوب کلام اسی اہم حقیقت کے اظہار سے بھی اس طرح قاصر ہے جیسے اور پہلووں کی ترجمانی سے، اور جس طرح عربوں کی تجارتی اور خارجی زندگی اور بیرونی دنیا سے تعلقات کا علم قرآن سے ممکن ہوا، یہاں بھی قرآن ـــ اور صرف قرآن ـــ سے آپ یہ جان سکیں گے کہ پیغمبر اسلام کے مبعوث ہونے کے وقت عربوں کے باہمی داخلی اقتصادی تعلقات ناخوش گوار اور ناپسندیدہ تھے۔

ممکن ہے یہ "ناپسندیدگی" نتیجہ ہو ان بہت سی چیزوں کی "پسند" کا جن کی محبت اسلام کی وجہ سے بہت سے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی۔

قرآن کے کہنے کے مطابق عرب قوم دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک روشن خیالوں اور سربرآوردہ لوگوں کا طبقہ اور دوسرا ان پڑھ غریب اور پست خیال لوگوں کا گروہ، اور یہ بھی اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ یہی غریب طبقہ پیغمبر اسلام اور دشمنان اسلام کے درمیان مابہ النزاع تھا۔

ان حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ قرآن کا مطالعہ کیجیے تو صاف طور پر کھل جائےگا کہ اقتصادی اعتبار سے بھی عرب قوم دو طبقوں میں تقسیم تھی۔ ایک امیروں، سرمایہ داروں اور مہاجنوں کا طبقہ تھا اور دوسرا مفلسوں، ناداروں اور تہی دستوں کا۔ جو ان مہاجنوں اور سرمایہ داروں سے ٹکر بھی نہیں لے سکتا تھا اور ان سے بےنیاز ہوکر زندگی بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

قرآن نے صاف لفظوں میں ان لوگوں کی اعانت کا بیڑا اٹھایا، اور پورے حزم و قوت کے ساتھ ان غریبوں اور ناداروں کی پشت پناہی کے لیے میدان میں اتر آیا۔ ان کی طرف سے مدافعت کرنے اور ظلم کرنے والوں کے مقابلے کے لیے خود سینہ سپر ہوگیا۔

اس مقابلے اور مدافعت میں اسلام نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ کہیں سود کے حرام کرنے اور سودی کاروبار کی روک تھام کرنے میں اسے طاقت اور تشدد سے کام لینا پڑا۔

جو لوگ سودی کاروبار کرتے تھے ان کو ایسے لوگوں سے تشبیهه دی ، جن کے حواس کسی جن یا پریت کے لپٹ جانے سے غائب هوجاتے هیں ۔

جو لوگ مسلمان هیں ان کو حکم دیا که خدا سے ڈریں اور جو کچھ سود رہ گیا ہے اس سے هاتھ اٹھالیں ، انھیں مطلع کیا ہے که اگر ایسا نہیں کیا گیا تو خدا اور اس کے رسول سے « جنگ » کے لیے تیار هوجانا چاهیے ـــ اور کہیں نرمی اور مہربانی کا راسته اختیار کرنا پڑا ، خیرات کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا ۔ امیروں کو غریبوں کی خبرگیری کے لیے هدایت کی ایسی ایسی مثالیں بیان کیں که دولت‌مند اور امیر طبقه غریبوں سے حسن سلوک اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کی خود هی خواهش کرے ، صدقه و خیرات کو خدا کے اوپر « قرض » قرار دیا جو قیامت کے دن قرض‌خواهوں کو دگنا اور چوگنا کرکے واپس کیا جائےگا ۔ اور کہیں تشدد اور نرمی کا ملاجلا درمیانی راسته اختیار کرنا پڑا اس طرح که زکوٰۃ فرض کی گئی اس بنیاد پر که یه امیروں کے لیے طہارت اور صفائی کا ذریعه ہے اور غریبوں کی ضرورتیں پورا کرنے کا راسته ، کیا آپ خیال کرسکتے هیں که سود کی حرمت ، خیرات کی طرف رغبت اور زکوٰۃ کی فرضیت پر قرآن نے جو اس قدر توجه صرف کی ہے یه بغیر عربوں کی اندرونی اقتصادی زندگی کی تباہ کاریوں کے ممکن تھا ؟ اور بلا ضرورت یه سب سرمغزنی کی گئی ہے ؟

ظاهر ہے که ایسا نہیں ! بلکه یه بات صراحة اس فساد اور اضطراب کا پتا بتاتی ہے جو ان کی اقتصادی زندگی میں موجود تھا ، اچھا اب براہ‌کرم اس قسم کا کوئی ذکر زرا اپنے جاهلی ادب میں تو دکھا دیجیے صراحة نہیں ضمناً سہی ۔ آپ کے جاهلی ادب کی نظم و نثر میں وہ کون سی جگه ہے جہاں غریبوں اور امیروں کی طبقاتی کش‌مکش اور غریبوں کی سپراندازی کی کوئی جھلک نظر آتی ہو ؟ مجھے بتائیے وہ کون کون سے مقامات هیں ؟ یقیناً آپ ایسے مقامات بتانے سے قاصر هیں ، جاهلی ادب کا پورا ذخیرہ چھان ماریے ، ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملےگا جو ان کی اس قسم کی اقتصادی زندگی کا راسته بتائے پھر آپ هی بتائیے که ایسے ادب کو هم ادب کہ سکتے هیں جو اپنے زمانے کی تمدنی ، اجتماعی اور اقتصادی زندگی کی عکاسی سے بالکل معذور ہو ؟

وہ کیسا ادب ہے جو اپنے زمانے میں غریب کی مفلسی، اس کی پریشان حالی کے اسباب اور مصائب کے محرکات کی عکاسی نه کرتا ہو، جو سرمایه‌دار کی سرکشی، ظلم، سختی اور غریبوں کے خون چوسنے کے بنیادی تذکروں سے خالی ہو؟

کیا آپ کے خیال میں ان مفلس اور نادار عربوں کے طبقے میں ایک زبان بھی ایسی نہیں تھی جو ایک دفعه بھی اس بدترین اور ناپسندیده زندگی کے خلاف آواز بلند کرسکتی؟

کیا ظلم و جبر میں حد سے گزر جانے والے سرمایه‌داروں میں ایک فرد ایسا نہیں تھا جو اپنی کبریائی اور غریبوں پر اپنے تسلط اور اقتدار کے ذکر میں صرف ایک بار فخریه زبان کھول سکے؟ اگر یه صحیح نہیں اور بیشک صحیح نہیں تو پھر صاف طور پر اعلان کرنا پڑے گا که جاهلی ادب کا یه ناقابل برداشت ذخیره سب کا سب الحاقی ہے!

دولت کی اهمیت عربوں کی نظر میں

یہی نہیں که قرآن سے عربوں کی داخلی اقتصادی زندگی کا نقشه نظروں کے سامنے آجاتا ہے بلکه ایک اور اهم اور ان کی زندگی کا سب سے زیاده قابل لحاظ رخ نظر آتا ہے جس کے لیے هم متوقع تھے که جاهلی ادب کے ذخیرے میں اس کا سراغ ضرور مل جائےگا کیوں‌که هر زمانے کا ادب هی اس رخ کو جانتا ہے اور بیان کرسکتا ہے زندگی کے اس اهم پهلو سے هماری مراد ہے «عرب اور دولت کا ارتباط» ان دونوں کا باهمی تعلق اور عربوں کا دولت کے ساتھ برتاؤ — ! یہی وه پہلو ہے جہاں تھوڑی دیر تامل اور تعمق کے بعد هم کو سوچنا اور فیصله کرنا پڑےگا که جاهلی ادب سچا ہے یا جھوٹا؟

ایام جاهلیت کی شاعری سے عربوں کی جو تصویر همارے سامنے آتی ہے وه یه ہے که لوگ بہت زیاده سخی، فیاض، دولت کو حقیر سمجھنے والے اور خرچ کرنے میں بےپروا هوتے تھے لیکن قرآن میں هم بار بار بخل اور لالچ کی مذمت دیکھتے هیں اور محسوس کرتے هیں که ایام جاهلیت کی اجتماعی و اقتصادی زندگی طمع اور بخل کی آفتوں میں مبتلا تھی، اس قول کی تصدیق کے لیے وه آیتیں بہت کافی هیں، جن

میں یتیم کی تربیت میں رعایت کرنے اور اس کے مال میں بےجا تصرف نہ کرنے کے احکامات موجود ہیں صرف. ایک آیت اس موقع پر درج کی جاتی ہے۔

ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یاکلون فی بطونهم ناراً وسیصلون سعیراً

جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم اور زیادتی سے خورد و برد کرلیتے ہیں تو (وہ یاد رکھیں) یہ حرکت اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی ہے کہ وہ اپنے شکم میں آگ کے انگارے بھررہے ہیں اور قریب ہے کہ دوزخ میں جھوکے جائیں‌گے۔

اس سے اور اس قسم کی آیتوں سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں فیاض، دولت کو حقیر سمجھنے والے اور روپیہ لٹانے والے نہ تھے جیسا کہ جاہلیت کی شاعری سے معلوم ہوتا تھا، بلکہ ان میں اگر فیاض لوگ تھے تو بخیل بھی تھے، اگر دولت لٹانے والے تھے تو لالچی بھی تھے اور اگر مال و دولت جمع کرنے کو لاحاصل اور قابل توہین سمجھنے والے موجود تھے تو وہ لوگ بھی موجود تھے جو شرافت، فضیلت اور جذبات انسانی سب کو دولت جمع کرنے کے مقابلے میں حقیر سمجھتے تھے اور حق یہ ہے کہ عربوں کی زندگی واقعتہ ایسی ہی تھی اور بلاشبہ قرآن نے مکے اور مدینے کے متمدن لوگوں کی زندگی کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ ہی مناسب حال اور قابل قبول ہے اس لیے کہ تجارت ہی ان متمدن لوگوں کی زندگی کا سرمایہ تھا اور قدیم قوموں میں بھی جہاں کہیں تجارت کا ذکر ہے وہاں مجبوراً اس کے ساتھ سود، بخل، لالچ، ظلم اور اس قسم کے انفرادی اور اجتماعی نقائص کا ذکر ہے جو دولت کی محبت اور مال کے جمع کرنے سے وابستہ ہیں۔ دراں‌حالیکہ جاہلی ادب میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور قرآن ناقابل تردید انداز میں مکے مدینے اور طائف کی زندگی کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے وہی تصویر پیش کرتا ہے جو دوسرے پرانے شہروں یونان، روم، قرطاجنہ Carthage کی تصویروں سے ملتی جلتی ہے بلکہ قرآن نے اس سے زیادہ واضح طور پر اس طرف رہنمائی کی ہے کہ یہ انقلاب جو اسلام اپنے ساتھ لایا تھا محض مذہبی انقلاب نہ تھا بلکہ یہ مذہبی انقلاب کے دوش بدوش سیاسی اور اقتصادی انقلاب بھی تھا۔

قرآن اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اور تاریخ عرب کے اس اہم موضوع کو صاف کرنے کے لیے بہت دور تک ہماری رہنمائی کرتا ہے دیکھیے وہ کس طرح قرض دار اور قرض خواہ کے تعلقات کی تنظیم میں دقت نظر کا ثبوت دیتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ نرمی اور مہربانی سے کام لیا جائے اور محتاج قرض دار کے صاحب استطاعت ہونے کا انتظار کیا جائے اس کے بعد فریقین کے درمیان معاملے کو غیر مشتبہ اور صاف رکھنے کے لیے کس قدر دقت نظر، حزم، عدل اور توجہ کے ساتھ اصول طے کرتا ہے کہ میرا خیال ہے اس سے بہتر طور پر اور کسی دوسری جگہ آپ « عرب اور دولت » کے باہمی رشتوں کی تفصیل نہیں پاسکتے۔ سنیے!

« مسلمانو! جب کبھی ایسا ہو کہ تم خاص میعاد کے لیے ادھار لینے دینے کا معاملہ کرو تو چاہیے کہ اسے قید کتابت میں لے آؤ اور تمھارے درمیان ایک کاتب ہو جو دیانت‌داری کے ساتھ دستاویز قلم بند کردے۔

کاتب کو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے کہ جس طرح اللہ نے اسے دیانت‌داری کے ساتھ لکھنا بتا دیا ہے اس کے مطابق لکھ دے، اسے لکھ دینا چاہیے، لکھا پڑھی اس طرح ہو کہ جس کے ذمے دینا ہے وہ بولتا جائے۔ اور چاہیے کہ ایسا کرتے ہوئے اپنے پروردگار کا دل میں خوف رکھے جو کچھ اس کے ذمے آتا ہے اس میں کسی طرح کی کمی نہ کرے ٹھیک ٹھیک اعتراف کرے۔

اگر ایسا ہو کہ جس کے ذمے دینا آتا ہے وہ بےعقل ہو یا ناتواں ہو (یعنی لین‌دین اور معاملہ کرنے کی سمجھ نہ رکھتا ہو) یا اس کی استعداد نہ رکھتا ہو کہ خود کہے اور لکھوائے تو اس صورت میں چاہیے اس کا سرپرست دیانت‌داری کے ساتھ مطلب بولتا جائے۔

اور جو دستاویز لکھی جائے اس پر اپنے آدمیوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کرلو۔

اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد (کے بدلے) دو عورتیں جنھیں تم گواہ کرنا پسند کرو۔ اگر (گواہی دیتے ہوئے) ایک عورت بھول جائے گی دوسری یاد دلا دے گی۔

اور جب گواہ طلب کیے جائیں تو گواہی دینے سے گریز نہ کریں۔

اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، جب تک میعاد باقی ہے دستاویز لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک اس میں تمھارے لیے انصاف کی زیادہ مضبوطی ہے۔ شہادت کو اچھی طرح قائم رکھنا ہے اور اس بات کا حتی الامکان بندوبست کردینا ہے کہ (آیندہ) شک و شبہ میں نہ پڑو ہاں! اگر ایسا ہو کہ نقد (لین دین) کا کاروبار ہو جیسے تم (ہاتھوں ہاتھ) لیتے دیتے ہو تو ایسی حالت میں کوئی مضائقہ نہیں، اگر لکھا پڑھی نہ کی جائے لیکن (تجارتی کاروبار میں بھی) سودا کرتے ہوئے گواہ کرلیا کرو (تاکہ خریدو فروخت کی نوعیت اور شرائط کے بارے میں بعد کو کوئی جھگڑا نہ ہوجائے)

اور کاتب اور گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے (یعنی اس کا موقعہ نہ دیا جائے کہ اہل غرض ان پر دباؤ ڈالیں اور سچی بات کے اظہار سے مانع ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمھارے لیے گناہ کی بات ہوگی۔

اور چاہیے کہ (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمھیں (فلاح و سعادت کے طریقے) سکھلاتا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے، اور اگر تم سفر میں ہو اور (ایسی حالت ہو کہ باقاعدہ لکھا پڑھی کے لیے) کوئی کاتب نہ ملے تو اس صورت میں ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز گرو رکھ کر اس کا قبضہ (قرض دینے والے کو) دے دیا جائے پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں سے ایک آدمی دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے (یعنی جس کا اعتبار کرکے گرو کی چیز اس کی امانت میں دے دی گئی ہے) وہ (قرض کی رقم لے کر مقروض کی) امانت واپس کردے اور (اس بارے میں) اپنے پروردگار (کی پرسش) سے بےخوف نہ ہو۔

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ گواہی چھپاؤ، جو کوئی گواہی چھپائے گا وہ اپنے دل میں گنہگار ہوگا (اگرچہ بظاہر لوگ اس کے جرم سے واقف نہ ہوں اور اسے بےگناہ سمجھیں) اور (یاد رکھو) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں "

لوگ کہیں گے کہ "ایک جدید نظام" تو ساجز خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی اور رحمت سے ان کی مصلحتیں دیکھ کر نافذ کیا تھا، ہم بھی اس سے انکار

نہیں کرتے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعہ یوں ہی ہے، مگر سود حرام کرنا مثلاً بندوں پر مہربانی اور رحمت نیز مصلحتیں دیکھ کر جدید نظام میں ایک اہم جز سمجھا گیا تو اس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کی اقتصادی زندگی کی اصلاح کے ساتھ ہزاروں کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز اور لاکھوں انسانوں سے ظلم و ستم کے ہاتھوں کو کوتاہ کرنے کا ذریعہ بھی تھا، ورنہ پھر اس «نظام جدید» کی ضرورت ہی کیا، تھی اگر اس کا مقصد اس «تباہی» کو روکنا، جو عربوں کی اقتصادی زندگی میں بڑھتی چلی جارہی تھی، اور بہتر سے بہتر طریقے سے آپس کے معاملات کا بتانا نہ ہوتا۔

قرآن کا مطالعہ اور باریک نظر سے کیجیے تو اقتصادی زندگی کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کی طرف رہنمائی ملےگی، جن کو دراصل 'جاہلی ادب' میں ہونا چاہیے تھا، یا کم از کم ان چیزوں کی طرف اشارے ہی ہوتے، اگر 'موجودہ جاہلی ادب' کا «حقیقت اور صداقت» میں سے تھوڑا سا ہی حصہ ہوتا، مگر وہ تو سرے سے الحاقی ادب کا ایک طومار ہے جس میں دور دور حقیقت کی جھلک نظر نہیں آتی۔

آپ نے دیکھا ہوگا جاہلی ادب صرف «صحرا اور بادیہ» کی عربی زندگی کی ناقص تصویر پیش کرتا ہے اور کبھی «شہری زندگی» کا اظہار ہوتا ہے تو اس قدر سطحی جس کا کوئی تعلق «واقعیت» سے نہ ہو، زرا بھی تہ تک جانے کی کوشش نہیں کی جاتی، حالاں کہ «شہری زندگی» کا عربوں میں موجود نہ ہونا قابل تسلیم نہیں ہے اور نہ شعرائے اسلام ہی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مگر سب سے زیادہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کو زمانۂ جاہلیت کے اشعار میں کہیں بھی نہ تو سمندر کا ذکر ملےگا اور نہ اس طرف کوئی اشارہ۔ اگر کہیں کہیں یہ لفظ آ گیا تو اس طرح پر کہ اس سے سراسر ناواقفیت اور جہالت ٹپکتی ہے، گویا اس بنیا دپر ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب قوم حقیقتاً سمندر کے علم سے ناواقف تھی اور ان کی زندگی میں کبھی سمندر سے سابقہ نہیں پڑا تھا، حالاں کہ یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے قرآن نے عربوں پر یہ احسان رکھا ہے کہ «خدا نے تمھارے لیے سمندر کو مسخّر اور مطیع کردیا ہے تمھارے لیے سمندر میں مختلف منافع «پنہاں ہیں» قرآن نے «الجوار المنشات فی البحر کالاعلام»

(لونچے جہاز جو دریا میں پہاڑوں کی طرح کھڑے ہیں) کا ذکر کیا ہے، دریائی شکار کا ذکر کیا ہے اور قرآن نے احسان رکھا ہے کہ «خدا نے سمندر سے عربوں کے لیے تازہ گوشت، موتی اور مونگے نکالنے کے امکانات پیدا کیے ہیں۔ یہ سب صراحۃ قرآن میں مذکور ہے۔ میں یہ تو نہیں کرسکتا کہ اس سے نتیجہ نکالنے لگوں کہ عربوں کے پاس بڑے بڑے جہاز اور تجارتی اور جنگی کشتیاں تویں یا «لؤلؤ اور مرجان» نکالنا ان کی غیر معمولی دولت اور ثروت کا پتا دیتا ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کا ان چیزوں کا ذکر کرنا اور پھر عربوں پر اس کا احسان رکھنا کھلی ہوئی دلیل ہے اس امر پر کہ وہ لوگ ان چیزوں سے ناواقف نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے، ان کی زندگی میں یہ چیزیں کافی اثر انداز تھیں ورنہ قرآن کو اس کے ذکر کرنے اور عربوں کے خلاف اس سے دلیل پکڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

اب بتائیے کہ جاہلیت کے اشعار میں یہ باتیں کہاں مل سکتی ہیں؟

مختصر یہ کہ عرب قوم صاحب علم اور صاحب دین تھی، جب دولت مند اور بااقتدار اور صاحب سطوت تھی اور جب سیاسی، اقتصادی اور معاشی زندگی میں دنیا کی دوسری متمدن قوموں سے ہم آہنگ تھی تو کون چیز مانع ہے کہ عرب قوم کو بجائے خانہ بدوش جاہلی اور جنگلی قوم کے ایک متمدن قوم تسلیم کیا جائے جو ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

کون سمجھدار آدمی ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی ایسی جامع اور مکمل کتاب جاہل، جنگلی اور خانہ بدوش قوم میں اتاری گئی تھی۔

نتیجہ | زرا سوچیے کہ وہ تصویر جو مشہور جاہلی ادب سے اخذ کر کے اب تک علمائے قدیم پیش کرتے چلے آئے ہیں وہ اس تصویر سے کس قدر مختلف ہے جو قرآن پیش کرنا چاہتا ہے۔

یہ صحیح ہونا محال ہے کہ «دونوں تصویریں سچی ہیں» ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ تصویر زیادہ سچی اور حقیقت پر مبنی ہے جو زیادہ صحیح اور اٹل ذرائع سے حاصل ہوئی ہے اور دوسری تصویر نہ صرف یہ کہ خود غلط ہو بلکہ اپنے ساتھ ان ذرائع کو بھی ناقص ٹھہراتی ہے جس سے وہ حاصل کی گئی ہو۔ اسی بنیاد پر کہنا

پڑتا ہے کہ قرآن نے جو عربی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے وہی صحیح اور مکمل ہے اس لیے کہ قرآن کی صداقت ہر ممکن طریقے سے آزمائی جاچکی ہے جو کسی کتاب کی صداقت آزمانے کے لیے دنیا میں رائج ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے یہ ادب جو جاہلی ادب کے نام سے موسوم ہے کتابوں میں درج اور مدرسوں میں رائج ہے اور ثبوت اور شہادت میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سب غلط اور منسوب کیا ہوا ہے۔

کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے جاہلی ادب میں اضافے ہوئے؟ کیا چیزیں تھیں جنھوں نے لوگوں کو الحاق پر مجبور کر دیا؟ اور کیا موانع تھے جو اصلی جاہلی ادب کے رائج ہونے میں حائل ہوئے؟ ان سوالوں کا جواب دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے۔

منشی پریم چند کا ایک یادگار کردار

(از جناب اصغرعلی صاحب سکندرآبادی)

کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ لوگ ناول کو مخرب اخلاق سمجھتے تھے اور گھر کے بزرگوں نے اپنے چھوٹوں کے لیے اسے شجر ممنوعہ کی حیثیت دے رکھی تھی لیکن واقعات ایک حال پر کب رہے ہیں۔ زمانے کے ساتھ لوگوں کے مذاق میں بھی تبدیلی ہوئی اور سرسید کی تعلیمی تحریک سے پبلک، خصوصاً اردوداں پبلک، انگریزی ادبیات سے آشنا ہوئی۔ مغرب میں ناول کو ہر قسم کی تعلیم کا بہترین اور آسان ترین ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کیونکہ لوگوں پر خشک نصیحتوں کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے وہ ان نصائح کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں جو افسانے کی صورت میں ہوں۔ ناول نگار یا افسانہ نویس اپنے ماحول اور واقعات کو پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ تمام اچھائیاں اور برائیاں پیش کی جاتی ہیں جو اس زمانے میں عام ہوتی ہیں اور قاری غیرشعوری طور پر ان برائیوں کو، جو اس کے پیش نظر بھی ہوتی ہیں چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اچھائیوں کو اخذ کرتا ہے۔ موجودہ دور میں ہر ملک کے ادب میں ناول اور افسانہ نگاری کو اس درجہ فروغ ہوا ہے کہ یہ قول کہ "کسی زبان کی تاریخ ادب اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاسکتی جب تک کہ اس کے افسانے اس میں شامل نہ کیے جائیں" بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح افسانہ کسی قوم کے اخلاق و عادات کے بنانے اور سنوارنے کے لیے اہم ہے اسی طرح ناول میں کردارآفرینی یا خصلت نگاری کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ "ناول کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی سے کسی طرح کم نہیں" ناول نگار عورتوں مردوں کا گہری نظروں سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق ان کے افعال، ان کے خیالات، اغلاط اور خام کاریوں، ان کی عظمت اور ان کی فرومایگی سے ہے بےشمار حسین اشکال، ان کی متلون مزاجی، خوف، احساسات، جوش اور جذبات جو قلب انسانی میں تموج برپا رکھتے ہیں یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ مختصر یہ کہ

اس کا موضوع خود انسان ہے جس کو " مخلوق خداوندی کا بہترین نمونہ " مانا گیا ہے۔

کردار نگاری کے معنی یہ ہیں کہ مصنف، اشخاص قصہ میں ایسے عادات و خصائل، طبیعت اور سرشت پیدا کردے کہ وہ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسان معلوم ہوں اور ان کو ایسی خصوصیات کا حامل بنادیا جائے کہ انہیں عام انسان ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے لوگوں اور کرداروں سے آسانی سے امتیاز کیا جاسکے۔ لہذا ایک ناول نگار کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے کہ " اس کی ذہنی مخلوق حیات انسانی کے عام اور وسیع اصولوں کے مطابق ہو اور اس میں ایک ایسی انفرادیت بھی موجود ہو جو ان کو ممیز اور ہمیشہ کے لیے زندہ بنادے "

ہر اس صنف ادب میں جس میں پلاٹ ہو کردار نگاری کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ پلاٹ دراصل خود اشخاص قصہ کے افعال و حرکات کا دوسرا نام ہے، لیکن ناول کی کردار نگاری ہر صنف کی کردار نگاری میں ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے کیوں کہ دوسرے اصناف کے برخلاف ناول کے کردار کے ترکیبی عناصر زیادہ تفصیل سے بیان کیے جاسکتے ہیں اور مصنف اپنے عمیق مشاہدے کو زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرسکتا ہے اور اکثر نقادان ادب کا خیال ہے کہ کردار میں تدریجی ارتقا پیدا کرنا خاص ناول ہی کا کام ہے۔ اس کی تمام‌تر وجہ یہ ہے کہ ناول میں دوسرے اصناف ادب کے برخلاف اختصار وغیرہ کی پابندیاں نہ ہونے سے ناول نگار اپنے کردار کو مختلف حالتوں، مختلف کیفیتوں اور مختلف زمانوں میں پیش کرسکتا ہے اور اس کے ہر پہلو پر بالتفصیل بحث کرسکتا ہے۔ یہ تمام آسانیاں ہمیں افسانے یا ڈرامے میں نہیں ملتیں۔ اسی لیے جب ہم منشی پریم‌چند کا ایک کام‌یاب کردار پیش کرتے ہیں تو ان کے ناول ہی پر نظر انتخاب پڑتی ہے حالاں‌کہ اردو ادب میں منشی پریم‌چند اپنے ناولوں کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے مختصر افسانوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

اب ہم منشی پریم چند کے اس کردار کو پیش کرتے ہیں۔ یہ کردار ان کے ایک مشہور معاشرتی ناول 'گئودان' کی ایک کسان عورت دھنیا ہے۔ یہ کردار ناول کا ایک مرکزی کردار ہے اور ناول کی ابتدا سے آخر تک ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص قصہ کسی ناول میں شروع سے آخر تک موجود رہتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ وہ خود مصنف کا محبوب فرد قصہ ہے۔ کسی شخص قصہ کے ناول میں ابتدا سے

اختتام تک رہنے میں پڑھنے والے کے لیے ایک سہولت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ اس کے کردار سے اچھی طرح واقف ہوجاتا ہے اور وہ شخص قصہ قاری کی نظروں میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور وہ اس کے کردار کا عمیق مطالعہ کرسکتا ہے۔

کسی کردار کو پیش کرتے وقت ناول نگار کا فرض ہے کہ تعارف کراتے وقت ہی وہ اس کا ایک ایسا خاکہ پیش کرے کہ آیندہ وہ اس سے جس قدر صفات چاہے منسوب کردے اور شخص قصہ ان سب سے متصف معلوم ہو یا کم از کم ہر نوپیدا صفت ایسی ہو کہ وہ شخص قصہ کی سرشت اور طبیعت کے قطعی منافی نہ معلوم ہو۔ ہر مرتبہ موقع کی مناسبت سے شخص قصہ کے کردار میں ایک نئی صفت کا اضافہ کردارنگاری کی خامی بلکہ عیب ہے۔ اس طرح کردار اصلی انسان معلوم نہیں ہوتا بلکہ ناول نگار کے اشاروں پر چلنے والی غیرفطری کٹ پتلی بن جاتا ہے۔

ایک کامیاب ناول نگار کسی شخص قصہ کا ایک مختصر سا تعارف کرا کے خاموشی اختیار کر لیتا ہے اور قاری کو مانوس بنانے اور واقعات بیان کرنے کا کام خود شخص قصہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ منشی پریم چند بھی دھنیا کا تعارف ہم سے ان الفاظ میں کراتے ہیں :-

> « دھنیا دنیوی معاملات میں اتنی ہوشیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے زمین دار کے کھیت جوتے ہیں تو وہ اپنا لگان ہی تو لیگا، اس کی خوشامد کیوں کریں؟ اس کے تلوے کیوں سہلائیں؟ اگرچہ اسے اپنی متاہلانہ زندگی کے ان بیس برسوں میں اس بات کا کافی تجربہ ہوگیا تھا کہ چاہے جتنی کتر بیونت کرو، کتناہی پیٹ کاٹو، چاہے ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑو پر لگان کا ادا ہوجانا مشکل ہے، پھر بھی وہ ہار نہ مانتی تھی اور اس مسئلے پر آئے دن میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے......... ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ چھتیسواں سال ہی تو تھا مگر سر کے سارے بال پک گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ جسم ڈھل گیا تھا۔ خوب صورت گندمی رنگ سانولا پڑگیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ یہ سب کچھ پیٹ کے فکر ہی کے سبب تو تھا۔ کبھی جینے کا سکھ نہ ملا۔ اس دائمی خستہ حالی نے اس کی خودداری کو بےدلی میں

تبدیل کردیا تھا۔ جس گرھستی میں پیٹ کو روٹیاں بھی نہ مل سکیں اس کے لیے اتنی خوشامد کیوں؟ ان حالات سے اس کا دل برابر بھڑکتا رھتا تھا اور دو چار جھڑکیاں سن لینے ھی پر اسے اصلیت کا پتا چلتا تھا۔

یہی مصیبتوں سے چور دھینا کیا تھی۔ منشی جی کے الفاظ میں سنیے:

«زبان کی تیز مگر موم جیسا دل رکھنے والی، پیسے پیسے کے لیے جان دینے والی مگر آبرو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار! جوانی میں وہ کم سندر نہ تھی......چلتی تھی تو رانی سی لگتی تھی۔ جو دیکھتا تھا دیکھتا ھی رہ جاتا تھا۔ یہی پٹیشوری اور جھنگری تب جوان تھے دونوں دھینا کو دیکھ کر سینے پر ھاتھ رکھ لیتے تھے۔ دروازے کے سو سو چکر لگاتے تھے.........دھینا گھر میں اکیلی رھتی تھی مگر کبھی کسی نے اس کو کسی مرد کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ پٹیشوری نے ایک بار کچھ چھیڑچھاڑ کی تھی تو اس کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ لالہ آج تک نہیں بھولے۔»

جو عورت خود اس قدر پاک باز رھی ھو وہ اگر ایک نوجوان بیوہ سے اپنے لڑکے (گوبر) کی آشنائی ھوجانے پر دونوں کو برا بھلا کہتی ھے تو کیا بے جا ھے؟

«بھولا کی وہ رانڈ لڑکی نہیں ھے جھنیا۔ وہ اسی کے پھیر میں پڑا رھتا ھے ....وہ ھے بھگا اور بہتّر گھاٹ کا پانی پیے ھوئے، اسے انگلیوں پر نچا رھی ھے اور یہ سمجھتا ھے کہ وہ اس پر جان دیتی ھے»

اور جب دونوں کی پوشیدہ ملاقاتیں رنگ لاتی ھیں اور جھنیا کو پانچ مہینے کا حمل ھوجاتا ھے اور وہ گوبر کے کہنے سے دھینا کے گھر ایک رات کو آجاتی ھے تو وہ اسے دیکھ کر آگ بگولا ھوجاتی ھے اور جب وہ اس کے نکالنے کے باوجود گھر سے نہیں جاتی تو اس واقعے کا تذکرہ اپنے شوھر سے اس طرح کرتی ھے:—

«مجھے تو اس کل‌منھی جھنیا کی چنتا ھے کہ اسے کیا کروں۔ اپنے گھر میں میں تو چھن بھر بھی نہ رھنے دوں گی.........میں نے تو کہہ دیا ھے کہ جو کیا ھے اس کا پھل بھوگ۔ ابھا گنی نے میرے لڑکے کو چوپٹ کردیا تب اسے بیٹھی رو رھی ھے۔ اٹھتی ھی نہیں۔ کہتی ھے کہ اپنے گھر کون

منھ سے جاؤں؟ بھگوان ایسی سنتان سے تو بانجھ ہی رکھے تو اچھا۔ سبیرے ہوتے ہوتے سارے گانو میں کاؤں کاؤں مچ جائے گی۔ ایسا جی ہوتا ہے کہ بس۔۔۔۔۔۔۔میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میں اپنے گھر میں نہ رکھوں گی۔ گوبر کو رکھنا ہو تو اپنے سر پر رکھے۔ میرے گھر میں ایسوں کے لیے جگہ نہیں ہے اور اگر تم بیچ میں بولے تو پھر یاتو تم رہوگے یا میں رہوں گی ،

مندرجۂ بالا اقتباس میں یہ بات قابل غور ہے کہ دھینا تمام الزام جھنیا کے سر منڈھے دیتی ہے اور اپنے لڑکے کو اس کے جال کی پھنسی ہوئی ایک چڑیا سمجھتی ہے۔ کتنی مائیں ہیں جو ایسے مواقع پر جب کہ کسی معاملے میں ان کی اپنی اولاد اور کوئی غیر شریک جرم ہوں، اپنی اولاد کو بری الذمہ نہیں ٹھیراتیں؟

لیکن وہی دھینا جو ابھی جھنیا کو گھر میں رکھنے کی روادار نہ تھی اور جس نے شوہر سے کہا تھا کہ « اگر تم بیچ میں بولے تو پھر یا تو تم رہوگے یا میں رہوں گی » کچھ خیال کر کے اپنے شوہر سے اسے گھر سے نہ نکالنے کے لیے کہتی ہے اور جب شوہر نہیں مانتا تو ان دونوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے:۔

« مدا اتنی رات گئے اس اندھیرے سناٹے میں جائے گی کہاں، یہ تو سوچو »

« جائے جہاں اس کے سگے ہوں۔ ہمارے گھر میں اس کا کیا رکھا ہے۔ »

« ہاں۔ پر اتنی رات گئے گھر سے نکالنا ٹھیک نہیں۔ پانو بھاری ہے، کہیں ڈر ڈرا جائے تو اور آپھت ہو۔ ایسی دسا میں کچھ کرتے دھرتے بھی تو نہیں بنتا »

« ہمیں کیا کرنا ہے۔ مرے یا جیے۔ جہاں چاہے جائے۔ کیوں اپنے منھ میں کالکھ لگاؤں؟ میں تو گوبر کو بھی نکال باہر کروں گا۔ »

دھینا نے بہت متفکر ہوکر کہا « کالکھ جو لگنی تھی وہ تو لگ گئی۔ وہ تو اب جیتے جی نہیں چھوٹ سکتی۔ گوبر نے ناؤ ڈبودی »

« گوبر نے نہیں ڈبائی۔ ڈبائی اسی نے۔ وہ تو بچہ تھا۔ اس کے پنجے میں آ گیا »

کسی نے ڈبائی ہو، اب تو ڈوب ہی گئی »

اور اس تمام گفتگو کے بعد گھر میں داخل ہونے سے قبل خوشامد سے اپنے شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہتی ہے کہ:

«دیکھو تمھیں میری سوگند، اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ وہ تو آپ ہی رورہی ہے۔ بھاگ کی کھوٹی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا»

یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اتنی جلدی دھنیا میں یہ تبدیلی کیوں کر واقع ہوئی۔ واضح رہے کہ عام عورتوں کی طرح دھنیا بھی ایک عورت ہے اور وہ بڑی جذبات کی رو میں جلد فیصلہ کر ڈالتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دھنیا کو اس وقت جوانی کی روایتی لغزشوں کا خیال نہ آگیا ہوگا اور پھر ایک عورت ہونے کی حیثیت سے اس کی جھنیا سے ہمدردی قطعی فطری ہے جس کا کوئی سہارا اور ٹھکانا نہیں ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ وہ حاملہ ہے۔ دھنیا چوں کہ خود صاحب اولاد ہے اس لیے حمل کی تمام تکالیف کو جانتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ اس وقت جھنیا کو گھر سے نکالنا بڑا ظلم ہوگا۔ بہت ممکن ہے، بلکہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اپنے شوہر سے جھنیا کو گھر سے نہ نکالنے کی التجا کرتے وقت دھنیا کے دل میں یہ جذبہ کار فرما رہا ہوگا:

«مگر یہ خوف بھی تو تھا کہ تب اس کے لیے کنواں یا تالاب کے سوا اور ٹھکانا کہاں تھا؟ ایک نہیں بلکہ دو جانوں کی قیمت دے کر وہ اپنی مرجاد کو کیسے بچاتی؟ پھر جھنیا کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ دھنیا ہی کے کلیجے کا تو ٹکڑا ہے۔ ہنسی کے ڈر سے اس کی جان کیسے لے لیتی؟ اور پھر جھنیا کی بےکسی اور عاجزی بھی تو اسے متاثر کررہی تھی»

دھنیا نے پہلے جھنیا کو ملزم اور گوبر کو بری الذمہ ٹھیرایا تھا لیکن شوہر سے یہ التجا کرتے وقت کہ جھنیا کو گھر سے مت نکالنا وہ کہتی ہے کہ «گوبر نے ناؤ ڈبادی» یہاں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ پہلے جب دھنیا گفتگو کررہی تھی تو وہ ایک ماں کی حیثیت سے کررہی تھی اور ماما کے جوش میں اپنے بیٹے پر کوئی برائی نہیں آنے دینا چاہتی تھی لیکن یہاں وہ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے شوہر سے ہم کلام ہے اور قدرتی طور پر اسے ایک عورت ہی سے ہمدردی ہے کیوں کہ دیگر عورتوں کی طرح اس کا بھی یہی خیال ہے کہ اس قسم کے تمام واقعات میں مرد ہی قصوروار ہوتا ہے۔ اور جب اس کا شوہر کہتا ہے کہ «گوبر نے نہیں ڈبائی۔

ڈبائی اسی نے۔ وہ تو بچہ تھا، اس کے پنجے میں آ گیا» تو وہ کوئی بحث نہیں کرتی صرف اس قدر کہتی ہے کہ «کسی نے ڈبائی ہو۔ اب تو ڈوب ہی گئی۔» کیوں کہ وہ موقع کی نزاکت سے آگاہ ہے۔ اس وقت مکان بالکل قریب آ گیا ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ کوئی طویل بحث چھڑے جس کو سن کر جھنیا پر برا اثر پڑے اور یہ بھی خیال کرتی ہے کہ اگر اس وقت شوہر سے تکرار کی گئی تو بہت ممکن ہے کہ وہ چڑ کر اس کی بات نہ مانے اور جھنیا کو ضد سے گھر سے نکال دے۔ بحث کرنے کی بجائے وہ خاوند کی خوشامد کرنے کے لیے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے اور اسے اپنی قسم دلاتی ہے کہ وہ جھنیا کو گھر سے نہ نکالے۔

« ابھی زرا دیر پہلے دھنیا نے غصے کے جوش میں جھنیا کو ابھاگنی، کلنکن اور کل منہی، نجانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔ جھاڑو مار کر گھر سے نکالنے جارہی تھی» وہی دھنیا جھنیا کو روتے ہوئے یہ کہتے سے کہ «تم میری ماں ہو۔ میں اناتھ ہوں مجھے سرن دو۔ نہیں تو میرے کا کا اور بھائی مجھے کچا کھا جائیں گے۔» متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اسے تسلی دیتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ « تو چل گھر میں بیٹھ میں دیکھلوں گی کا کا اور بھیا کو، سنسار میں ان ہی کا راج نہیں ہے۔ بہت کریں گے اپنے گہنے لے لیں گے۔ پھینک دینا اتار کر» اور وہی دھنیا جو جھنیا کے متعلق کہتی ہے کہ « ابھاگنی نے میرے لڑکے کو چوپٹ کر دیا» اپنے لڑکے کے اس واقعے پر گھر سے بھاگ جانے پر کہتی ہے «منہ چور کہیں کا! جس کی بانہہ پکڑی اس کا نباہ کرنا چاہیے کہ منہ میں کالکھ پوت کر بھاگ جانا چاہیے؟ اب تو آوے تو گھر میں گھسنے نہ دوں»

جھنیا کے اصرار کرنے پر گوبر اسے اپنے ہمراہ تو لے آیا لیکن ماں کا غصہ جانتا تھا۔ خود گھر نہ آیا۔ اس کے گھر سے فرار ہوجانے پر دھنیا نے جھنیا کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ «اب آوے تو گھر میں نہ گھسنے دوں» لیکن کیا کوئی ماں اپنے بیٹے کو ایک عرصے بعد آنے پر جب کہ اس کی کوئی خبر تک نہ ملی ہو گھر سے نکال سکتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ دیکھیے کہ گوبر کے گھر آنے پر دھنیا اسے گھر میں گھسنے نہیں دیتی ہے یا اس کا رویہ ایک ماں کا سا ہوتا ہے۔

« دھنیا نے اسے اسیس دی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر گویا اپنے ماں ہونے کا صلہ پاگئی۔ اس کا دل غرور سے امڈا پڑتا تھا۔ آج تو وہ

رانی ہے! اس پھٹے حال میں بھی رانی ہے! کوئی اس کا منہ دیکھے، اس کی آنکھیں دیکھے، اس کا دل دیکھے، اس کی رفتار دیکھے! رانی بھی لجا جائے گی۔ گوبر کتنا بڑا ہوگیا ہے اور پہن اوڑھ کر کیسا بھلا آدمی سا لگتا ہے........آج اسے آنکھوں دیکھ کر گویا اس کی زندگی کی خاک میں گم شدہ جواہر مل گیا»

جب بیٹے نے باپ کو بستر پر پڑے ہوئے دیکھا تو ماں سے دریافت کیا کہ انھیں کیا تکلیف ہے۔ ماں بیٹے کو باپ کی بیماری کی خبر سنا کر اسے رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ بات ٹالنے کے لیے اس سے شکایتیں کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی شکایتوں سے بھی محبت جھلکتی ہے:

«کہاں تھے تم اتنے دن؟ بھلا اس طرح کوئی گھر سے بھاگتا ہے؟ اور کبھی ایک چٹھی تک نہ بھیجی۔ آج سال بھر کے پیچھے جاکے سدھ لی ہے۔ تمھاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔ یہی آسرا لگا رہتا تھا کہ کب وہ دن آوے گا اور کب تمھیں دیکھوں گی، کوئی کہتا تھا کہ مرچ بھاگ گیا اور کوئی ڈمرا ٹاپو بتاتا تھا۔ میری تو سن سن کر جان سوکھی جاتی تھی۔ کہاں رہے اتنے دن؟»

اور جب بیٹا بتاتا ہے کہ لکھنؤ تھا تو کہتی ہے «اور اتنے پاس رہ کر بھی چٹھی تک نہ لکھی؟»

وہی دھنیا جو گوبر کے گھر سے بھاگ جانے پر کہہ رہی تھی کہ «اب آوے تو گھر میں نہ گھسنے دوں» اس کے واپس آنے پر کس قدر باغ باغ ہوجاتی ہے اور اس کے آگے محبت آمیز شکایتوں کے دفتر کھول دیتی ہے۔ اتفاق سے جب گوبر گھر آتا ہے تو گھر میں کھانے کے لیے۔ کچھ نہیں ہے ناول نگار نے اس واقعے کے تذکرہ سے ایک ماں کے کردار کو بہت واضح کردیا ہے:

«لڑکیاں تو ساڑیوں میں مگن تھیں۔ دھنیا کو لڑکے کے لیے کھانے کی فکر ہوئی۔ گھر میں تھوڑا سا جو کا آٹا شام کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو چربن پر گزر ہوتا تھا، مگر گوبر اب وہ گوبر تھوڑی ہی ہے، اس سے جو کا آٹا کھایا بھی جائے گا؟ پردیس میں نہ جانے کیا کیا کھاتا رہا

ہوگا۔ جاکر دلاری کی دکان سے گیہوں کا آٹا، چاول اور گھی ادھار لائی......"

دلاری وہ عورت ہے جس سے دھنیا انتہائی ناراض ہے کیوں کہ وہ کسی زمانے میں اس کے شوہر کی منظور نظر رہ چکی ہے اور اب بھی جب کبھی اس کا شوہر دلاری کے ہاں چلا جاتا ہے تو دھنیا رقیبانہ رشک و حسد اور نسوانی بد اعتمادی سے مجبور ہوکر اس سے لڑ پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ جب ہوری دلاری کے ہاں انتہائی مجبوری کی حالت میں لڑکی کی شادی کے لیے روپیہ ادھار لینے جاتا ہے اور دھنیا کو اس کا علم ہوتا ہے اس وقت کی دونوں میاں بیوی کی گفتگو سنیے۔

"مگر جب اس نے سنا کہ دلاری سے بات چیت ہوئی ہے تو ناک سکیڑ کر بولی "اس سے روپے لے کر آج تک کوئی خوش ہوا ہے؟ چڑیل کتنا کس کر سود لیتی ہے"

لیکن کرتا کیا؟ دوسرا دیتا کون ہے؟"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسی بہانے دوگال ہنسنے بولنے گیا تھا؟ بوڑھے ہوگئے پر وہ بان نہ گئی؛"

"تو تو دھنیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ میرے جیسے پھٹے حالوں سے وہ ہنسے بولے گی؟ سیدھے منہ بات تو کرتی نہیں:"

"تم جیسوں کو چھوڑ کر اس کے پاس اور جائے ہی کا کون؟"

کیا اس مکالمے سے ایک عورت کی فطرت اچھی طرح بےنقاب نہیں ہوتی۔ کون عورت ہے جو اپنے شوہر کو کسی اجنبی عورت سے بات چیت کرتے دیکھ کر ہی شوہر سے ناراض نہ ہوجائے کی چہ جائے کہ یہ معلوم کرکے کہ اس کا شوہر اس عورت کے ہاں اب بھی جاتا ہے جس سے اس کے ایک زمانے میں تعلقات رہ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک خاتون، جو فطرتاً اس سلسلے میں بہت بد اعتماد واقع ہوئی تھیں ان کے شوہر بسلسلۂ ملازمت بمبئی میں مقیم تھے۔ بمبئی کے مکانات کی نامعقولیت اور پھر بیوی کی انتہائی قسم کی پردہ نشینی کی بنا پر انھوں نے بیگم صاحبہ کو کافی عرصے نہ تو اپنے پاس ہی بلایا اور ملازمت کی متعدد مجبوریوں اور پابندیوں کی بنا پر نہ خود ہی گھر جاسکے۔ یہ صورت بیگم صاحبہ کے دل میں یہ خیال پیدا کردینے کے لیے کافی تھی کہ شوہر کی

دلچسپیوں کا مرکز اب وہ خود نہیں بلکہ بمبئی کی کوئی صاحبہ ہیں۔ اس خیال سے کافی عرصے تک پریشان رہنے کے بعد بالآخر انھوں ازخود ہی بمبئی آنے کا فیصلہ کیا اور ایک صاحب کے ہمراہ یہاں آگئیں۔ سوے اتفاق کہ یہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی اور وہ بیمار پڑ گئیں۔ شوہر انہیں دکھانے کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کو گھر پر لائے۔ اسے شوہر کی بد قسمتی سمجھیے کہ ڈاکٹر صاحبہ خوب صورت بھی تھیں اور خوب صورت بننا بھی جانتی تھیں۔ جب وہ بیگم صاحبہ کو دیکھ کر واپس جانے لگیں تو شوہر انھیں پہنچانے ساتھ گئے۔ زینے میں کھڑے ہوکر انھوں نے مریضہ کے متعلق ڈاکٹر صاحبہ سے دریافت کیا۔ ادھر بیگم صاحبہ کی شکّی طبیعت نے سراغ رسانی پر مجبور کیا۔ انھوں نے دیکھا تو زینے میں کھڑے ہوکر "راز و نیاز" کی باتیں ہورہی تھیں۔ اس کے بعد جو نتیجہ ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم دھینا کی طرف پھر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی کہ دھینا دلاری کو اپنا رقیب سمجھتی ہے لیکن بیٹے کے ایک عرصے بعد واپس گھر آنے پر جب اس کے یہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے تو وہ نفرت اور بیزاری کو خیرباد کہہ کر اسی دلاری کے ہاں جاتی ہے تاکہ اپنے لڑکے کے لیے کچھ کھانے کا انتظام کرے۔

جیسا کہ ابتدا میں لکھا جاچکا ہے ناول نگار کو اشخاص قصہ کے کردار کو ہر موقع کی مناسبت سے تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں اس قسم کی تبدیلی یا اضافہ کردار نگاری کا عیب ہے کیوں کہ افراد قصہ ناول نگار کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی قاری کی نظروں میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی اور وہ قطعاً غیر فطری ہوجاتے ہیں لیکن جس طرح ہر موقع کی مناسبت سے اشخاص قصہ کی فطرت میں تبدیلی یا کسی نئی صفت کا اضافہ کردار نگاری کی خامی ہے اسی طرح شخص قصہ کی فطرت کو موقع کی مناسبت سے نہ بدلنا ایک عیب ہے۔ ظاہر ہے کہ افراد قصہ اپنے کردار کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ناول نگار کے ذہن میں نہیں آجاتے بلکہ ان کی خصوصیات واقعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جس طرح مختلف واقعات ایک انسان پر مختلف اوقات میں مختلف اثرات چھوڑتے ہیں اسی طرح اشخاص قصہ پر بھی مختلف اثرات ہوتے ہیں اور ان اثرات کے تحت ان کے حرکات اور افعال میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ یہ کردار کا ارتقا کہلاتا ہے اور ناقدان فن کا خیال ہے کہ کسی کردار میں ارتقا کا فقدان کردار نگاری کا زبردست

عیب ہے جس کو ناول کے دیگر اعلیٰ سے اعلیٰ محاسن بھی نہیں دھوسکتے اور جس کردار میں ارتقا مفقود ہو اسے ناول سے جلد از جلد خارج کردینا چاہیے دھنیا کے کردار میں یہ تبدیلی دراصل اس کے کردار کا ارتقاء ہے اسے بیجا تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔

ہندستان میں لڑکی کا پیٹنا بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چاہے چھوٹی لڑکی کو پیٹ لیں لیکن جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھانا تو گناہ کے مترادف ہے۔ لکھنؤ سے واپسی کے بعد ایک دن گوبر نے اپنی جوان بہن سونا کو مارا تو دھنیا کو بھی گوبر کی یہ حرکت بری لگی تھی۔ روپا کو مارتا تو برا نہ مانتی، مگر جوان لڑکی کو مارنا، یہ اس کی برداشت کے باہر تھا، اور وہ کیوں برا نہ مانتی؟ کیا وہ ہندستانی عورت نہیں ہے؟ اب مارنے والا چاہے خود گوبر ہی کیوں نہ ہو جو بہت دن بعد گھر واپس آیا ہے اور جس کے آنے پر وہ اس قدر خوش تھی کہ دلاری کے ہاں سے ادھار آٹا لینے بھی چلی گئی تھی۔

ہندستانی عورت کی اپنے خاوند سے وفاداری ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ ہندستانی عورت سے میرا مطلب اس بےزبان ناطق مخلوق خداوندی سے ہے، جو ہمارے ظالم اور بے رحم قوانین کی پیداوار ہے جن کے بنانے میں خود اس غریب کا کوئی حصہ نہیں: اور جنھیں، اول اول خود غرض مردوں نے، اور بعد میں ان مردوں کا آلۂ کار بن کر سادہ لوح عورتوں نے، ہزارہا سال سے اس قسم کی تعلیم دی ہے کہ ان کی خود اعتمادی فنا ہوکر رہ گئی ہے اور بدقسمتی سے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ عورتوں میں اس خود اعتمادی کا فنا ہوجانا ہی اسے اپنے شوہر سے اس «وفاداری» کے لیے مجبور کرتا ہے جس کے لیے وہ مشہور ہے ورنہ ظاہر ہے کہ قدرت نے خاص طور پر ہندستان کے لیے ایسی عورت پیدا نہیں کی ہے جس پر «ہندستانی عورت» ہونے کا اطلاق ہوسکے۔ میں جہاں کہیں بھی «ہندستانی عورت» کا لفظ استعمال کروں گا اس سے میرا مقصد دراصل خود غرض مردوں کے بنائے ہوئے بے رحم قوانین میں اس بری طرح جکڑی ہوئی مخلوق سے ہوگا، جو غلامی کا احساس اور اس حالت کی تذلیل کو محسوس کرنے کے باوجود اس کے خلاف آواز نکالنے تک کی جرأت اپنے میں مفقود پاتی ہیں اور مزید یہ کہ خود اپنی اولاد کو وہی تعلیم دیتی ہیں جس کی بدولت ان میں جرأت مفقود ہے۔

ہاں تو دھنیا بھی دیگر ہندستانی عورتوں کی طرح شوہر پرست اور اس کی ہمدرد و غم‌خوار ہے۔ اس کے لیے ہم ایک جگہ سے میاں بیوی کی گفتگو نقل کرتے ہیں۔ شوہر کہتا ہے:—

«تو کیا تو سمجھتی ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا؟ ابھی تو چالیس برس بھی پورے نہیں ہوئے۔ مرد ساٹھے پر پاٹھا ہوتا ہے»

«جا کر شیشے میں منہ دیکھو۔ تم جیسا مرد ساٹھے پر پاٹھا نہیں ہوتا۔ دودھ گھی آنکھیں آنجنے تک تو ملتا نہیں، پاٹھے ہوں گے! تمھاری دسا دیکھ دیکھ کر تو میں اور سوکھی جاتی ہوں کہ بھگوان یہ بڑھاپا کیسے کٹے گا۔ کس کے دوارے بھیک مانگیں گے؟»

«ساٹھے تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے پائے گی دھنیا! اس کے پہلے ہی چل دیں گے»

دھنیا نے آزردگی سے کہا «اچھا رہنے دو، منہ سے اسبھ نہ نکالو۔ تم سے کوئی اچھی بات بھی کہے تو کوسنے لگتے ہو»

وہ اپنے شوہر کے آرام کا بھی خیال رکھتی ہے۔ حالاں کہ غریب ہیں اور وہ جانتی ہے کہ بغیر زیادہ محنت کیے گزارا ہونا مشکل ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے شوہر کو کچھ آرام لینے کے لیے کہتی ہی رہتی ہے۔ جب اس کا شوہر زمین‌دار کے ہاں سے واپس آتے وقت کھیت پر ہوکر آتا ہے تو دھنیا اس سے کہتی ہے «تم بھی وہاں سے کمائی کر کے لوٹے تو کھیت پہنچے۔ کھیت کہیں بھاگا جاتا تھا»

گو وہ جانتی ہے کہ کھیت میں بغیر محنت کیے چارہ نہیں لیکن اپنے شوہر کے آرام کے خیال نے اس سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں۔ ایک اور موقع پر اسی چیز کو مصنف نے اس طرح دکھایا ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب اس کا شوہر انتہائی کمزور ہونے کے باوجود دن بھر مزدوری کرتا ہے:—

«رات کے بارہ بج گئے تھے۔ دونوں بیٹھے سنئی کات رہے تھے۔ دھنیا نے کہا «تمھیں نیند لگی ہو تو جا کر سو رہو، تڑکے سے پھر کام کرنا ہے»

ہوری نے آسمان کی طرف دیکھا «چلا جاؤں گا۔ ابھی تو دس بجے ہوں گے، تو جا سو رہ!»

« میں تو دوپہر کو تھوڑی دیر سو لیتی ہوں »
« میں بھی چبینا کرکے پیڑ کے نیچے سو لیتا ہوں »
« بڑی لو لگتی ہوگی ؟ »
« لو کیا لگے گی۔ اچھی چھاؤں ہے »
« میں ڈرتی ہوں کہ کہیں تم بیمار نہ ہوجاؤ »

دھینا حقیقی معنوں میں ہندستانی بیوی ہے لیکن جب اس کا شوہر اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتا ہے یا کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ اسے طعنے بھی دیتی ہے۔ اس کے دیور جن کی بچپن میں اس نے پرورش کی تھی اور بعد میں شادی بھی کردی تھی، اس سے لڑکر علیحدہ ہوگئے ہیں۔ ایک موقع پر اس کا دیور اپنی بیوی کو مارتا ہے تو ہوری اس کو بچانے کے لیے جاتا ہے اس موقع پر دونوں میں کیا گفتگو ہوتی ہے۔ سنیے :-

« دھینا نے دروازے پر آکر ہانک لگائی « تم وہاں کھڑے کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو ؟ کوئی تمھاری سنتا بھی ہے کہ یوں ہی سچھا دے رہے ہو ؟ اس دن اسی بہو نے گھونگھٹ کی آڑ سے ڈاڑھی جارکھی تھی، بھول گئے ؟ بہریا ہوکر پرائے مردوں سے لڑے گی تو ڈانٹی نہ جائے گی ؟ »

ہوری دروازے پر آکر نٹ کھٹ پن کے ساتھ بولا « اور جو میں اسی طرح تجھے ماروں تو ؟ »

کیا کبھی مارا نہیں جو مارنے کی سادھ بنی ہوئی ہے ؟ »

« اتنی بےدردی سے مارتا تو تو گھر چھوڑکر بھاگ جاتی۔ پینا بڑی کم کھور (غم خور یعنی ضابط) ہے »

« اوہو، ایسے ہی بڑے درد والے ہو تم ! ابھی تک مار کا داگ بنا ہوا ہے۔ ہیرا مارتا ہے تو دلارتا بھی ہے۔ تم نے تو مارنا ہی سیکھا ہے، دلارنا سیکھا ہی نہیں۔ میں ہی ایسی ہوں کہ تمھارے ساتھ نباہ ہوا »

« اچھا رہنے دے، بہت اپنا بکھان نہ کر ! تو ہی تو روٹھ روٹھ کر میکے بھاگتی تھی۔ جب مہینوں منوتی کرتا تھا تب کہیں جاکر آتی تھی »

دوسری جگہ جب بانس والے نے ہوری کو صرف پندرہ روپے دیے ہیں تو دھینا شوہر کے یہ کہنے پر کہ چھوٹے بھائی نے اتنے پر ہی بانس دیدیے، شوہر کو اس طرح طعنے دیتی ہے :-

"کیوں نہ ہو، بھائی نے پندرہ روپے کہہ دیے تو تم کیسے ٹوکتے؟ اورے رام رام! لاڈلے بھائی کا دل چھوٹا ہوجاتا کہ نہیں پھر جب اتنا بڑا انرتھ ہو رہا تھا کہ لاڈلی بہو کے گلے پر چھری چل رہی تھی تو تم بھلا کیسے بولتے؟"

ان دو اقتباسات کے پیش کرنے کا دراصل مقصد یہ ہے کہ ان میں شوہر کو طعنے دینے کے علاوہ دیور اور دیورانی کے متعلق بھی دھینا کے جذبات کا پتا چلتا ہے۔ ہندستان میں مشترکہ خاندان کی ایک برکت آئے دن کے جھگڑے اور مناقشات بھی ہیں۔ زیادہ‌تر یہ جھگڑے دیورانیوں اور جٹھانیوں میں ہوتے ہیں۔ دھینا بھی ان ہی جٹھانیوں میں سے ایک ہے۔ البتہ دیور سے وہ اس وجہ سے ناراض ہے کہ اس نے بچپن میں اس کی پرورش کی تھی اور اب وہ اسے برائی دے کر علیحدہ ہوگیا تھا۔

انھی دیوروں کے لیے وہ ایک اور جگہ کہتی ہے :-

"دھنیا نے ناک سکیڑ کر "کہا میں نے تم سے سو بار لاکھ بار کہہ دیا کہ میرے منہ پر اپنے بھائیوں کا بکھان نہ کیا کرو۔ ان کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ سارے گانو نے سنا، کیا انھوں نے نہ سنا ہوگا؟ کچھ اتنی دور بھی تو نہیں رہتے۔ سارا گانو دیکھنے آیا ان ہی کے پانو میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ مگر آویں کیسے؟ جلن ہو رہی ہوگی کہ اس کے گھر گائے آگئی، چھاتی پھٹی جاتی ہوگی"

وہ صرف طعنے ہی نہیں دیتی بلکہ جب اس کا شوہر اسے مارتا ہے تو وہ اسے گالیاں اور کوسنے بھی دیتی ہے۔ اور حالاں کہ وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی، لیکن آخر انسان ہے۔ مار کھانے کے بعد وہ اس طرح شکایتیں کرتی ہے :-

"پھر وہ فریاد کرکے رونے لگی۔ اس گھر میں آکر اس نے کیا کیا دکھ درد نہیں جھیلا، کس کس طرح اپنا پیٹ تن کاٹا، کس طرح ایک ایک لتے کو ترسی، کس طرح ایک ایک پیسہ جان کی طرح بچاکر رکھا، کس طرح گھر بھر کو کھلاکر آپ پانی پی‌کر سورہی اور آج ان سارے بلدانوں

کا یہ بدلہ۔ بھگوان بیٹھے یہ انیائے دیکھ رہے ہیں اور اسے بچانے نہیں دوڑتے!»

یہ سب کچھ سہی کہ وہ شوہر کو طعنے دیتی ہے، گالیاں اور کوسنے دیتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کے علاوہ اس کے شوہر کو کوئی اور بھی کچھ کہے۔ گوبر جب لکھنؤ سے گھر واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ برادری نے میرے باپ کا حقہ پانی بند کردیا تھا جس کی سزا میں اس نے برادری کو تاوان ادا کیا۔ وہ اس پر ناراض ہوتا ہے لیکن دھنیا اپنے شوہر کی توہین برداشت نہیں کرسکتی اور شوہر کی طرف سے جواب دیتی ہے:—

«بیٹا تم بھی تو اندھیر کرتے ہو۔ حکا پانی بند ہوجاتا تو گانو میں نباہ ہوتا؟ جوان لڑکی بیٹھی ہے، اس کا بھی کہیں ٹھکانا لگانا ہے کہ نہیں؟ مرنے جینے میں آدمی برادری.........»

حالاں کہ اسی تاوان ادا کرنے پر خود شوہر کو اس طرح جلی کٹی سناچکی ہے:—

«نہ حکا کھلتا تو ہمارا کیا بگڑا جاتا تھا؟ چار پانچ مہینے نہیں کسی کا حکا پیا تو کیا چھوٹے ہوگئے؟ میں کہتی ہوں کہ تم اتنے بھوندو کیوں ہو؟ میرے سامنے تو بڑے گیان والے بنتے ہو۔ پر باہر تمھارا منہ کیوں بند ہوجاتا ہے؟ لے دے کے باپ دادوں کی سانی ایک گھر بچ رہا تھا، سو آج تم نے اس کا بھی وارا نیارا کر دیا۔ اسی طرح کل یہ تین چار بیگھے دھرتی ہے، اسے بھی لکھ دینا اور تب گلی گلی بھیک مانگنا۔ میں پوچھتی ہوں کہ تمھارے منہ میں جیبھ نہ تھی کہ ان پنچوں سے پوچھتے کہ تم کہاں کے بڑے دھرماتما ہو جو دوسروں پر ڈانڑ باندھ لگاتے پھرتے ہو؟ تمھارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے»

دھنیا نے اسی تاوان دینے پر خود تو شوہر سے یہ کہا لیکن یہ برداشت نہ کرسکی کہ اس کے شوہر کو کوئی اور بھی کچھ کہے۔ اب چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں میں بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں جو خود میرے ساتھ پیش آیا: ایک بیوی اپنے شوہر کے رویے سے نالاں تھیں اور چوں کہ صحیح معنوں میں «ہندستانی عورت» تھیں اس لیے اس کی تلافی اس طور پر کرتی تھیں کہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں مجھ سے اپنے سرتاج کی زیادتیوں کی

شکایت کرتی تھیں۔ میں ان کی دل‌جوئی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملادیا کرتا تھا۔ یہاں تک تو خیر کچھ مضائقہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے ان کو کچھ کبیدہ خاطر دیکھا اور یہ خیال کرکے کہ آج دونوں میں پھر تازہ بدمزگی ہوئی ہے، کیوں کہ ان کی زندگی میں یہ آئے دن کا واقعہ تھا، ان کے شوہر کی عادت اور مزاج پر تبصرہ کرنا شروع کردیا۔ حالاں کہ اکثر وہ اس فعل کی سزاوار ہو چکی تھیں لیکن میری زبان سے وہ اس قسم کے تذکرے کو برداشت نہ کرسکیں اور انھوں نے فوراً ہی یہ جواب دیا، جو مجھے آج تک یاد ہے کہ "تو میرے سامنے میرے میاں کی برائی مت کیا کر!" یہاں یہ بتادینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ان بیوی سے زیادہ ان کے شوہر میرے عزیز تھے۔

وہی دھینا جو شوہر کو طعنے اور کوسنے دیتی ہے، دل سے اس کا برا نہیں چاہتی۔ اور کون "ہندستانی عورت" ہے جو اپنے خاوند کو تکلیف و مصیبت میں دیکھنا چاہتی ہے یا اس کی موت کی خواہاں ہے۔ ہوری نے جب سے دھنیا کو مارا تھا اس وقت سے دونوں میں کشیدگی چلی آتی تھی اور آپس میں بول چال تک بند تھی، لیکن اسی دوران میں جب وہ بیمار ہوتا ہے، اس وقت دھینا کے جذبات جو شوہر پرستی کی بہترین مثال ہیں ملاحظہ ہوں۔ اسی شوہر میں جسے وہ اکثر برا کہتی رہتی ہے اب کیسی خوبیاں آگئی ہیں:—

> "شوہر جب مرزھا ہے تو اس سے کیا بیر؟ ایسی حالت میں تو بیریوں سے بھی بیر نہیں رہتا، پھر وہ تو اپنا ہی مرد ہے۔ لاکھ برا ہو مگر اس کے ساتھ زندگی کے پچیس سال کٹے ہیں۔ آرام ملا ہے تو اسی کے ساتھ اور تکلیف جھیلی ہے تو اسی کے ساتھ۔ اب چاہے وہ اچھا ہے یا برا، اپنا ہے۔ داری جار نے مجھے سب کے سامنے مارا۔ سارے گانو کے سامنے میرا پانی اتار لیا لیکن تب سے کتنا لجاتا ہے کہ سیدھے تاکتا بھی نہیں۔ کھانے آتا ہے تو سر جھکائے، کھا کر اٹھ جاتا ہے۔ ڈرتا رہتا ہے کہ میں کچھ کہہ نہ بیٹھوں"

جس زمانے میں ان کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تھی تو گھر کے سب آدمی مزدوری کرنے لگے تھے۔ ظالم مہاجن کے ہر وقت سر پر کھڑے رہ کر جلدی

کام کرنے کا تقاضا کرتے۔ بعض مرتبہ مسلسل انتہائی محنت کرنے کی وجہ سے هوری بےهوش هوجاتا هے۔ اس کے بےهوش هونے پر دهینا کی حالت دیکھیے :-

« دهینا ایکھ کا گٹھا پٹک کر پاگلوں کی طرح دوڑی هوئی هوری کے پاس گئی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے رونے چلانے لگی « تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے هو ؟ اری سونا دوڑ کر پانی لا اور جاکر سوبھا سے کہہ دے کہ دادا بےحال هیں۔ هائے رام ! اب میں کہاں جاؤں۔ اب کس کی هوکر رهوں ؟ کون مجھے دهینا کہہ کر پکارے گا......... »

اور جب ایک لالہ جی اسے سمجھاتے هیں تو وہ کہتی هے کہ « کیا کروں لالہ ، جی نہیں مانتا۔ بھگوان نے سب کچھ هرلیا۔ میں صبر کرگئی اب دهیرج نہیں هوتا هائے میرا هیرا ! »

یہاں یہ بتادینا شاید غیرضروری نہ هوگا کہ جب شوهر بےهوش هوگیا هے تو دهینا انتہائی بےکسی کی حالت میں هے۔ صرف دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں هیں۔ گھر میں وهی بڑی هے۔ انتہائی بےکسی کی حالت میں هم معمولی سا سہارا بھی دیکھا کرتے هیں۔ یہاں دهینا کو سوبھا اور هیرا کا یاد کرنا ، جو اس کے دیور هیں ، اور جن کا « نام سن کر هی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی هے » حقیقت سے کس قدر قریب هے۔

کسی کردار کی خوبی یہ هے کہ اس کے واقعات همارے ذهن میں ایسے تاثرات چھوڑ جائیں جو روزمرہ کی زندگی میں ایسی هی کسی حالت کو دیکھ کر پھر تازہ هوجائیں۔ اسی سے قصے کے کردار هماری دنیا کے گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان معلوم هونے لگتے هیں ، گویا هم ان میں زندگی کے اثرات دیکھ لیتے هیں۔ یہی کردار کی زندگی اور خوبی هے۔ مندرجۂ بالا واقعات کیا ایسے نہیں هیں جو هماری نظروں کے سامنے آئے دن هوتے رهتے هیں اور کیا همارے دل میں ان حالات کو دیکھ کر بالکل ایسے هی تاثرات پیدا نہیں هوتے جو دهینا کا کردار همارے ذهن میں محفوظ کردیتا هے۔

اس کی شوهر پرستی کی بہترین مثال اس جگہ ملتی هے جب اس کا شوهر بستر مرگ پر پڑا هوا هے اور دهینا یہ جانتے هوئے بھی کہ یہ اس کا آخری وقت هے اپنے دل کو دهوکا دینا چاهتی هے :-

«مگر سب کچھ سمجھ کر بھی دھنیا امید کے مٹتے ہوئے عکس کو پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر مشین کی طرح دوڑ دوڑ کر کبھی آم بھون کے پنّا بناتی اور کبھی ہوری کے بدن پر گیہوں کے چوکر کی مالش کرتی۔ کیا کرے پیسے نہیں ہیں ورنہ کسی کو بھیج کر ڈاکٹر بلاتی۔»

اور جب لوگ اس سے کہتے ہیں کہ اب ہوری میں کچھ نہیں رکھا ہے، یہ اس کا آخری وقت ہے، گئو‌دان کرنا چاہیے تو وہ برا مانتی ہے۔ لیکن حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔ وہ گھر میں سے آخری پیسہ تک نکال کر برہمن کو دے دیتی ہے اور اس کا خیال نہیں کرتی کہ ان پیسوں کو دینے کے بعد گھر میں کھانے کو بھی نہیں ہے، کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ شوہر کی عاقبت اس وقت دان نہ کرنے کی وجہ سے خراب ہوجائے اور دھنیا جیسی شوہرپرست بیوی اس چیز کو کیوں کر برداشت کرسکتی ہے۔ پیسے دے کر برہمن سے یہ کہتے ہوئے کہ «مہراج! گھر میں نہ گائے ہے، نہ بچھیا، نہ پیسہ، یہی پیسے ہیں۔ یہی ان کا گئو دان ہے» وہ غش کھا کر گر پڑتی ہے۔

مصنف نے یہاں پر کردار نگاری کا کمال دیکھایا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے شوہر کی تیمارداری کرتے ہوئے ایک وفادار بیوی کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس وقت دھنیا کی حرکات، اس کا رونا، اور بےہوش ہوجانا، یہ سب اس کے کردار پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ ایسے موقع پر شخص قصہ کی قلبی کیفیات مثلاً ہنسنا، رونا، شرمندہ ہونا، یا بےہوش ہوجانا ہی نہایت موثر، مطابق فطرت اور واضح کردار پیش کرتے ہیں۔

اب ہم دھنیا کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت کی طرف آپ کو متوجّہ کریں گے۔ اس کے کردار کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو اس میں حیات انسانی کے عام اور وسیع اصولوں کے مطابق ہونے کے باوجود بھی ایسی انفرادیت اور امتیاز پیدا کردیتی ہے کہ وہ دیگر افراد سے نمایاں معلوم ہوتی ہے اور ایک عام انسان ہونے کے بلوجود وہ ہماری نظروں میں معیّن و مشخّص ہوجاتی ہے۔ افسانوی ادب میں صرف وہی شخص‌قصہ اہمیت اور نمایاں جگہ حاصل کرسکتا ہے جس کے کردار میں ایسی خصوصیت ہے جس کے سینکڑوں ہزاروں مماثل کرداروں میں بھی اسے بہ‌خوبی پہچانا جاسکے۔

بعض افراد قصہ ایسے ہوتے ہیں جن کی اہمیت ناول کے ابتدا ہی سے معلوم ہوجاتی ہے۔ دھینا کا کردار بالکل اسی قسم کا ہے۔ مصنف جب دھینا کا تعارف ہم سے کراتا ہے (اس کا اقتباس شروع ہی میں دے دیا گیا ہے) تو اس سے متعلق ہمیں کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ باتیں کیا ہیں؟ کہ وہ خوشامد کرنا نہیں جانتی۔ یہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کے خوشامد کرنے سے بھی اس کا دل بھڑکتا ہے۔ گو اس پر غربت کی وجہ سے انتہائی مصیبتیں پڑچکی ہیں لیکن وہ پھر بھی ہار نہیں مانتی « دائمی خستہ حالی نے اس کی خودداری کو بیدلی میں تبدیل کردیا ہے» وہ ہٹ دھرم اور ضدی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مزاج میں استقلال ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا آدمی تمام عمر خود تکالیف اٹھاتا ہے اور اگر اسے چھیڑا نہ جائے تو دوسروں کے لیے قطعی بےضرر ہے لیکن اگر لوگ اس کے آڑے آتے ہیں اور اس کے معاملات میں دخل‌انداز ہوکر اس کی پریشانی کا موجب بنتے ہیں تو وہ انتہائی خطرناک ہے۔ ایسا شخص جب غصے ہوتا ہے تو پھر کسی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ دھینا کے غصے کے بارے میں منشی‌جی لکھتے ہیں کہ :-

« دھینا کے غصے سے وہ خوب واقف تھا۔ بگڑتی ہے تو چنڈی بن جاتی ہے۔ مارو، کاٹو سنےگی نہیں۔»

اب اگر آپ اس کے غصے کو دیکھنا چاہتے ہیں تو گئودان کا اس جگہ سے مطالعہ کیجیے، جب ہوری سے یہ سن‌کر کہ ہیرا سوبھا سے یہ کہ رہا تھا کہ ہمارے حصے کا رپیہ مارکر گائے منگائی ہے وہ ہیرا سے لڑنے کے لیے جاتی ہے اور وہاں انتہائی غم و غصے کا اظہار کرتی ہے کیوں‌کہ اس نے خود تکالیف برداشت کرکے انھیں پرورش کیا تھا جس کا صلہ اس کو یہ دیا جارہا ہے۔

انسان کا کردار اس کی فطرت، معاشرت، خیالات اور رجحانات سے تکمیل پاتا ہے اور اس کا انحصار بڑی حد تک ماحول پر ہے۔ اسی طرح افسانوی ادب کے کردار کا خالق افسانہ‌نگار کا تخیل ہی ہوتا ہے اور وہ شخص قصہ کے کردار کو نشوونما دینے اور اس کے تکمیل کرنے والے اسباب کی تخلیق کرتا ہے اور ان اسباب کا اثر اس کے کردار پر ڈال‌کر ایک مکمل کردار پیش کرتا ہے۔

دھینا کو ضد اور غصے کی انتہائی حالت میں اس جگہ دیکھیے جب اسے اپنے شوہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی گائے کو ہیرا نے زہر دےکر مارڈالا ہے۔ یہ

خبر سن کر وہ ہیرا سے انتقام لینے کے لیے اس کی اطلاع پولیس کو کرنا چاہتی ہے۔ اس کا شوہر نہیں چاہتا کہ کسی طرح بھی اس کے بھائی پر آنچ آئے۔ اس وقت کی شوہر اور بیوی کی گفتگو اس کے مزاج میں استقلال کی بہترین مظہر ہے:

« اچھا جا، سورہ! مگر کسی سے بھول کر بھی چرچا نہ چلانا۔ »

«کون لڑکا ہوتے ہی لالا کو تھانے نہ پہنچاؤں، تو اپنے اصل باپ کی نہیں! یہ ہتیارا بھائی کہنے لایک ہے۔ یہی بھائی کا کام ہے وہ بیری ہے پکا بیری! اور بیری کو مارنے میں پاپ نہیں، چھوڑنے میں پاپ ہے»

ہوری نے دھمکایا «میں کہے دیتا ہوں دھنیا! انرتھ ہوجائےگا»

دھنیا جوش میں بولی «انرتھ نہیں انرتھ کا باپ ہوجائے، میں بنا لالا کو بڑے گھر بھجوائے ماوں کی نہیں۔ تین سال چکی پسواؤں گی، تین سال۔ وہاں سے چھوٹیں گے تو ہتیا لگےگی۔ تیرتھ کرنا پڑےگا۔ بھوج دینا پڑےگا۔ اس دھوکے میں نہ رہیں لالا! اور گواہی دلاؤں گی تم سے، لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھا کر»

ہوری جب دیکھتا ہے کہ دھنیا ماننے والی نہیں تو وہ اسے مارتا ہے۔ لیکن دھنیا کے مزاج میں استقلال ہے۔ اس نے جب سوچ لیا ہے کہ انتقام لےگی تو معمولی سی مارپیٹ اس کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب چوکی‌دار کے خبر کرنے پر تھانے‌دار گاؤں میں آکر ہوری سے دریافت کرتا ہے کہ تیرا کس پر شبہ ہے تو وہ کسی کا نام نہیں لیتا۔ دھنیا جو وہیں کھڑی تھی اس موقعے سے فائدہ اٹھاکر فوراً بول اٹھتی ہے:—

«گائے ماری ہے تمھارے بھائی ہیرا نے۔ سرکار ایسے مورکھ نہیں ہیں کہ جو کچھ تم کہ دوگے، مان لیں گے، یہاں جانچ کرنے آئے ہیں۔»

دھنیا کا مقصد پورا ہوگیا۔ وہ پولیس کو اطلاع کرنا چاہتی تھی کہ گائے کو ہیرا نے زہر دیا ہے۔ لیکن تھانے‌دار کا مقصد معاملے کی تفتیش سے زیادہ روپیہ اینٹھنا تھا۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ لوگ خانہ‌تلاشی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں دھمکی دیتا ہے کہ میں ہیرا کے گھر کی تلاشی لوں‌گا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوتا ہے۔ عزت اور نام پر مرنے والا ہوری قرض لےکر روپیہ دینے کا انتظام کرتا ہے۔ جس وقت وہ

رپیہ دینے کے لیے جا رہا تھا دھینا نے اس کپڑے کو جھٹکا دے کر ، جس میں وہ رپے بندھے تھے ، سب رپے زمین پر گرادیے اور اپنے شوہر کو یہ پھٹکار سنائی :

" یہ رپیہ کہاں لیے جا رہا ہے ؟ بتا ! بھلا چاہتا ہے تو سب رپے لوٹا دے نہیں کہے دیتی ہوں ! گھر کے آدمی رات دن مریں ، دانے دانے کو ترسیں ، چیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپے لے کر چلا ہے اجت بچانے ! ایسی بڑی ہے تیری اجت جس کے گھر میں چوہے لوٹیں وہ بھی اجت والا ہے ! دروگاہ تلاسی ہی تو لے گا ، لے لے جہاں چاہے تلاسی ۔ ایک تو سو رپے کی گائے گئی ، اس پر پلیتون ! واہ رے تیری اجت "

دھینا اس وقت انتہائی غصے کی حالت میں ہے ۔ وہ صرف شوہر ہی کو یہ کڑی باتیں سنا کر خاموش نہیں ہوجاتی بلکہ رشوت دینے کے لیے رپیہ قرض دینے والوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیتی ہے ۔

" ہم باکی چکانے کو پچیس رپے مانگتے تھے تو کسی نے نہ دیا ۔ آج انجلی بھر رپے ٹھناٹھن نکال کر دے دیے ۔ میں سب جانتی ہوں یہاں تو سب حصہ بانٹ ہونے والا تھا ۔ سبھی کے منہ میٹھے ہوتے ۔ یہ ہتیارے گانو کے مکھیا ہیں ۔ گریبوں کا کھون والے پینے ، سود بیاج ، ڈیڑھی سوائی ، نجر بھینٹ ، گھوس رسوت ، جیسے ہو گریبوں کو لوٹو ۔ اس پر سوراج چاہیے ۔ جیل جانے سے سوراج نہ ملے گا ۔ سوراج ملے گا دھرم سے ، نیاؤ سے " ۔

تھانے دار نے جب دیکھا کہ اس عورت نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اور منہ کا نوالہ ہاتھ سے چھین لیا تو دھینا کو دھمکانے کے لیے بولے معلوم ہوتا ہے کہ اسی عورت نے ہیرا کو پھنسانے کے لیے گائے کو زہر دیا ہے ۔ تھانے دار کا خیال تھا کہ دھینا پر ان کی دھمکی کارگر ہوگی اور وہ خاموشی اختیار کرلے گی لیکن یہاں تو " سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا " دھینا کی نڈر اور بے خوف طبیعت اور بھڑک اٹھی اور وہ ہاتھ مٹکا کر بولی "

" ہاں دے دیا ۔ اپنی گائے تھی ، مار ڈالی پھر ؟ کسی دوسرے کا جانور تو نہیں مارا ؟ تمہاری جانچ میں یہی نکلتا ہے تو یہی لکھو ۔ پہنادو میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ۔ دیکھ لیا تمہارا بناؤ اور تمہاری بدھی کا پہنچ ۔ گریبوں کا گلا کاٹنا دوسری بات ہے اور دودھ کا دودھ ، پانی کا پانی کرنا دوسری بات ہے " ۔

پولیس اور قانون کی دھمکی اچھے اچھوں کے حوصلے پست کردیتی ہے لیکن دھنیا کی بےخوف اور سرکش فطرت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہاں اگر منشی پریم چند تھانےدار کی دھمکی پر دھنیا کو خاموش کرادیتے تو بھی اس کے کردار میں کوئی خامی پیدا نہ ہوتی لیکن تھانےدار کو اس کا دوبدو جواب دینا دکھاکر قابل مصنف نے دھنیا کے کردار کو انتہائی بلندی پر پہنچادیا ہے۔

غصے کی حالت میں انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اسے خود خیال نہیں رہتا کہ وہ کیا کہ رہا ہے اور جو الفاظ اس کی زبان سے ادا ہورہے ہیں وہ کہے جانے کے قابل بھی ہیں یا نہیں؟ کوئی ہندستانی عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کسی دوسرے کے یہاں بیٹھجانے کا خیال تک نہیں کرسکتی لیکن اس وقت جب اس کا شوہر تھانےدار کو رشوت دینے کے لیے جارہا تھا اور دھنیا نے کپڑا کھینچ کر روپے زمین پر گرادیے تھے، شوہر کے مارنے کے لیے بڑھنے پر دھنیا اس طرح دھمکی دیتی ہے۔ دھنیا کی یہ باتیں اس کے انتہائی غصے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں مصنف نے دھنیا کا کردار پیش کرنے میں کمال کردیا ہے:-

> "تو ہٹ جا گوبر! دیکھوں تو وہ کیا کرتا ہے میرا! داروگاجی بیٹھے ہیں، اس کی ہمت دیکھوں۔ گھر میں تلاسی ہونے سے اس کی اجت جاتی ہے اور اپنی عورت کو سارے گانو کے سامنے لتیانے سے اس کی اجت نہیں جاتی۔ یہی تو بیروں کا دھرم ہے! بڑا بیر ہے تو کسی مرد سے لڑ! جس کی بانہ پکڑ کر لایا اسے مار کر بیر نہ کہاوےگا۔ تو سمجھتا ہوگا کہ میں اسے روٹی کپڑا دیتا ہوں تو لے آج سے اپنا گھر سنبھال۔ دیکھوں تو کہ اسی گانو میں تیری چھاتی پر مونگ دل کر رہتی ہوں کہ نہیں اور تیرے گھر سے اچھا کھاؤں گی اچھا پہنوں گی۔ جی میں آوے تو دیکھ لے!"

یہ ضروری نہیں کہ ہر بہترین افسانہ‌نگار اچھا کردارنگار بھی ہو۔ اچھا کردارنگار ہونے کے لیے عمیق مشاہدے کی اشد ضرورت ہے۔ جس جگہ کسی شخص قصہ کا کردار واضح نہیں ہے یا اس میں شخص قصہ کے فطرت کی خلاف تبدیلی پیدا کردی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف میں قوت مشاہدہ کی کمی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مصنف خود شخص قصہ سے کماحقہ واقف نہیں ہے تو وہ کس طرح اس کا کردار مطابق فطرت پیش کرسکتا ہے۔ دھنیا کے کردار میں یہاں ہم اس قسم کی

کوئی خامی نہیں پاتے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کی فطرت کا مطالعہ بہت اچھی طرح کیا ہے اور اپنے مطالعہ کو صداقت سے پیش کردیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دھینا سے مانوس ہوگئے ہیں اور یہی کسی کردار کی خوبی ہے ۔ کسی شخص قصہ کے کردار سے مانوس ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ ہر متذبذب موقع پر ہم اس کردار کے رویے کا پہلے ہی سے اندازہ لگالیں ۔ آئیے ! اب دیکھیں کہ دھینا اپنی ضد اور ہٹ پر قائم بھی رہتی ہے یا نہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اس کے کردار میں استقلال ہے یا نہیں ؟

انسان پر جب انتہائی مصیبتیں پڑتی ہیں تو اس میں ان کو برداشت کرنے کی خود بہ‌خود صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ وہ تکالیف کو تکالیف نہیں سمجھتا ۔ اس کی نظروں میں ان کی اہمیت نہیں رہتی ۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے :—

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

علاوہ اس کے جن حالات کی وجہ سے یہ تمام تکالیف پہنچتی ہیں وہ ان سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے ۔ یہی چیز آپ کو دھینا کے کردار میں بھی ملےگی ۔ ناول کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ دھینا کی زندگی مصائب و آلام سے پر ہے ۔ ان تکالیف میں جب سماج کچھ اور کا اضافہ کرنا چاہتی ہے تو وہ اس سے بغاوت اور انحراف کرتی ہے ۔ جھنیا پر رحم کھا کر دھینا نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا ۔ برادری کے خود ساختہ اصولوں کے ماتحت یہ ایسا پاپ تھا جسے وہ معاف نہیں کرسکتی تھی ۔ پنچوں نے دھینا کو برادری سے خارج کرکے ان کا حقہ پانی بند کردیا لیکن اس پر بھی اس نے جھنیا کو اپنے گھر سے نہیں نکالا ۔ ایک برھمن کے بیٹے نے ایک چماری ڈال رکھی ہے وہ دھینا سے کہتے ہیں کہ تو جھنیا کو گھر سے کیوں نہیں نکال دیتی ؟ اسے گھر میں رکھ کر مفت میں مصیبت مول لے رکھی ہے ۔ ان کو کیسا منہ توڑ جواب دیتی ہے کہ ہمیں برادری کی پرواہ نہیں ۔

« ہم کو گھرانے کی مرجاد اتنی پیاری نہیں ہے مہراج ! کہ اس کے پیچھے ایک جیو کی ہتیا کر ڈالتے ۔ بیاہتا نہ سہی ، پر اس کی بانھ تو پکڑی ہے میرے ہی بیٹے نے ، کس منہ سے نکال دیتی ؟ وہی کام بڑے کرتے ہیں زرا ان سے کوئی کچھ نہیں بولتا ۔ انہیں کلنک نہیں لگتا ، وہی کام چھوٹے آدمی کرتے ہیں تو ان کی مرجاد دھو جاتی

ہے، ناک کٹ جاتی ہے۔ بڑے آدمیوں کو اپنی ناک دوسروں کی جان سے پیاری ہوگی، ہمیں تو اپنی ناک اتنی پیاری نہیں»

وہ اتنے پر ہی بس نہیں کرتی بلکہ برادری کے اس ظلم پر جو صرف غریبوں پر ہی روا رکھا جاتا ہے اور جو اس پر بھی صرف غریب ہونے کے جرم میں توڑا گیا، پنچوں کو چڑھانے کے لیے جھنیا کے لڑکا ہونے پر زور زور سے گیت گاتی ہے

«دھینا اناج کی ٹوکری گھر میں رکھ کر اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ پوتے کی پیدایش کی خوشی میں گلا پھاڑ پھاڑ کر سوھر گارھی تھی کہ سارا گانو سن لے۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے مبارک وقت میں برادری کی کوئی عورت وھاں نہ تھی زچہ‌خانے سے جھنیا نے کہلا بھیجا تھا کہ سوھر گانے کا کام نہیں ہے مگر دھینا کب ماننے لگی؟ اگر برادری کو اس کی پروا نہیں ہے تو وہ بھی برادری کی پروا نہیں کرتی»

جب پنچوں نے دیکھا کہ برادری سے خارج کردینا اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا تو ایک ستم اور توڑا اور وہ یہ کہ پنچایت کرکے جرمانہ بھی کردیا۔ جب جرمانے کا حکم سنایا گیا تو حالاں‌کہ اس وقت مایوسانہ اور مظلومانہ جذبات کے غلبے کے ماتحت دھینا کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے:-

«پنچو! گریب کو ستا کر سکھ نہ پاؤگے، اتنا سمجھ لینا ہم تو مٹ جائیں گے، کون جانے کہ اس گانو میں رھیں یا نہ رھیں، مگر میرا سراپ تم کو بھی جرور سے جرور لگےگا۔ مجھ پر اتنا کڑا ڈنڈ اس لیے کیا جارھا ہے کہ میں نے اپنی بھو کو اپنے گھر میں کیوں رکھا۔ کیوں اسے گھر سے نکال کر سڑک کی بھکارن نہیں بنا دیا، یہی نیاؤ ہے، ایں»

لیکن اس کے استقلال میں جو ضدی اور ہٹ دھرم کے لیے ضروری ہے، کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ کردارنگار کو اشخاص‌قصہ کی فطرت بدلنے کا دراصل کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ قاری کو ان پر اعتماد ہوجاتا ہے اور مصنف کا فرض ہے کہ وہ اس اعتماد کا آخر وقت تک لحاظ کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے کردار میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ صرف اس قدر کہ تبدیلی ایسی نہ ہو جو غیرفطرتی ہو یعنی وہ تبدیلی شخص‌قصہ کی عادت کے منافی نہ ہو۔ جرمانے کی سزا سن کر دھینا اور بھی بھڑک اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ:-

« میں نہ ایک دانہ اناج دوں گی، اور نہ ایک کوڑی، جس میں بوتا ہو چل کر مجھ سے لےلے۔ اچھی دل لگی۔ ہے سوچا ہوگا کہ ڈنڈ کے بہانے اس کی سب جیجات (یہ جائداد) لےلو اور نجرانہ لےکر دوسروں کو دے ہو۔ باگ بگیچا بینچ کر مجے سے تر مال اڑاؤ۔ دھنیا کے جیتےجی یہ نہیں ہونے کا، اور تمہاری لال سا تمہارے من ہی رہے گی۔ ہمیں نہیں رہنا ہے برادری میں۔ برادری میں رہکر ہماری مکتی نہ ہوجائےگی۔ اب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھاتے ہیں۔ تب بھی اپنے پسینے کی کمائی کھائیں گے۔ »

اور جب اس کا شوہر جرمانے میں اناج پنچوں کو دینے کے لیے جاتا ہے تو وہ اس کا بھی ہاتھ پکڑکر کہتی ہے :-

« اچھا اب رہنے دو! ڈھو تو چکے برادری کی لاج۔ اب بچوں کے لیے کچھ بھی چھوڑوگے کہ سب برادری ہی کے بھاڑ میں جھونک دوگے؟ میں تم سے ہار جاتی ہوں۔ میرے بھاگ میں تمہیں جیسے مورکھ کا ساتھ بدا تھا۔ »

اور جب اس کا شوہر کہتا ہے کہ میں سارا اناج پنچوں کے آگے جاکر ڈال دیتا ہوں وہ خود رحم کھاکر مجھے میرے بچوں کے لیے کچھ دے دیں گے تو وہ اسے سمجھاتی ہے کہ یہ تیرا خیال خام ہے :-

« یہ پنچ نہیں ہیں راچھس ہیں۔ پکے اور پورے راچھس۔ یہ سب ہماری جگہ جمین چھین کر مال مارنا چاہتے ہیں۔ ڈانڈ باندھ کا تو بہانہ ہے۔ سمجھاتی جاتی ہوں پر تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ تم ان راچھسوں سے دیا کا آسرا رکھتے ہو۔ سوچتے ہو کہ دس پانچ من تمہیں دے دیں گے۔ منہ دھو رکھو! »

اس کی سرکش اور باغیانہ فطرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ برادری نے اس کو ڈرانے، دھمکانے اور قابو میں لانے کا ہر حربہ استعمال کیا، لیکن وہ کسی صورت سے بھی ان کے بس میں نہ آئی بلکہ ہمیشہ برادری کے لوگوں اور پنچوں کو گالیاں ہی سناتی رہی اور اپنے شوہر کی اس کمزوری پر کہ وہ برادری کا کہا مانتا ہے وہ اسے طعنے بھی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ برادری سے کیوں ڈریں؟ :-

« کون سا پاپ کیا ہے جس کے لیے برادری سے ڈریں؟ کسی کے گھر چوری کی ہے؟ کسی کا مال کاٹا ہے؟ مہریا رکھ لینا پاپ نہیں ہے، ہاں رکھ کے

چھوڑ دینا پاپ ہے۔ آدمی کا بہت سیدھا ہونا بھی برا ہے۔ اس کے سیدھے پن کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ کتے ہی منہ چاٹنے لگتے ہیں۔ آج ادھر تمھاری سراہنا ہو رہی ہوگی کہ برادری کی کیسی مرجاد رکھ لی، میرے بھاگ پھوٹ گئے تھے کہ تم جیسے مرد سے پالا پڑا۔ کبھی سکھ کی روٹی نصیب نہ ملی۔"

کسی شخص قصہ کے کردار میں کوئی امتیازی خصوصیت پیدا کردینا تو بڑا آسان ہے لیکن اسے اختتام قصہ تک نبھانا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔ اگر قصہ نگار نے اس کے کردار کی اس امتیازی خصوصیت کو اول سے آخر تک نبھادیا ہے تو یہ اس کا کمال ہے۔ اس چیز کو کردار کا استقلال کہتے ہیں۔ اور کسی کردار کا قصہ نگار کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن جانا کردار نگاری کی زبردست خامی ہے۔ دھنیا کے کردار میں ہمیں یہ خامی نظر نہیں آتی وہ اختتام قصہ تک وہی دھنیا رہتی ہے جو ابتدائے قصہ میں تھی۔

دھنیا نے جھنیا پر ترس کھاکر اسے گھر میں رکھ لیا تھا جس پر برادری نے مطالبہ کیا کہ جھنیا کو گھر سے نکال دیا جائے۔ اس سلسلے میں پنچوں نے ان کے گھر کا حقہ پانی بند کیا اور جرمانہ عائد کیا۔ دھنیا نے چونکہ اول مرتبہ اسے گھر سے نکالنے سے انکار کردیا تھا اس لیے اپنی ضدی فطرت کی وجہ سے وہ اس پر قائم رہی اور جھنیا کو نکلوانے کے لیے کوئی دھمکی اس پر کارگر نہ ہوئی۔ جھنیا کے باپ کا خیال تھا کہ دھنیا نے جھنیا کو اپنے گھر رکھ کر اس کی توہین کی ہے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ یا تو جھنیا کو گھر سے نکال دو یا میری گائے کی قیمت ادا کرو، ورنہ میں تمھارے بیل لیے جاتا ہوں۔ کسان کے لیے بیل اولاد سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ ویسے تو خدا رازق ہے لیکن رزق حاصل ہونے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ہوتا ہے۔ کسان کے لیے بیل ہی اس کے رزق کا وسیلہ ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو فروخت کرسکتا ہے لیکن بیلوں کو نہیں مگر جھنیا کے باپ کی بیل لے جانے کی دھمکی بھی دھنیا کو جھنیا کے گھر سے نکال دینے پر آمادہ نہ کرسکی۔ وہ بھولا سے کہتی ہے :-

"تو مہتو، میری بھی سن لو! جو بات تم چاہتے ہو وہ نہ ہوگی، سو جنم نہ ہوگی جھنیا ہماری جان کے ساتھ ہے۔ تم بیل ہی تو لے جانے کو کہتے ہو سو لے جاؤ۔ اگر اس سے تمھاری کٹی ہوئی ناک جڑتی ہے تو جوڑ لو۔ پرکھوں کی آبرو بچتی ہو تو بچا لو۔ جھنیا سے برائی جرور ہوئی جس دن اس نے میرے گھر

میں پانو رکھا میں جھاڑو لے کر مارنے اٹھی تھی مگر جب اس کی آنکھوں
سے جھرجھر آنسو گرنے لگے تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ تم اب بوڑھے
ہوگئے ہو مہتو، پر آج بھی تمھیں بیاہ کی دھن سوار ہے، پھر وہ تو ابھی بچہ ہے۔"

ضدی اور ہٹ دھرم میں استقلال ہوتا ہے اور پھر قدرتاً قوت برداشت بھی
زیادہ ہوتی ہے۔ دھنیا بھی کسی صورت سے شکست قبول نہیں کرتی۔ وہ ہر مصیبت
کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسے بیلوں کے متعلق جب پہلی مرتبہ
معلوم ہوا تو وہ اپنے شوہر کو اس طرح مخاطب کرتی ہے:-

"مہتو دونوں بیل مانگ رہے ہیں تو دے کیوں نہیں دیتے؟ ان کا پیٹ بھرے۔
ہمارے رام مالک ہیں۔ ہمارے ہاتھ تو نہیں کاٹ لیں گے؟ اب تک اپنی
مجبوری کرتے تھے اب دوسرے کی مجبوری کریں گے۔ بھگوان کی مرجی
ہوگی تو پھر بیل بدھیا ہو جائیں گے اور مجوری ہی کرتے رہے تو کون
برائی ہے؟ سوکھا پالا اور لگان کا بوجھ تو نہ رہےگا........."

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کسان اپنی کاشت کو چھوڑ کر کسی دوسرے
کی مزدوری کرنا انتہائی ذلت سمجھتا ہے۔

اور جب جھنیا یہ دیکھ کر کہ صرف میرے یہاں رہنے کی وجہ سے ان
لوگوں پر یہ تمام مصیبتیں ٹوٹ پڑی ہیں باہر نکل کر اپنے باپ سے کہتی ہے کہ تم
ان کے بیل کیوں لے جاتے ہو؟ میں خود ہی گھر سے نکلے جاتی ہوں تو دھنیا اسے
پکڑ کر گھر میں لے جاتی ہے اور ڈانٹ کر اس سے کہتی ہے:-

"تو کہاں جاتی ہے بہو؟ چل گھر میں! یہ تیرا گھر ہے۔ ہمارے جیتے جی
بھی اور ہمارے مرنے پر بھی۔ ڈوب مرے وہ جیسے اپنی اولاد سے بیر ہو۔
اس بھلے آدمی کو منہ سے ایسی بات نکالتے لاج بھی نہیں آتی۔ مجھ پر
دھونس جماتا ہے۔ نیچ لیجا، بیلوں کا رکت پی......"

دھنیا کو اس قدر ضد چڑھی ہوئی ہے کہ اس نے جھنیا کے خود گھر سے نکل
جانے پر اسے پکڑ کر گھر میں بٹھایا ہے چہ جائےکہ لوگ اسے دھمکا کر چاہتے تھے
کہ وہ خود جھنیا کو گھر سے نکال دے۔ منشی جی نے ضدی اور ہٹ دھرم کا بالکل سچا
نقشہ کھینچا ہے۔

یہی نہیں کہ لوگ اس سے جھینا کو گھر سے نکلوانے میں ناکامیاب رہے بلکہ اسی قسم کی ایک اور عورت سلیا کو جو چماری ہے اس کے آشنا کا باپ گھر سے نکال دیتا ہے تو اسے بھی دھنیا اپنے گھر لے آتی ہے اور جب ہوری کہتا ہے کہ "بلائی تو ہے پنڈت کو جانتی نہیں؟" تو اس پر دھنیا کا جواب اس کے کردار کو کس قدر صاف اور واضح کردیتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ:—

"بگڑیں گے تو ایک روٹی بیسی کھالیں گے۔ اور کیا کریں گے؟ کوئی ان کی دبیل ہوں؟ اس کی آبرو لی، برادری سے نکلوایا اور اب کہتے ہیں کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ آدمی ہے کہ کسائی؟ یہ اسی نیت کا آج پھل ملا ہے۔ پہلے نہیں سوچ لیا تھا۔ تب تو موج اڑاتے رہے اب کہتے ہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

دھنیا کا سلیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن صرف برادری کی ضد کی وجہ سے اس نے سلیا کو اپنے یہاں رکھا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ اگر برادری اس پر جھنیا کو گھر سے نکالنے پر زور نہ ڈالتی تو وہ سلیا کو اپنے یہاں نہ رکھتی لیکن اب اسے ضد چڑھ گئی ہے جب سلیا کے گھر میں رکھنے پر ہوری کچھ کہتا ہے تو وہ اسے بھی پھٹکار دیتی ہے۔ اور بعد میں ایک مرتبہ اور جب ہوری سلیا کے کہیں چلے جانے پر اس سے بازپرس کرنے کو کہتا ہے تو دھنیا اس کو ڈانٹ دیتی ہے۔ اس کی یہ تمام حرکات اس ضد کی بنا پر ہیں جو اس میں برادری اور پنچوں نے پیدا کردی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کے کردار میں ایک قسم کا استقلال پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی بات پر قائم رہتا ہے چاہے اس کی وجہ سے اسے کتنی ہی تکالیف کیوں نہ سہنی پڑیں۔ اس میں قوت برداشت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ یہی حال دھنیا کا بھی ہے۔ جب جھنیا کا باپ بھولا بیل لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا تو دھنیا نے کہا تھا کہ لے جاؤ ہم مزدوری کرلیں گے۔ وہ اپنی بات پر قائم رہی اور مزدوری بھی کی جیسا کہ ان اقتباسات سے ظاہر ہے:—

"ہوری دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔ کہیں اس کے کھیت میں جا بیٹھتا، کہیں اس کی بوائی کرادیتا۔ اس طرح کچھ اناج مل جاتا۔ دھنیا سونا، روپا سبھی دوسروں کی بوائی میں لگی رہتی تھیں۔ جب تک بوائی رہی پیٹ کی روٹیاں ملتی گئیں اور کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ دماغی

تکلیف تو ضرور ہوتی تھی مگر کھانے بھر کو مل جاتا تھا۔ رات کو روز میاں بیوی میں تھوڑی سی لڑائی ہوجاتی تھی "

"گانو میں ایکھ کی بوائی شروع ہوگئی تھی۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی مگر ہوری کھیت میں پہنچ گیا ہے۔ دھینا، سونا، روپا، تینوں تلیا سے ایکھ کے بھیگے ہوئے گٹھے نکال نکال کر کھیت میں لارہی ہیں اور ہوری گنڈاسے سے ایکھ کے ٹکڑے کررہا ہے۔"

لیکن اس حالت میں بھی جب کہ وہ صرف ایک مزدور ہے آپ اس کے کردار میں خوشامد کا فقدان ہی پائیں گے۔ جس کے یہاں یہ لوگ مزدوری کررہے ہیں اس سے دھینا کی گفتگو سن لیجیے :-

" دھینا اور دونوں لڑکیاں......ذرا ستانے لگیں کہ داتادین نے ڈانٹ بتائی " یہاں تماسہ کیا دیکھتی ہے دھینا، جا اور اپنا کام کر۔ پیسے سینت میں نہیں آتے۔ پہر بھر میں تو گٹھا لائی ہے۔ اس حساب سے تو دن بھر میں اوکھ نہ ڈھل پائے گی" دھینا نے تیوری بدل کر کہا "کیا تنک دم بھی نہ لینے دوگے مہراج؟ ہم بھی تو آدمی ہیں۔ تمھاری مجوری کرنے سے بیل تو نہیں ہوگئے۔ جرا کھوپڑی پر ایک گٹھا لادکر لاؤ تو پتا چلے۔"

داتادین بگڑ اٹھے " پیسے دیتے ہیں کام کرنے کے لیے، دم لینے کے لیے نہیں۔ دم لینا ہے تو گھر میں جاکر دم لو"

دھینا کچھ کہنے ہی جارہی تھی کہ ہوری نے ڈانٹا "تو جاتی کیوں نہیں دھینا۔ کیوں حجت کررہی ہے؟"

دھینا نے بندھنے کو اٹھاتے ہوئے کہا "جا تو رہی ہوں۔ پر چلتے ہوئے بیل کو اوگی نہ لگانا چاہیے"

داتادین نے سرخ آنکھیں نکال کر کہا " معلوم ہوتا ہے ابھی مجاج ٹھنڈا نہیں ہوا۔ تبھی دانے دانے کو ترستے ہو"

دھینا بھلا کیوں چپ رہنے لگی، بولی " تمھارے دوارے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتی؟"

داتادین نے تیز لہجے میں کہا " اگر یہی حال رہے تو بھیک بھی مانگوگی"

"........بھیک مانگو تم، جو بھک منگوں کی جات ہو۔ ہم تو مجور ٹھیرے
- جہاں کام کریں گے، وہیں چار پیسے پائیں گے"

قابل مصنف نے دھنیا کے کردار کو اس قدر مکمل، واضح اور دل‌چسپ بنادیا ہے کہ اس پر اصلی کردار کا دھوکا ہوتا ہے اور اسی قسم کے کردار وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ "کردار خواہ کسی نوعیت کا ہو جب تک اس میں انسانی دل‌چسپی موجود نہ ہو وہ ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کرسکتا۔ انسانی دل‌چسپی سے مطلب یہ ہے کہ جب تک ہم اشخاص قصہ کے ساتھ رہیں ان سے متعلق ہر واقعے میں اسی طرح دل‌چسپی لیں جس طرح اپنے ایک ہم جنس زندہ آدمی کے افعال میں لیتے ہیں۔" کیا دھنیا کے کردار میں یہ انسانی دل‌چسپی مفقود ہے؟ افسانے کے ہر فرد کی زندگی کا ایک معین اصول ہوتا ہے جو اس کی سرشت اور فطرت کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس پر اس کا ماحول اثرانداز ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر نازک سے نازک مرحلے پر بھی اس اصول زندگی کو ناول‌نگار اپنے مقصد کے مطابق تبدیل نہیں کرسکتا۔ جس طرح اس دنیا کے رہنے والے اشخاص کی زندگی کے مقررہ اصول ہوتے ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں ان کی سیرت اور فطرت کی صورت میں بہ‌دستور قائم رہتے ہیں اسی طرح افراد قصہ کے کرداروں میں اس کا استقلال نہایت ضروری ہے۔ دھنیا کے کردار میں ہمیں یہ استقلال ہر جگہ اور ہر موقع پر ملتا ہے۔

دھنیا کا تعارف کراتے وقت مصنف نے شروع ہی میں بتایا ہے کہ وہ خود دار تھی۔ اس کی خودداری کا ثبوت اس جگہ ملتا ہے جب اسے اپنی بڑی لڑکی کی شادی کرنی ہے اور پاس پیسہ نہیں ہے۔ ہوری کہتا ہے کہ میں لکھنؤ جاکر گوبر سے کچھ روپے لے آؤں لیکن دھنیا کو گوبر کے یہ الفاظ نہ بھولے تھے کہ"......اب تم چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا رن چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں جیسے میری زندگی تمھارا دینا بھرنے کے لیے ہے۔ میرے بھی‌تو بال بچے ہیں۔" اس کی خودداری گوارا نہیں کرسکتی کہ جس بیٹے نے یہ الفاظ کہے تھے اس کے پاس جاکر اس سے روپیہ مانگا جائے۔ وہ گوبر سے ایک پیسہ بھی نہ لینا چاہتی تھی، کسی طرح بھی نہیں۔"

دھنیا کے یہاں جس زمانے میں کھانے کو بڑی نہ رہا تو ہیرا کی بیوی، اس کی دیورانی اسے کچھ آٹا دے گئی۔ اس وقت مدد کرنے پر وہ اس کی احسان مند ہوتی ہے لیکن دل میں پچھتاتی ہے کہ کیوں اس کا احسان لیہ جس کو وہ برا سمجھتی ہے

اور جس کے شوہر نے اس کی گائے کو زہر دے دیا تھا۔ بعد میں جب ہوری پنیا کی تعریف کرتا ہے تو دھنیا اس کی کاٹ کرتی ہے جس پر ہوری کہتا ہے کہ تو کسی کا اپکار نہیں مانتی، یہی تجھ میں برائی ہے۔" اس کا جواب دھنیا یہ دیتی ہے :—

"اپکار کیوں مانوں؟ میرا آدمی اس کی گرستی کے پیچھے جان نہیں دے رہا ہے پھر میں نے دان تھوڑے ہی لیا ہے۔ ایک ایک دانہ بھر دوں گی"

یہاں بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ دھنیا کو احسان فراموش کہیں۔ دراصل بات یہ نہیں ہے۔ دھنیا فطرتاً ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ اس کے مزاج میں استقلال ہے اور وہ شکست نہیں مانتی۔ پنیا کی امداد کو اس نے منظور تو کرلیا ہے لیکن دوسرے الفاظ میں یہ اس کی شکست ہے اور شکست ماننا اس کی طبیعت کے منافی ہے۔ امداد قبول کرکے اس کا احساس زخمی ہوگیا تھا۔ اس پر ہوری کا پنیا کی تعریف کرنا اس کے زخموں پر نمک پاشی ثابت ہوا۔ دھنیا کا جواب ان حالات کے تحت دیکھنا چاہیے۔

بالکل یہی صورت اس جگہ پیدا ہوتی ہے جب روپے کا انتظام نہ ہوسکنے کی وجہ سے بڑی لڑکی کی شادی کی فکر میں دھنیا اور ہوری گھلے جاتے ہیں اور جھنیا کی سوتیلی ماں نہری آکر روپیہ دیتی ہے۔ اس وقت دھنیا اس کی ممنون ہوتی ہے لیکن جب نہری نے اپنی اس امداد کا چرچا کرکے دھنیا کی شکست کا اعلان کیا تو دھنیا بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی ڈینگوں کے جواب میں کہتی ہے :—

"روپے کھیرات دیے تھے! بڑی کھیرات دینی والی! بیاج مہاجن بھی لےگا اور تم بھی لوگی پھر احسان کاہے کا؟ دوسرں کو دیتی تو بیاج کی جگہ اصل بھی چلا جاتا۔ ہم نے لیا ہے تو ہاتھ میں روپیہ آتے ہی ناک پر رکھ دیں گے ہیں تھے کہ تمہارے گھر کا بس اٹھا کے پی گئے اور کبھی مونہ پر نہیں لائے۔ کوئی یہاں دروازے پر کھڑا نہیں ہونے دیا تھا۔ ہم نے تمھاری مرجاد بنا دی، تمھارے مونہ کی لالی رکھ لی"

اور چونکہ نہری نے اس کی شکت کا اعلان کیا ہے وہ اس کے شوہر کے سامنے یہ کوکر نہری کو سزا دینے کے لیے اکساتی ہے یہ گویا دھنیا کا انتقام ہے۔ واضح رہے کہ کسی کو کسی کام پر آمادہ کرنے کے لیے طعنے بہترین ذریعہ ہیں۔

"دوسرا مرد ہوتا تو ایسی عورت کا سر کاٹ لیتا ...... عورت چاہے جس راہ جائے مرد ٹکر ٹکر دیکھتا رہے ایسے مرد کو میں مرد نہیں کہتی ...... عورت کوئی کا گھڑا ڈھلکاوے گھر میں آگ لگا دے تو یہ سب مرد سہے؟ لےکا مگر اس کا بدراہ چلنا کوئی مرد نہ سہےگا ...... جب عورت کو بس میں رکھنے کا بوتا نہ تھا تو سگائی کیوں کی تھی؟ اس .... کے لیے؟ کیا سوچتے تھے کہ وہ آکر تمھارے پانو دبائے گی تمھیں چلم بھر بھر کے پلائے گی اور جب تم بیمار پڑوگے تو تمھاری سیوا اور ٹہل کرے گی؟ تو ایسا وہی عورت کرسکتی ہے جس نے تمھارے ساتھ جوانی کا سکھ اٹھایا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسے دیکھ کر لٹو کیسے ہوگئے۔ دیکھ تو لیا ہوتا کہ وہ کس سبھاو کی ہے۔ کس رنگ ڈھنگ کی ہے۔ تم تو بھوکے ...... کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اب تو تمھارا دھرم یہی ہے کہ گنڈاسے سے اس کا سر کاٹ لو۔ پھانسی ہی تو پاؤگے۔ اس .... سے پھانسی اچھی ...... اب سو پچاس برس تو جیوگے نہیں سمجھ لینا کہ اتنی ہی عمر تھی۔"

اب ہم دھنیا کے کردار کے اس پہلو پر بحث کریں گے جو ہر ہندستانی گھرانے کا جز و لاینفک ہوکر رہ گئے ہیں۔ اور ہر شخص ان باتوں سے واقف ہے۔ ہندستانی گھرانوں میں مشترکہ خاندان کی وجہ سے ساس اور بہو کے جھگڑے آئے دن کی بات ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ جھگڑے غیر فطری بھی نہیں کہے جاسکتے۔ ماں جو اپنے لڑکے کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے اس کا لڑکا اس ہی کا رہے اور بہو جو صرف ایک شوہر کی وجہ سے اپنے تمام اعزاو اقربا کو چھوڑ کر آتی ہے قدرتی طور پر اس بات کی متمنی ہوتی ہے کہ اس کا شوہر کسی اور کا نہ ہو، بلا شرکت غیرے اس ہی کا ہو۔ لڑکے کو اپنانے کے لیے طرفین کی اس رسہ کشی کا لازمی نتیجہ اختلاف ہے جو اور اور باتوں کا سہارا لےکر جھگڑے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ دھنیا نے جھنیا پر ترس کھاکر اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور اسے جھنیا سے بعد کو اس قدر ہمدردی ہوگئی کہ برادری کے ہر قسم کے دباؤ کے باوجود اس نے اسے گھر سے نہ نکالا۔ وہ اس سے ہمیشہ ہمدردی ہی کرتی رہی۔ یہ ہمدردی جھنیا کی ذات سے صرف اس وقت تک تھی جب تک گوبر وہاں دخل انداز نہ ہوا تھا۔ جب گوبر آگیا اور اس نے جھنیا کو اپنے ہمراہ

لے جانے کے لیے کہا تو دھینا نے اس کو سمجھایا کہ" جھنیا کو وہاں لے جائیے۔ میں اسے جتنا آرام ملے گا اس سے کہیں زیادہ جھنجٹ بڑھ جائے گا لیکن جب گوبر نہ مانا تو دھینا نے ہندستانی ساسوں کی طرح اس کا نتیجہ یہ نکالا کہ اس ڈرامے میں درپردہ جھنیا کا ہاتھ ہے حالانکہ وہ غریب اس معاملے میں قطعاً بری الزمہ تھی۔ اس وقت کے دھینا کے احساسات کیا تھے؟ ملاحظہ ہوں۔ اس کے بعد اندازہ کیجیے کہ کیا یہ احساسات ایک ہندستانی ساس کے نہیں ہیں؟

"ہو نہ ہو یہ آگ جھنیا نے لگائی ہے۔ وہی بیٹھے بیٹھے اسے یہ منتر پڑھا رہی ہے یہاں بناؤ سنگار کرنے کو نہیں ملتا۔ گھر کا کچھ نہ کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہاں روپے پیسے ہاتھ میں آئیں گے تو آرام سے اچھا کھائے گی، اچھا پہنے گی اور پانو پھیلاکر سوئے گی۔ دو آدمیوں کی روٹی پکانے میں کیا لگتا ہے۔ وہاں تو پیسہ چاہیے۔ سنا ہے کہ بات میں پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ سارا بکھیڑا اسی نے کھڑا کیا ہے۔ سہر میں کچھ دنوں تو رہ بھی چکی ہے۔ وہاں کا دانہ پانی مونھ لگا ہوا ہے۔ یہاں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ یہ بھوندو مل گیا تو اسے پھنسا لیا۔ جب یہاں پانچ مہینے کا پیٹ لےکر آئی تھی تب کیسا میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ تب یہاں ٹھکانا نہ ملا ہوتا تو آج کہیں بھیک مانگتی پھرتی۔ اسی نیکی کا بدلا ہے! اسی چڑیل کے پیچھے ڈنڈ دینا پڑا برادری میں بدنامی ہوئی کھیتی ٹوٹی ساری درگت ہوگئی اور آج چڑیل جس پتل میں کھاتی ہے اسی میں چھید کر رہی ہے۔ پیسے دیکھے تو آنکھ ہوگئی۔ تبھی تو اینٹھی اینٹھی پھرتی ہے مجاج نہیں ملتا۔ آج لڑکا چار پیسے کمانے لگا ہے تا۔ اتنے دنوں بات نہیں پوچھی تو ساس کے پانو دبانے کے لیے تیل لیے دوڑتی تھی۔ ڈائن اس کی زندگی کی پونجی کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

دیکھیے جھگڑے کی وجہ ساس کے نقطۂ نظر سے وہی نکلی کہ "اس کی جندگی کی پونجی اس سے چھین لینا چاہتی ہے۔" جب اس سے نہیں رہا جاتا تو بالاخر بیٹے سے پوچھ ہی بیٹھتی ہے:-

"یہ منتر تمھیں کون دے رہا ہے بیٹا؟ تم تو ایسے نہ تھے۔ ماں باپ تمھارے ہی ہیں، بہن تمھاری ہی ہے، گھر تمھارا ہی ہے یہاں باہر کا

کون ہے؟ اور ہم کیا؟ بہت دن بیٹھے رہیں گے؟ گھر کی آبرو بنائے رہو گے، تو تم ہی کو سکھ ہوگا۔ آدمی گھر والوں ہی کے لیے پیسہ کماتا ہے کہ اور کسی کے لیے؟ اپنا پیٹ تو سور بھی پال لیتی ہے۔ میں نہ جانتی تھی کہ جھنیا ناگن بن کر ہم ہی کو ڈسے گی»

اس پر جب دھنیا اپنی صفائی پیش کرتی ہے کہ میں نے گوبر سے کچھ نہیں کہا بلکہ «سب کا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں چار پیسے ہوں» تو ساس اس کی کوئی بات نہیں مانتی بلکہ الٹا اسے اور ڈانٹتی ہے۔

«دھنیا نے دانت پیس کر کہا» بہت گیان نہ بگھار! آج تو بھی اپنا بھلا برا سوچنے لایک ہوگئی ہے۔ یہاں آکر میرے پانو پر سر رکھ کر رو رہی تھی تب اپنا بھلا برا نہیں سوجھا تھا؟ اس گھڑی ہم میں اپنا بھلا برا سوچنے لگتے تو آج تیرا کہیں پتا نہ ہوتا»

اس کے بعد ساس بہو میں لڑائی ہوجاتی ہے۔ منشی جی نے ساس بہو کی لڑائی پیش کرنے میں جس حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی، لیکن ہمارا موضوع «گئودان» کے محاسن دکھانا نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ مصنف نے دھنیا کا کردار پیش کرنے میں کردار نگاری کا کمال کر دیا ہے۔ لڑائی میں دھنیا کسی کے سمجھانے پر نہیں مانتی ایک تو لڑائی میں ویسے بھی کون کسی کی سنتا ہے اور پھر دھنیا تو ایک صدی واقع ہوئی ہے اپنے شوہر کے ہمراہ جانے سے قبل ہندستانی گھرانے کی ایک حقیقی ہندو بہو کی طرح جب «جھنیا نے ساس کے پاس جاکر اس کے پیروں کو آنچل سے چھوا (تو) دھنیا کے مونھ سے دعا کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کو آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں» ۔ بہو سے اس کا یہ رویہ تھا لیکن اس بیٹے کی جدائی پر جس نے یہ کہ کر میرے «پالنے میں تمھارا لگا ہی کیا؟ جب تک بچہ تھا دودھ پلا دیا پھر لاوارث کی طرح چھوڑ دیا جو سب نے کھایا وہی میں نے کھایا۔ میرے لیے دودھ نہیں آتا تھا۔ مکھن نہیں آتا تھا اور اب تم چاہتی ہو اور دادا بھی چاہتے ہیں کہ میں سارا رن چکاؤں، لگان دوں اور لڑکیوں کا بیاہ کروں جیسے میری جندگی تمھارا دینا بھرنے کے لیے ہے۔ میرے بھی تو بال بچے ہیں» اس کی تمام زندگی کی محنت کو خاک میں ملا دیا تھا، وہ رو پڑتی ہے۔ جدا ہوجانے پر اسے جھنیا یاد نہیں آتی کیوں کہ وہ بہو

ہے لیکن بیٹا اور پوتا یاد آتے ہیں، کیوں کہ وہ اسی کا خون ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی برائی پر بھی اسے برا نہیں کہتی بلکہ جھنیا ہی کو قصور وار گردانتی ہے۔ مندرجۂ ذیل اقتباس کو دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ ایک ہندستانی ساس اور ماں کا صحیح کردار پیش نہیں کرتا؟ اور کون سا گھر ہے جس میں آئے دن اس قسم کے واقعات پیش نہیں آتے رہتے:-

> "وہ بار بار سوچتی کہ اس نے جھنیا کے ساتھ ایسی کون سی برائی کی تھی جس کی اس نے یہ سزا دی۔ ڈائن نے آکر اس کا سونے کا گھر مٹی میں ملا دیا۔ گوبر نے تو کبھی اس بات کا جواب بھی نہ دیا تھا۔ اسی رانڈ نے اسے پھوڑا اور اب وہاں لےجا کر نہ جانے کون کون سا ناچ نچائےگی، یہیں وہ بچے کی کون بہت پروا کرتی تھی۔ اسے تو اپنے مسّی، کاجل اور مانگ چوٹی ہی سے چھٹی نہ ملتی تھی۔ بچے کی دیکھ بھال کیا کرےگی؟ بےچارہ اکیلا دھرتی پر پڑا روتا ہوگا۔ بےچارہ ایک دن بھی تو سکھ سے نہیں رہنے پاتا۔ کبھی کھانسی، کبھی دست، کبھی کچھ، کبھی کچھ یہ سوچ سوچ کر اسے جھنیا پر غصہ آتا۔ گوبر کے لیے اس کے دل میں وہی ماتا تھی۔ اسی چڑیل نے اسے کچھ کھلا پلاکر اپنے بس میں کرلیا ہے۔ ایسی جادو ٹونا وان نہ ہوتی تو یہ ٹونا ہی کیسے کرتی؟ کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ بھوجائیوں کی لاتیں کھاتی تھی۔ یہ بدھو مل گیا تو آج رانی ہوگئی۔"

عورتوں کے کردار کی ایک خوبی یا خامی، جو کچھ بھی سمجھا جائے، یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ سے کوئی دیرپا اثر نہیں لیتیں یہی وجہ ہے کہ کوئی عورت ہمیشہ ساس یا ماں نہیں رہتی۔ زمانے کی رفتار پہلے احساسات کو مٹاتی چلی جاتی ہے اس کا دھنیا پر بھی اثر ہوتا ہے اور جب گوبر اور جھنیا دوبارہ پھر گانو آتے ہیں تو وہ انھیں دیکھ کر خوش ہوجاتی ہے اور جب گوبر پھر واپس جاتا ہے تو وہ محبت کے زیر اثر جھنیا کو اس کے ہمراہ نہیں جانے دیتی۔ یہاں مصنف نے دھنیا کے کردار میں ارتقاء دکھایا ہے۔ زمانے کے ساتھ خیالات میں تبدیلی ہوتی ہے اور اگر مصنف اس تبدیلی کا خیال نہیں کرتا تو اس کی خامی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے کردار کو زندہ اور حساس انسان نہیں سمجھ رہا ہے۔ ہمیں یہی تبدیلی اس جگہ بھی ملتی

ہے جب کہ ہیرا کو گھر سے گئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے وہ اپنے شوہر سے دوران گفتگو میں، کہتی ہے کہ ‹ ہیرا تو جیسے سنسار ہی سے چلا گیا › ۔ یہ وہی ہیرا ہے جس نے اس کی گائے کو زہر دیا ہے اور جس کے متعلق وہ اپنے شوہر سے سے ایک مرتبہ کہہ چکی ہے کہ ‹ میں بنا لالا کو بڑے گھر بھجوائے مانوں گی نہیں، تین سال چکی پسواؤں گی، تین سال ۔ ›

کردار نگاری کا بہترین مظہر ایک ناول ہی ہوسکتا ہے کیوں کہ اس میں مصنف پر اختصار وغیرہ کی پابندیاں نہیں ہوتیں، وہ شخص قصہ کی زندگی کے مختلف ادوار اس کے خیالات اور احساسات اور رجحانات پر بالتفصیل بحث کرسکتا ہے ۔ آئیے اب ہم دھنیا کے شادی بیاہ کے متعلق خیالات معلوم کرلیں ۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ ہوری کی کاشت سب ختم ہوگئی ہے اور ان کا خاندان انتہائی عسرت و تنگی کی زندگی بسر کررہا ہے ۔ بڑی لڑکی جوان ہوچکی ہے ۔ اس کی شادی کی فکر ہے ۔ اس سلسلے میں چاہے قرض لینا پڑے، چاہے کھیت رہن رکھنے پڑیں › مگر شادی ضرور ہوگی ۔ دھنیا کا شوہر کفایت سے کرنا چاہتا ہے لیکن دھنیا کہتی ہے کہ ‹ چاہے کتنا ہی ہاتھ باندھ کر کھرچ کرو، دو ڈھائی سو تو لگ ہی جائیں گے ›

اس موقعے پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے ۔ ایک صاحب کو اپنے لڑکے کی شادی کرنا تھا ۔ ان پر قرض کا بار بھی تھا لیکن بدقسمتی کہیے کہ اس سے قبل اپنے زمانۂ خوش حالی میں دھوم دھام سے تقاریب کرچکے تھے وہ چاہتے تھے کہ شادی سیدھے سادے طریقے سے کردی جائے تاکہ مزید قرض کا بار نہ ہو لیکن ان کی بیوی مصر تھیں کہ چاہے جیسے بڑی ہو تقریب اگر پہلی جیسی نہ ہو تو آبرو رکھنے کے لیے کم از کم پچھلی تقاریب کی عشر عشیر تو ہو ۔ ‹ کمینوں › کو چاندی کے کڑوں کے ساتھ جوڑے ہوں بری میں کم از کم سونے کے دست بند ۔ کنگن ۔ گلوبند ۔ توڑے اور بندے وغیرہ تو ہوں حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ کپڑوں ہی کا انتظام ہوجائے تو بہت غنیمت ہے ۔ یہاں کیا دھنیا کا یہ کہنا کہ ‹ چاہے کتنا ہی ہاتھ باندھ کر کھرچ ہو، دو ڈھائی سو تو لگ ہی جائیں گے › مندرجۂ بالا واقعے کو دوسرے اور امیرانہ الفاظ میں ادا کرنا نہیں ہے؟

جس لڑکی کی شادی کی فکر کی جارہی ہے وہ اپنے والدین کی اس پریشانی سے متاثر ہوکر ایک وسیلے سے لڑکے والوں کو اس بات پر آمادہ کرلیتی ہے کہ وہ اس کے والدین سے کسی قسم کے جہیز وغیرہ کا مطالبہ نہ کریں۔ جب لڑکی کے ہونے والے خسر کا اس مضمون کا ایک خط آتا ہے تو ہوری خوش ہوجاتا ہے اور بیوی کو جاکر خط کا مضمون بتاتا ہے لیکن دھنیا بجائے اس کے کہ خوش ہو یہ کہتی ہے :-

«یہ گوری مہتو کی بھل‌منسی ہے، پر ہمیں بھی تو اپنی مرجاد کا نباہ کرنا ہے۔ سنسار کیا کہےگا؟ روپیہ ہاتوں کا میل ہے اس کے لیے گھر کی مرجاد نہیں چھوڑی جاسکتی جو کچھ ہم سے ہوسکےگا وہ دیں‌گے اور گوری مہتو کو لینا پڑےگا۔ تم بھی جواب لکھ دو۔ ماں باپ کی کمائی میں کیا لڑکی کا کوئی حصہ نہیں ہے چلو میں نائی سے سندیسہ کہلائے دیتی ہوں»

اور جب ہوری شکایتاً اس سے کہتا ہے کہ تیری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلے کہتی تھی کہ قرض مت لو اور اب گھرانے کی عزت و آبرو کا جھگڑا لے بیٹھی۔ اس پر دونوں میاں بیوی کی گفتگو سنیے۔ اور دھنیا کی الٹی منطق دیکھیے۔

«دھنیا بولی» مونھ دیکھ کر بیڑا دیا جاتا ہے۔ جانتے ہو کہ نہیں؟ تب گوری اپنے سان دکھاتے تھے، اب وہ بھل‌منسی دکھاتے ہیں اینٹ کا جواب چاہیے پتھر ہو مگر پرنام کا جواب تو گالی نہیں ہے۔»

ہوری نے ناک سکیڑ کر کہا «تو دکھا اپنی بھل‌منسی! دیکھوں کہ کہاں سے روپیے لاتی ہے۔

دھنیا آنکھیں مٹکا کر بولی «روپیہ لانا میرا کام ہے۔ تمھارا کام ہے»

«میں تو دلاری ہی سے لوں‌گا»

«لےلو اسی سے سود تو سبھی لیں‌گے۔ جب ڈوبنا ہی ہے تو کیا گڑھی اور کیا گنگا»

واضح رہے کہ دلاری سے قرض لینے سے دھنیا کو اس وجہ سے اختلاف تھا کہ وہ سود زیادہ لیتی ہے اور مزید اس وجہ سے بھی کہ وہ کسی زمانے میں ہوری کی منظور نظر رہ چکی تھی اور اس بنا پر وہ اسے اپنی رقیب سمجھتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ کسی بہانے سے بھی ہوری اس کے یہاں جائے۔

تقاریب کے موقعوں پر ہندستانی عورتوں کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ بڑی دھوم دھام ہو اور گھر کے تمام اعزا کو جمع کیا جائے جس کا لازمی نتیجہ انتہائی خرچ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی یہ تمنا ایک حد تک حق بجانب بھی ہے کیوں کہ ہندستانی عورت شروع ہی سے ایسے ماحول میں پرورش پاتی ہے کہ اس کی زندگی میں ایک مستقل یکسانیت آجاتی ہے اور صرف تقاریب ہی ایسے مواقع بہم پہنچاتی ہیں کہ ان کی زندگی کی یکسانیت میں تھوڑا سا انقلاب پیدا ہوجائے ۔ اس کے لیے وہ اپنے شوہروں کے کمزور پہلو پر نظر رکھتے ہوئے خاندان کی عزت و آبرو کی آڑ لیتی ہیں۔ غربت کی حالت میں ہونے کے باوجود دھنیا کے بھی یہ کچھ عزائم تھے لیکن زندگی کے تلخ حقائق خوابوں کی رنگین دنیا کو برباد کر ڈالتے ہیں اور دھنیا کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں۔

«کہنا کیا ہے ۔ گوری برات لےکر آئیں گے تو ایک جون کھلا کر سبیرے لڑکی بدا کردینا۔ دنیا ہنسےگی تو ہنسلیے بھگوان کی یہی اچھا ہے کہ ہماری ناک کٹے اور ہمارے مونہ میں کالکھ لگے تو ہم کیا کریں گے؟»

دوسری لڑکی کے لیے ایک برہمن ایک بوڑھے کا رشتہ لائے۔ کون ماں ہے جو یہ چاہے گی کہ اس کی لڑکی کی کسی بڈھے خرانٹ سے ہوجائے ۔ ہوری نے جب اس واقعہ کا ذکر دھنیا سے کیا تو اس نے جواب دیا کہ «تم نے پنڈت کو پھٹکارا نہیں مجھ سے کہتے تو ایسا جواب دیتی کہ یاد کرتے» ایک اور موقعہ پر اسی سلسلے میں کہتی ہے کہ «بر اور کنیا جوڑ کے ہوں تبھی بیاہ کا سکھ ہے» اور جب اس کا شوہر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوتا تو اس کو سمجھانے کے لیے وہ یہ کہتی ہے۔

«گھر میں جب تک ساس سسر، دیورانیاں جٹھانیاں نہ ہوں تب تک سسرال کا سکھ ہی کیا ہے؟ کچھ دنوں تک تو لڑکی بہو بننے کا سکھ پائے...... اکیلی بہو گھر میں کیسے رہی گی؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے!»

دھنیا کا اگر بس چلتا تو کبھی بڈھے سے اپنی لڑکی کی شادی نہ کرتی لیکن واقعات اور حالات ہی اس قسم کے ہیں کہ اس کے پائے استقامت کو متزلزل کردیتے ہیں اور پنڈت کے دریافت کرنے پر کہ «لڑکے» کو دیکھ کر تمہاری کیا رائے ہے؟ دھنیا یہ جواب دیتی ہے۔

"عمر تو اعک ہے پر تم لوگوں کی رائے ہے تو مجھے بھی منجور ہے۔ بھاگ میں جو لکھا ہوگا وہ تو آگے آوے ہی گا، پر آدمی اچھا ہے"

اس دنیا میں کون ایسا ہے جس پر خوشامد کا اثر نہیں ہوتا۔ ہر آدمی اپنی تعریف سن کر پھولا نہیں سماتا۔ ہر شخص اپنی تعریف دوسروں کے مونھ سے سننے کا متمنی ہے۔ خوشامد سے لوگ دوسروں سے بڑے بڑے کام نکال لیتے ہیں۔ دھنیا بھی اس سے مستشنیٰ نہیں اس کا شوہر جب اس سے آکر کہتا ہے کہ "میں بھولا سے وعدہ کر آیا ہوں کہ اسے بھوسا دے دوں گا" تو اس سے کہتی ہے کہ ہم اسے بھوسا نہیں دیں گے "ہمیں تو اس نے کبھی ایک گائے نہیں دے دی" اور "نہیں دینا ہے ہمیں بھوسا کسی کو یہاں بھولی بھرلا کسی کا ادھار نہیں کھایا ہے" لیکن جب اسے ہوری کی زبانی معلوم ہوا کہ بھولا اس کی بڑی تعریف کررہا تھا اور اس کے شوہر سے کہ رہا تھا کہ "جب تمھاری گھر والی کا مونھ دیکھ لیتا ہوں اس دن بھگوان کہیں نہ کہیں سے کچھ بھیج دیتے ہیں"۔ تو وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی اور جب بھولا ان کے یہاں بھوسا لینے کے لیے آتا ہے تو وہ اپنے بیٹے سے کہتی ہے:-

"آدمی دروازے پر بیٹھا ہے اس کے لیے کھاٹ واٹ تو ڈال نہیں دی، اوپر سے لگے بھنبھنانے، کچھ تو عقلمنی سیکھو، کلسا لے جاؤ، پانی بھر کر رکھ دو، ہاتھ مونھ دھوویں، کچھ سربت پانی کرا دو، مصیبت ہی میں تو آدمی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے"

وہی دھنیا جو ابھی بھوسا دینے کے خلاف تھی اور بھولا کو برا بھلا کہ رہی تھی اس کی اتنی خاطر کراتی ہے۔ بعد میں ہوری جب اسے بھوسا دیتے وقت بڑبڑاتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ "یا تو کسی کو بوٹہ نہ دو اور دو تو بھر پیٹ کھلاؤ" اور ہوری پر زور ڈال کر تین کھانچے بھوسا دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کے یہاں پہنچا بھی آؤ۔ شوہر کے انکار پر دونوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے:-

"یہ تو اچھی دل لگی ہے کہ اپنا مال بھی دو اور اسے گھر تک پہنچا بھی دو۔ لاد دے، لدادے اور لادنے والا ساتھ کردے"

"اچھا بھائی، کوئی مت جائے۔ میں پہنچا دوں گی، بڑوں کی سیوا کرنے میں لاج نہیں ہے"

اور تین کھانچے انہیں دے دوں تو اپنے بیل کیا کھائیں گے؟»

یہ سب تو نیوتہ دینے کے پہلے ہی سوچ لینا تھا۔ نہ ہو تو تم اور گوبر دونوں چلے جاؤ»

«مروت مروت کی طرح کی جاتی ہے، اپنا گھر اٹھا کر نہیں دیا جاتا»

«ابھی جیندار کا پیادہ آجائے تو اپنے سر پر بھوسا لاد کر پہنچاؤ گے، تم، تمھارا لڑکا اور لڑکی سب اور وہاں سایت من دو من لکڑی بھی چیرنی پڑے»

«جیندار کی بات اور ہے»

«ہاں وہ ڈنڈے کے بل کام لیتا ہے»

«اس کے کھیت نہیں جوتتے؟»

«کھیت جوتتے ہیں تو لگان نہیں دیتے ہیں؟»

«اچھا بھائی جان نہ کھا، ہم دونوں چلے جائیں گے۔ کہاں سے انہیں میں نے بھوسا دینے کو کہ بھی دیا۔ یہ تو چلے ہی گی نہیں اور اگر چلے گی تو دوڑنے لگے گی»

اور وہ اپنے شوہر اور بیٹے کو بھولا کے یہاں بھیج کر رہتی ہے۔ اس وقت مجھے خوشامد پر نظیر اکبرآبادی کے بچپن میں پڑے ہوئے دو شعر یاد آرہے ہیں:—

دل خوشامد سے ہر ایک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی، جن و پری، بھوت بلا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اس قسم کی واقعات کی تخلیق سے قصہ نگار کا مقصد در اصل قصے میں لطف اور نشاط انگیزی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

منشی پریم چند نے دھنیا کا کردار اس فن کارانہ طریقے سے پیش کیا ہے کہ وہ اسی دنیا کی چلتی پھرتی ایک ہستی معلوم ہوتی ہے اور گو وہ اسی دنیا کی ہزاروں دیگر عورتوں سے ملتی جلتی ہے لیکن اس میں ایسی خصوصیات بھی ہیں

کہ ہم اسے ان سب میں بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔ دھینا کے کردار سے ہم مانوس ہوجاتے ہیں یہی کردار کی خوبی ہے۔ دھینا کے کردار اور اصلی کردار میں فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے کردار پر انسانی کردار کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اور وہ صرف ایک محدود ماحول اور واقعات کے تحت عمل کرتی ہے۔ برخلاف اس کے اصلی کردار دوسروں کے کردار سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ایک غیر متعیّن اور لامحدود ماحول اس کے عمل کے لیے ہوتا ہے۔ دھینا کے کردار کو مصنف نے ایسی خوبیوں کا مالک بنا دیا ہے کہ اس کی وجہ سے، گئودان، ادب اردو کا ایک کامیاب ناول شمار ہوگا اور یہ ناول منشی پریم چند کو اردو کے ناول نگاروں کی صف میں اعلیٰ مرتبہ دلائے گا۔

ادبیات

یادگار شعرا [۱] (ترجمه طفیل احمد صاحب بی-اے۔ قیمت دو روپیے۔ هندستانی اکیڈیمی الہ آباد)

ڈاکٹر اے اشپرنگر ایم ڈی اگرچه طبی ڈاکٹر تھے لیکن بہت اچھا علمی ذوق رکھتے تھے۔ بنگال سروس میں اسسٹنٹ سرجن تھے۔ جب مسٹر بتروس نے سنه ۱۸۴۵ع میں بوجه علالت استعفا دے دیا تو یه ان کی جگه دهلی کالج کے پرنسپل مقرر ھوئے۔ ڈاکٹر صاحب عربی زبان کے عالم تھے، اس لیے دلی کے مسلمان شرفا اور اهل علم میں انھیں بہت جلد رسوخ حاصل ھوگیا اور بڑی وقعت سے دیکھے جانے لگے۔ کالج کی ترقی و اصلاح میں بہت قابل قدر کام کیا، خاص کر ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی (جس کے وہ سکرٹری تھے) اور مشرقی شعبے کی ترقی میں جس سرگرمی اور خلوص سے کام کیا وہ یادگار رهے گا۔ فروری ۱۸۴۸ع میں گورمنٹ آف انڈیا کے حکم سے لکھنؤ اکسٹرا اسسٹنٹ رزیڈنٹ کی خدمت پر متعین کیے گئے جہاں شاھان اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کا کام بھی تفویض کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یه کام تقریباً دو سال میں ختم کیا۔ ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ع کو اپنی اصل خدمت پر عود کیا۔

«یادگار شعرا» اسی فہرست کے پہلے باب کے ایک حصے کا ترجمه ھے۔ اس میں اردو شعرا کے تذکرے ھیں۔ ان شعرا کی کل تعداد ۱۵۱۹ ھے۔ یه حالات بہت مختصر ھیں اور جس تذکرے سے جو حال لیا ھے اس کا حواله دے دیا ھے۔ یه حالات پندرہ تذکروں سے اخذ کیے گئے ھیں۔ فہرست میں بیس تذکروں کے نام ھیں۔ پروفیسر

مسعود حسن رضوی صاحب نے اس پر دیباچہ لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ان تذکروں میں سے صرف پانچ چھ چھپ چکے ہیں لیکن میرے علم میں دس گیارہ تذکرے طبع ہو چکے ہیں۔

بعض نام غلط درج ہیں۔ حرف ب کے تحت پہلے ہی دو نام بابر اور بابر علی ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ ببر اور ببر علی ہونے چاہییں۔

آج کل اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تنقید کا کام ہو رہا ہے، اس کے لیے یہ مرتب فہرست بہت کارآمد ثابت ہوگی۔

کامیاب زندگی (ترجمہ محمد اقبال سلہائی۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ مصنف سے پریت نگر پنجاب کے پتے سے مل سکتی ہے)

یہ ایک انگریز مصنف ہربرٹ این کیسن کی کتاب Climbing up کا ترجمہ ہے۔ اس میں مصنف نے نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ اور کارآمد مشورے اور ہدایتیں دی ہیں جو زیادہ تر ان کے اپنے تجربے پر مبنی ہیں۔ عنوانات یہ ہیں :- فرض منصبی۔ کچھ مزید کام۔ ساماں کا مطالعہ۔ دوستی۔ ذمہ داری۔ نفع مندی۔ کتاب کی رفاقت۔ کام میں تفریح۔ صحت۔ انتظام۔ کمپنی کی شراکت۔ وفاداری۔ ان میں بہت سی کام کی باتیں آ گئی ہیں، جن پر عمل کرنے سے زندگی میں کامیابی اور مسرت حاصل ہوسکتی ہے۔

ترجمہ صاف اور اچھی زبان میں ہے۔

جواہر العلوم (ترجمہ مولانا عبدالرحیم۔ قیمت دو روپے کتابستان بمبئی نمبر ۳)

یہ کتاب مصر کے مشہور عالم علامہ طنطاوی جوہری کی کتاب کا ترجمہ ہے اس کتاب میں مصنف نے قصے اور مکالمے کی صورت میں بہت سے قدیم و جدید عجائبات قدرت کے فوائد و مصالح کا بیان کیا ہے۔ قصہ تو برائے نام ہے کیوں کہ اس میں

کوئی بات قصے کی نہیں البتہ عجائبات قدرت کی علمی اصول پر بہت آسان اور عام فہم طور پر توجیہہ اور تشریح کی ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلے باب میں زمین کے عجائبات، دوسرے میں علویات (یعنے فلکیات) اور تیسرے میں قرآن کی وہ آیتیں جن کا تعلق ان مباحث سے ہے۔ ان تین ابواب میں نباتات، حیوانات اور فلکیات ریاضیات کے بہت سے مسائل آگئے ہیں۔ اگرچہ سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے تاہم ایک جلسے میں پڑھنے کی نہیں، مختلف اوقات میں پڑھنے سے اس کا اصل لطف حاصل ہوگا۔ قابل مترجم نے بہت اچھا ترجمہ کیا ہے، باوجودیکہ بہت سے علمی مسائل آئے ہیں لیکن عبارت میں کہیں گنجلک یا دقت نہیں پائی جاتی۔

اسرار کائنات | از جناب خورشید انور جیلانی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ صفحات ۱۰۳۔ کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتا اردو بک ڈپو فیروز پور شہر پنجاب۔

یہ مرحوم ٹالسٹائی کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے جسے مثنوی کی صنف میں نظم کیا گیا ہے۔ ترجمہ اصل کے مطابق ہے صرف نام بدل دیے ہیں اور ماحول کو ان کے مناسب کردیا ہے۔ انور صاحب کو اردو نظم کہنے میں آسانی معلوم ہوتی ہے۔ بیان کے تسلسل اور قصے کی روانی میں کہیں خلل واقع نہیں ہوتا۔ اگر مصنف صاحب زرا زیادہ غور اور نظرثانی کی زحمت اٹھاتے تو بعض لغزشیں جو اس نظم میں پائی جاتی ہیں نہ رہ جاتیں مثلاً:-

رہ بہ معنی راہ بغیر ترکیب کے (۷) چلنا ہے سب نے وقت معین گزار کے (۸) شبنم کے موتی کے بدلے شبنمی موتی۔ شبنمی ایک مستقل لفظ ہے جس کو موتی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک شعر ہے

زینب یہ سمجھی کوئی مددگار آگیا
اس بے بسی پہ اس کی اسے پیار آگیا (۱۴)

یہاں پیار کی جگہ رحم یا ترس موزوں لفظ ہے۔ پیار کا یہ محل نہیں۔ اس مصرع میں ع ہر ناصبور دل کا شکیبا ہمیں تو ہیں۔ شکیب کی عوض شکیبا، استعمال

ہوا ہے۔ ایک کیفیت کے بیان میں ماضی اور حال فعل کے دونوں صیغے عموماً استعمال ہوئے ہیں۔ کام کی عظمت میں اچھے شعر کہے ہیں۔ موسم کی کیفیتیں بھی خوب ہیں۔ زبان آج کل کے رجحان کے خلاف سہل ہے اور اسلوب میں سلاست ہے۔

چراغ لالہ | مجموعۂ کلام جناب محمد صادق صاحب صائب عاصمی۔ چھوٹی تقطیع۔ ۱۶۰ صفحات۔ اچھی لکھائی چھپائی۔ مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ مصنف صاحب سے، نزد چوکی پولیس۔ اندرون بھاٹی دروازہ۔ لاہور کے پتے سے طلب کی جائے۔

انتساب لائق مصنف نے اپنی "ان آہوں اور آنسوؤں" کا سر سکندر حیات خاں سے کیا اور انھوں نے بہ خوشی قبول فرما لیا تھا مگر تھوڑے ہی دن بعد موصوف کا انتقال ہوگیا۔

کتاب کے شروع میں نوجوان شاعر کی تصویر اور پھر "تفسیر حیات" ہے جس میں انھوں نے اپنے حالات زندگی تحریر فرمائے ہیں اور اسے ناکامیوں اور حسرتوں کا مجموعہ ثابت کیا ہے۔ مگر ہم نے یہ ساری داستان پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کی کمی اور بعض خاندانی اور معاشی زحمتوں کے باوجود صادق صاحب ماشاءاللہ اچھی خاصی ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن مشق سخن اور کتابوں کا مطالعہ جاری رہا تو امید ہے کہ وہ اس شہرت اور وقعت کے درجے تک پہنچ جائیں گے، جس کے بچپن سے آرزو مند پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ تنقید سے گھبراتے ہیں مگر اتنا لکھنے کی شاید خوشی سے اجازت دیں گے کہ ان کی غزلیات پھیکی اور تغزل سے خالی ہیں۔ زمانہ بھی غزل کا "رفیق" نہیں رہا گو غزل بہ قول حضرت حافظ ابھی تک اپنی بے خلل رفاقت کا حق ادا کیے جاتی ہے۔

عام نظموں کا رنگ اور عنوانات و مضامین، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، احسان دانش وغیرہ شعرائے ہم عصر سے ملتے جلتے ہیں۔ صائب صاحب کی قدر ہونی چاہیے ورنہ انھوں نے صاف صاف خودکشی کی دھمکی دی ہے (صفحہ ۱۶) جسے ہم ناکام شعرا کے لیے بہت ناگوار نظیر قرار دیں گے۔

تاریخ و سیر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تالیف، توفیق الحکیم مصری۔ ترجمہ از: ملیح آبادی مدیر روز نامہ ہند (ساگردت لین) کلکتہ۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۵۰ صفحات پر بہت صاف ستھری چھپی ہے اور آج کل کی گرانی کے اعتبار سے اس کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ارزاں ہے۔ اس میں سیرت نبوی علیہ التحیاۃ والثنا کے مشہور واقعات کو تمثیل (یا ڈراما) کے مناظر اور مکالمات کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان میں صحت کا بخوبی لحاظ رکھا ہے اور طرز بیان کی اس جدت نے کتاب میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ تعجب ہے کہ مولف نے بعض اہم اور پر اثر واقعات کو، جیسے جنگ بدر، اور حجۃ الوداع ہیں، زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا جو عہد حاضر کے ناظرین کے واسطے خصوصیت کے ساتھ جاذب و سبق آموز ہوتے۔ مترجم صاحب اردو زبان کے مشاق انشاپرداز ہیں۔ ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ زبان میں ہے اور ہمیں یقین ہے کے مقبول ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ آخر میں یہ عرض کرنا بھی ہمارا فرض ہے کہ ہرچند اس کتاب کے مولف نے کتب سیر و حدیث کو اپنا ماخذ بنایا اور سیرت شریف کے وہی سوانح لکھے ہیں، جو عموماً صحیح مانے جاتے ہیں، لیکن اس جدید و لذیذ پیرایۂ بیان میں آیندہ افسانوی رنگ پیدا ہوجانے کا احتمال ضرور ہے جسے اسلامی تاریخ کی صحت و وضاحت کے حق میں فال نیک نہیں کہا جاسکتا۔ معرکۂ کربلا کی افسوس ناک مثال ہمارے سامنے ہے کہ جوش و تاثیر پیدا کرنے کے شوق میں شعرا نے اسے محض ایک داستان بنا ڈالا۔

سیرت شہید کربلا جلد دوم علی جلال حسین مصری کی تالیف کا اردو ترجمہ از محمد ایوب صاحب عثمانی۔ شائع کردہ مکتبہ معارف القرآن۔ اورنگ۔ آباد (ضلع گیا)۔ ضخامت ۳۲۲ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب میں واقعات کربلا کے متعلق وہی رطب و یابس روایتیں بھری ہیں جن کی تاریخی وقعت صفر کے قریب ہے اور جن کی بدولت حضرت حسین کی شخصیت عامۃ المسلمین میں بالکل افسانوی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ ایک اور آفت یہ ہے کہ

ایسی روایات اس بغض و عناد کی آگ کو برابر ہوا دیتی رہتی ہیں جو تیرہ سو سال قبل مسلمانوں کے درمیان مشتعل ہوئی تھی۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے لیکن زبان اصلاح کے قابل ہے۔ مثال کے طور پر لفظ «شامل» کو ہر جگہ ساتھ کے معنی میں، اور «رنج» کو رنجیدہ کی بجائے تحریر کیا گیا ہے۔

ناصر جنگ شہید | تالیف مولوی معین الدین صاحب رہبر فاروقی۔ ضخامت ۱۸۸ صفحات۔ قیمت اڑھائی روپیہ۔ (ملنے کا پتا۔ س برج ہاؤس، عابد روڈ۔ حیدرآباد، دکن)

اس کتاب کے شائع ہونے کا کچھ مدت سے اشتہار چھپ رہا تھا لیکن «ادارۂ ادبیات اردو» کی طرف سے شائع ہونے کی بجائے اب خود لائق مولف نے اس کو چھاپ کر شائع کیا ہے۔

ماخذوں کی فہرست میں مطبوعہ انگریزی اردو اور فارسی کتابوں کے علاوہ ۲۴ قلمی کتابوں کے نام تحریر ہیں جس سے مولف کے شوق و تلاش کا اندازہ ہوتا ہے لیکن انگریزی کی صرف چار کتابیں فہرست میں درج ہیں حالاں کہ ہیوم سے لے کر ول زلی ہیگ تک بہت سے مغربی مصنفوں کی تاریخیں زیر نظر عہد سے بحث کرتی ہیں اور ان سے مفید معلومات اخذ کی جا سکتی ہے۔ بہر حال، لائق مولف کا یہ شوق کہ مشاہیر دکن کے حالات شرح و بسط سے لکھے اور شائع کیے جائیں، ستایش کے قابل ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی تگ و دو جاری رکھیں گے۔ زیر نظر کتاب کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے ناصر جنگ کی کوئی کام یاب وکالت کی ہے۔ شاید ہو بھی نہ سکتی تھی لیکن جو شخص تالیف کی محنت و تکلیف اٹھائے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مختلف معلومات کو اپنے طرز فن کے مطابق ایک جگہ مرتب کر کے سلیس و شگفتہ پیرائے میں پیش کرے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کی سعی مشکور نہ ہوگی۔ اس باب میں، مغربی سیرت نگاروں سے قطع نظر لائق مولف اپنی ممدوح کتاب «مآثر الامرا» ہی کے طرز تالیف کی تقلید فرمائیں تو غالباً زیادہ کام یاب رہیں گے۔

نئے رسالے

مصنف (مرتب سید الطاف علی صاحب بی۔ اے۔ قیمت سالانہ چار روپے)

یہ مجلس مصنفین علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ ہے اور یہ امرباعث مسرت ہے کہ علی گڑھ سے ایک جدید علمی ادبی رسالے کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ مجلس مصنفین اس رسالے کو استقلال کے ساتھ جاری رکھے گی اور اسے بلند پایہ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی۔ علی گڑھ میں اس کے لیے کافی سامان اور مناسب فضا موجود ہے ۔ سید الطاف علی صاحب جو اس کی ترتیب کا کام بڑے شوق اور مستعدی سے انجام دے رہے ہیں، اگر یونی‌ورسٹی کے ارباب ذوق کو اس کی اعانت پر آمادہ کرلیں گے تو یہ اردو کا ممتاز رسالہ ہوجائے گا۔ لیکن یہ کام آسان نہیں، اس کے لیے غیر معمولی کوشش اور سر گرمی کی ضرورت ہوگی۔ رسالے میں مختلف قسم کے ادبی اور علمی مضامین ہوتے ہیں۔ اور بعض مضامین پرمغز ہیں اور غور و فکر سے لکھے گئے ہیں۔ جس کے لیے ہم قابل مرتب کو مبارک باد دیتے ہیں۔

آج کل (مدیر اعلیٰ آغا محمد یعقوب دواشی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ نائب مدیر، شان الحق حقی بی۔ اے۔ و شیش چندر سکسینہ طالب بی۔ اے۔)
چندہ سالانہ پانچ روپے۔ راج پور روڈ دهلی۔

یہ پندرہ روز با تصویر رسالہ ہے۔ پہلے یہ صرف پشتو کے رسالے "نن پرون" کا اردو چربہ ہوتا تھا اور صوبۂ سرحد والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اب اس کے مقصد کو زیادہ وسیع کر دیا گیا ہے اور کل ہند حیثیت دے دی گئی ہے۔ چناں‌چہ اس لحاظ سے اس کے مضامین زیادہ دل‌چسپ اور مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں کے لکھنے والے ہونہار اور ممتاز ادیب ہیں۔ تصویریں تو ایسی اعلیٰ پایے کی ہوتی ہیں کہ کسی دوسرے رسالے میں نہیں پائی جاتیں۔ اس اعتبار سے اس کی قیمت کم ہے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ بہت دل‌چسپ اور خوش‌نما رسالہ ہے۔

کریسنٹ یہ کھچڑی رسالہ یعنے جس میں اردو، گجراتی اور انگریزی تینوں حصے شامل ہیں، ہر سال شہر سورت کی مسلم اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اردو کا حصہ نسخ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ اچھا ضخیم رسالہ ہے۔ اردو میں اچھے پڑھنے کے قابل مضامین ہیں۔ سید ظہیر الدین مدنی صاحب ایم۔ اے۔ کا مضمون "اردو کے نام" اور پروفیسر نجیب اشرف کا مضمون "کہاوت کی کہانی" بہت دلچسپ ہیں۔ نظم کا بھی ایک معقول حصہ ہے۔ سورت سے ایسے اچھے رسالے کا شائع ہونا قابل داد ہے۔ طالب علموں کو اس میں زیادہ حصہ لینا چاہیے۔ مضمون نگاروں میں ان کی تعداد کم معلوم ہوتی ہے۔

سالنامے یا خاص نمبر

عالمگیر حسب معمول اس سال بھی عالمگیر نے اپنا سالانہ نمبر شایع کیا ہے۔ علمی و ادبی مضامین کے مقابلے میں افسانوں ڈراموں اور منظومات کا کا حصہ زیادہ ہے۔ یہ ۱۴۰ صفحے کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ قیمت ایک رپیہ چار آنے

ندیم (گیا) ندیم نے مئی اور جون کے پرچے ملاکر نکالے ہیں ان میں مئی کا پرچہ پورا ظفر نمبر ہے جو سلطنت مغلیہ کے آخری بادشاہ حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی یادگار میں ہے۔ خواجہ حسن نظامی، خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی۔ سید محمد تقی، خواجہ محمد شفیع، عرش ملیانی، نجم صدیقی نے ظفر کے حالات اور ان کی شاعری پر مضمون لکھے ہیں۔ بعض نظمیں بہادر شاہ کی یاد میں ہیں۔

متفرق

لائبریری سدھار مصنفۂ سید سجاد حسین صاحب رضوی، ڈی۔ ایل۔ ایس۔ سی، لائبریرین میرٹھ کالج۔ تقطیع حجم ۱۷۲ صفحے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ ملنے کا پتا۔۔۔دی ماڈرن لائبریری بک ڈپو۔ میرٹھ۔

یہ ایک بہت مفید کتاب ہے۔ مصنف نے لائبریری کے فن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ لائبریری کی تنظیم و ترتیب کا کئی سال کا تجربہ ہے اور اس موضوع پر ایک اور مبسوط کتاب شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں مرتب و منظم کتب خانے قائم کیے جائیں جہاں کتابوں سے قرار واقعی استفادہ کیا جائے اور اس طرح عوام کو بھی اور پڑھے لکھے لوگوں کو بھی علمی ذوق پیدا ہو اور یہ ذوق بڑھتا اور پورا ہوتا رہے۔ کتاب کے شروع میں لائبریریوں کی مختصر تاریخ ہے جس میں کتب خانوں، کتابوں کے ذخیروں اور مرتب و منظم لائبریریوں کا فرق اور لائبریری کے فائدے بتائے گئے ہیں۔ اس ضمن میں مصنف نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اگر کتابوں کا برتنے والا ان پڑھ اور ناقدرا ہو تو کتابوں کا بہت کچھ فائدہ ضائع ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے کئی کتب خانوں، لائبریریوں اور فنی فن حضرات کا ذکر ہے۔ لائبریریوں کے فرائض، ان کی ضرورت اور اہمیت نیز تعلیم بالغان سے لائبریریوں کے تعلق پر مفید بحث کی گئی ہے۔ آخر میں کتاب کا ایک بڑا حصہ لائبریری کی دیکھ بھال، اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنائے رکھنے کی عملی تجویزوں اور مشوروں پر مشتمل ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہت کام کی باتیں ہیں جن کے دائرۂ اختیار میں کوئی «ذخیرۂ کتب» موجود ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھنا اور کارآمد بنانا چاہتے ہوں اور جو لوگ سچے دل سے ملکی و قومی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں ان کے لیے تو اس کتاب میں ایک نہایت آسان اور مفید ترین لائحہ عمل موجود ہے۔

ضروری تصحیح

پروفیسر محمود شیرانی صاحب کا تنقیدی مقالہ جو «تبصرہ» کے عنوان سے رسالۂ اردو بابت جنوری سنہ ۴۳ میں شائع ہوا ہے اس میں الفاظ وسنین کی حسب ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں۔ براہ کرم ناظرین صحت فرمالیں۔ (مدیر «اردو»)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱۰	لیوی	لیوی
۲	۲	بات	باب
۵	۵	نیاید	نیامد
۵	۱۶	سوادی	سواری
۱۰	۱۴،۱۵	بہرام کور، جس کے لیے قصر شیریں تعمیر ہوا، خسرو پرویز کی محبوبہ شیریں سے بہت اقدم ہے	بہرام گور، خسرو پرویز کی محبوبہ شیریں سے جس کے لیے قصر شیریں تعمیر ہوا، بہت اقدم ہے
۱۰	۱۵	۴۲۰ھ	۴۲۰ع
۱۰	۱۶	۴۳۸ھ	۴۳۸ع
۱۰	۱۶	۵۹۰ھ	۵۹۰ع
۱۰	۱۶	۶۲۷ھ	۶۲۷ع
۱۱	۹	شمر	مثمر
۱۳	۱۶	آشتیاتی	آشتیانی
۱۴	۱۴	دادیم	داریم
۱۵	۳	روانی	روائی
۱۵	۱۶	۲۴۹ھ	۳۴۹ع
۱۸	۲۴	البست	آبست
۲۰	۴	متبنی	متنبی
۲۱	۱۹	او	ار
۲۲	۴	دیوان رودکی کی طبع طہران	دیوان رودکی طبع طہران
۲۳	۲۰	گیروی	گیر و می
۲۴	۷	برومد	بردند
۲۵	۳	زلیخا سے	زلیخائے
۲۵	۹	کرتے ہیں۔ ظاہر ہے	کرتے ہیں ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ظاہر ہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵	۱۱	روشن کرتے۔ صفحہ ۱۳۹ کہتے ہیں	روشن کرتے۔ رہی خسرو کی یوسف زلیخا، اس کا قصہ ہم اپنی عمر میں پہلی مرتبہ شمس العلما سے سنتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، امیر خسرو نے باوجود کثرت تالیفات، یوسف زلیخا نہیں لکھی، نہ کسی نے اس کا تذکرہ کیا۔ صفحہ ۱۳۹ کہتے ہیں
۲۶	۳	تحسین	نخستین
۲۹	۲۱	لکھی غزل جاسکتی ہے	غزل لکھی جاسکتی ہے
۳۰	۱۱	دگر	مگر
۳۰	۲۴	فرشتے	فرشتے
۳۳	۲	سومندی	سودمندی
۳۴	۲۴	کرد	گرد
۳۵	۲۶	کوتوالی	کوتوال
۳۶	۸	نخچیروالی	نخچیروال
۳۹	۲۱	جام	عالم
۴۰	۱۳	ہوچلے تھے	ہوچکے تھے
۴۱	۱۴	نام مسعودی ہے	نام مسعود ہے
۴۱	۱۴	تخلص غالباً مسعود ہے	تخلص غالباً مسعودی
۴۲	۱۳	ناموں کو	ناموں کی
۴۳	۲۲	مسعود و سلمان	مسعود سعد سلمان
۴۸	۶	۵۰۴ھ	۵۳۰ھ
۵۱	۱۵	دو سال	دو سل
۵۲	۲۶	برسوں تک	برسوں بلکہ صدیوں تک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷	۱۱	اس شعر کو ۔	اس شاعر کو
۵۷	۲۰	مداح	مدح
۶۱	۰	۳۳۱ھ	۴۳۱ھ
۶۳	۱۱	Spisit	Spirit
۶۷	۷	ذکر جو کہ	ذکر جب کہ
۶۷	۸	دامن گیر نظر آتے ہیں	دامن گیر نظر ہیں
۶۷	۲۱	خفیف سی جھلک	خفیف سی خشکی کی جھلک
۷۳	۱۷	معزالدولہ بہرام شاہ	معزالدولہ خسروشاہ بن بہرام شاہ
۷۳	۱۷	(۵۵۵۔۴۷) تاج الدولہ	(۵۵۵۔۴۷) دوسرا تاج الدولہ
۷۳	۲۳	شمس الدین التمش	شمس الدین التتمش
۷۳	۲۳	بننے کے لیے بہت	بننے کے لیے اس کو بہت
۷۳	۲۵	سفیر التمش کے	سفیر التتمش کے
۷۵	۲	التمش	التتمش
۶۵	۱۸	التمش	التتمش
۷۶	۰	رکن الدین آمد	رکن الدین کہ آمد
۷۷	۱	صفحہ ۳۶۳	صفحہ ۳۶۵
۷۷	۱	نوتکی	نونکی
۷۷	۱۹	حالی	حال
۸۲	۲۴	اس کا تالیف کا	اس تالیف کا
۸۳	۱۸	در برائے	«برائے
۸۴	۸	بلبن اور	بلبن کی وفات اور
۸۶	۱۴	این جا اسم	این جاھم
۸۶	۱۵	بذکرے پیش کردم	بذکرے بس کردم
۹۱	۴	التمش	لتتمش
۹۱	۰	التمش اور التمش	التتمش اور التتمش
۹۱	۱۶	سنہ ۶۸۸ھ دارالسلطنت	۶۸۸ھ میں دارالسطنت
۹۳	۷	التمش	التتمش
۹۴	۱۹	التمش	التتمش
۹۵	۱	التمش	التتمش
۹۸	۱۱	ناگوار	ناگور
۹۹	۲۷	صوبہ‌داری	صوبہ واری
۱۰۰	۱۱	برھان بن بدو	برھان بن بدر
۱۰۰	۱۶	حسام الدین بتیانی	حسام الدین بنیانی

صفحہ	سطر	[illegible]	صحیح
۱۰۰	۲۳	تیار ہوتی ہے	تیار ہوتا ہے
۱۰۰	۲۴	آھوی	آھوی
۱۰۳	۶	زبان گویا	زفان گویا
۱۰۳	۶	ملا رشیدی	ملا رشید
۱۰۳	۲۰	بارے ہمارا	بارے میں ہمارا
۱۰۳	۲۰	ایک واقع کا	ایک واقعہ کا

رسالۂ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے رسالۂ "سائنس" بجائے [illegible] کے حیدرآباد سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۴ صفحات۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالے کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل گیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتے پر ہونا چاہیے:-

معتمد مجلس ادارت رسالۂ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ:- رسالۂ سائنس (سہ ماہی) کے سابقہ پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ء) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 23 JULY 1943 No. 91

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by
ABDUL HAQ

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.